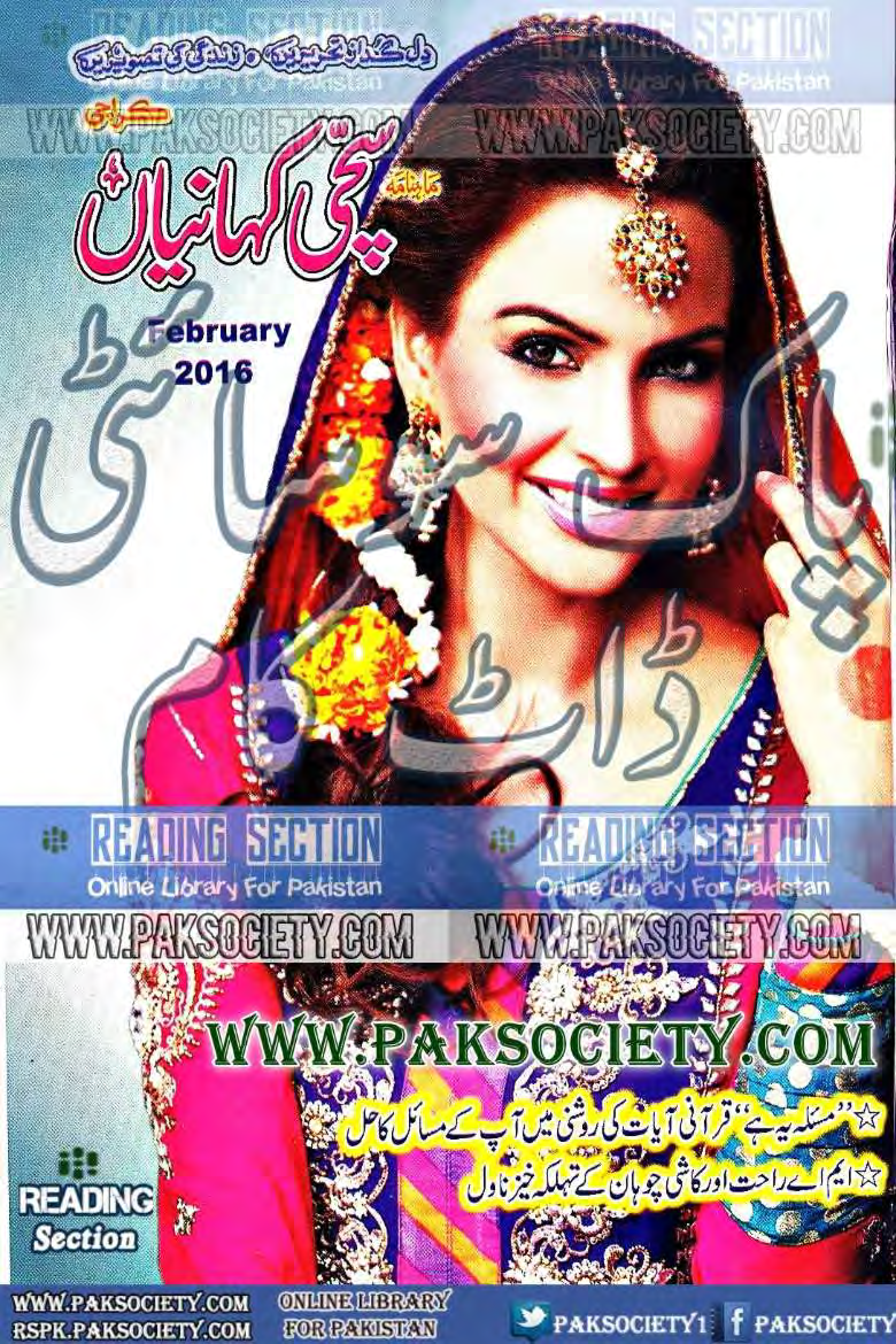


دل گداز تحریریں ۔ زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
February
2016
☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY



فون: 021-35893122-35893121 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی / سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے/ افریقہ 65 ڈالر/ کینیڈا/ آسٹریلیا 65 ڈالر/ ایشیا/ یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اسمارٹ فون

جاپانیوں نے ایک ایسا اسمارٹ فون ایجاد کیا ہے جو اگر پالتو کتے کے گلے میں پہنا دیا جائے تو اسکرین پر کتے کے جذبات آجاتے ہیں۔ یعنی اگر کتا خوش ہے یا غصے میں ہے تو اسمارٹ فون مالک کو بتا دے گا...... مجھے جاپانیوں کی عقل پر بہت حیرت ہوئی کیونکہ میں انہیں کافی ذہین قوم سمجھتی تھی۔ اتنا وقت اور پیسہ برباد کر کے کتوں کے حقیقی جذبات معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جانور چاہے گھر میں رکھنے والا ہو یا جنگل میں گھومنے والا درندہ، وہ انسانوں کی طرح دوغلا رویہ تھوڑی رکھتے ہیں اور بے چارہ پالتو کتا!! وہ تو جب مالک سے خوش ہوتا ہے تو پیروں میں لوٹنے لگتا ہے اور جب ناخوش ہوتا ہے تو غراتا ہے۔ ایسے معصوم جانور کے لیے اتنی جدید ایجاد کی کیا ضرورت؟ ہاں جاپانیوں کو چاہیے کہ انسانوں کے لیے ایسے اسمارٹ فون ایجاد کریں جو ان کے جذبات دوسروں پر عیاں کر دیا کریں...... خاص طور سے خون کے رشتوں کے لیے ایسے فون بہت کارآمد ہوں گے۔ بظاہر یہ رشتے بہت اچھے محسوس ہوتے ہیں مگر درپردہ خون وہی کرتے ہیں، پیٹ میں چھرا ہمیشہ کوئی اپنا ہی مارتا ہے۔ ایسے اسمارٹ فون کم از کم انسانوں کو انسانوں سے تو محفوظ رکھیں گے۔ کوئی انسان دوغلے رویے سے دھوکا نہیں کھائے گا۔ انسان کے دل میں کیا ہے، وہ اسمارٹ فون کی اسکرین پر چمک رہا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے کبھی ملنا نہیں چاہے گا! کم از کم پاکستان میں تو ایسا ہی ہوگا۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

۔ پیارے ساتھیو!

2016ء کا جنوری دبے پاؤں گزر گیا۔ ماہِ فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب تو ماہ وسال ایسے دوڑے چلے جا رہے ہیں کہ بس ...... یہ نقطے لگانا بھی بڑا کھیل ہوتا ہے۔ جہاں دل چاہے نقطہ لگا دو۔ یہ نقطے ظاہر ہے بڑے کام کے ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح موسموں کا پتا پیڑوں کی پوشاکوں سے چلتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں بہت ساری باتیں یہ نقطے سمجھا دیتے ہیں۔ مجھے 'اڈی ٹپہ' کھیلتے بچے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ جن میں آج بھی بچپن بے فکری سے سانس لیتا ہے۔ گولی گولے سے دور ہر سیاست سے پرے کاش کہ ہمارے بچوں کی زندگی سے بھی بھورے بھورے مکوڑوں جیسے نقطے دُور ہو جائیں' اور ماہِ فروری کے محبت والے دن کو ہم سرخ کے بجائے سبز نقطوں سے سجا کر منائیں۔ امن کے گیت گائیں۔ کیا خیال ہے آپ کا ...... آیئے ساتھیوں امن کی آشا کے گیت جلاتے اپنے احوال کا آغاز کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے احوال میں شریک ہیں۔ کراچی سے ہماری بہت پیاری بہن سنبل لکھتی ہیں۔ تم بھی سوچو گے کہ یہ کیا آپی ہر بار پچھلے شمارے پر تبصرہ کر دیتی ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ آج کل مصروفیات کی وجہ سے 'دوشیزہ اور سچی کہانیاں' دونوں ہی لیٹ پڑھ پاتی ہوں۔ تب تک ڈیڈ لائن گزر جاتی ہے۔ سو دونوں ہی شماروں پر لیٹ تبصرہ کر پاتی ہوں۔ سب سے پہلے گڈی آپا 'ازمائی موسٹ فیورٹ رائٹر'، ان کے جانے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ تحسین کے فادر، ہماری مایہ ناز رائٹر گل، بہت پیاری رضوانہ جی کی والدہ کے انتقال کا بہت دکھ ہے۔ اللہ مرحومین کو بلند درجات عطا فرمائے اور لواحقین کو صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے (آمین) مجید احمد جائی اور ان کی ۔ کو اللہ صحت عطا فرمائے۔ (آمین)۔ پراسرار نمبر کا سرورق لاجواب تھا۔ خصوصاً سرورق کی دوشیزہ کا ماسک! میں نے

صاحب سے کہا۔ مجھے یہ ماسک چاہیے' فرمایا بڑی ہو جاؤ۔ لو جی گل ہی مک گئی۔ تمام کہانیوں پر تصاویر کی سیٹنگ کمال تھی۔ ایک پراسرار سا تاثر خود بخود اُبھر رہا تھا۔ مجھے فراعین مصر پہ لکھی جانے والی پراسرار کہانیاں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ سو فرعون کے قیدی بہت دل کو بھائی۔ اس کے علاوہ بیری کا آسیب' چھپکلی۔، پری زاد، بلی یا فردوس، کمال تحریریں تھیں۔ باقی بھی اچھی تھیں۔ اور تمہارے 'زہر عشق' کے تو کیا کہنے ہیں۔ ہر بار ہی ایک نیا موڑ آ جاتا ہے اور یہی ایک رائٹر کی کامیابی ہے کہ وہ کہانی کو کہیں روک کر کھڑا نہ کر دے۔ ویلڈن 'ہم شکل' کی اڑان بھی بلند ہے۔ باقی دو کہانیاں شروع کی ہوئی ہیں کبھی مکمل ہو گئیں تو بھیج دوں گی۔ میرا پراسرار نمبر حسب معمول غائب ہے۔ کیوں کہ اس کی دھوم ہی ایسی ہے کہ کوئی نہ کوئی اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ میں نے تمام تبصرہ اپنی یادداشت کے سہارے کیا ہے۔ اگر کوئی رہ گیا ہو تو معذرت۔ اب اجازت دو۔ اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆: بہت ہی کول آپی! سلامت رہے۔ آپ کا خط پا کر سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ آپ کی احوال میں آمد، احوال میں ہر طرف محبت کے رنگ بھر دیتی ہے۔

✉: ہماری آفت کی پڑیا سدرہ انور علی کی جھنگ صدر سے احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ دلکش سرورق سے سجا جنوری کا پرچہ ملا۔ احوال میں سبھی نے اچھا لکھا۔ ماشاء اللہ شمسہ قمر عاصم علی احوال میں خوش آمدید اور اسماء اعوان کی لائف بوائے اچھی لگی۔ سیما غزل کی جدا نہ ہوں گے۔ اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ اینڈ نے بہت اچھا تاثر چھوڑا۔ فرحت صدیقی کی گرہن لگا جیون، سوگوار ٹائٹل کے ساتھ پوری کہانی دل سوز لگی۔ ایڈیسن ادریس کی، عشق زادے 2، اچھی لگی۔ شاہد رفیق کی ٹھکانہ اچھی لگی۔ ویلڈن شاہد۔ مجھے موت چاہیے، محمد سلیم اختر انکل، تلخ حقیقت لیے اچھی کہانی لکھی۔ انیلا امام بخش کی روگ، کوثر خان کی علاج، ارم ناز کی انوکھا رشتہ، کراس ٹاکنگ، ایس امتیاز کی' وفا کیسی، اشفاق شاہین کی، سید عمر بخاری، کیا سے کیا ہو گیا ہوں۔ پشیمان، اسٹیپ چیکنگ، تمام کہانیاں دلچسپ و بہترین لگیں۔ گھٹنے اتنے بھی گھٹے نہیں۔ یہی ہے ہمارے معاشرے کی حیوانیت حالات کی رو میں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ پہلا شعلہ وثاشا، میں اقبال بانو نے اچھا لکھا، سید ملازم حسین، فصیحہ آصف، مقصود احمد بلوچ، ایم ارشد وفا نے اچھا لکھا۔ مسٹر پرفیکٹ مجید احمد بھیا۔ یاد رکھے گی دنیا بہت اچھی کاوش ہے۔ صائمہ بھابی کو سلام۔ زہر عشق فل ایکشن میں جا رہی ہے۔ ویلڈن بھیا۔ مائی ڈیئر ملکہ احوال تحسین جونیجو کہاں گم ہو۔ پلیز تمام دکھ بھلا کر جلدی سے لوٹ آؤ۔ چندے آفتاب، چندے ماہ تاب مائی سویٹ آپی زرینہ جونیجو آپ کی صحت وسلامتی کے لیے بہت ساری دعائیں۔ پلیز آپ بھی احوال میں واپس لوٹ آئیں۔ کمانڈو شعبان بھیا، محمد عزیز مے بھیا، عبدالعزیز جی انکل، ثمینہ ناز آپی، شائستہ جمال، مسز نوید ہاشمی، عبدالغفار عابد بھیا۔ پلیز آپ سب دوبارہ لوٹ آئیں۔ تیر نیم کش اور ہائیڈ پارک میں سبھی کی انتخابات پسند آئے۔ ویلڈن زندگی بچی اور سانسوں کا تسلسل اسی طرح قائم رہا تو پھر ہو گی۔ ملاقات تب تک بہت سا خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆: لو گڑیا! تبصرہ ہوا پورا شائع۔ اب ہو جاؤ خوش۔

✉: بہت عرصے بعد ہماری بہت پیاری بہن زرینہ جونیجو، بوزڑی شریف سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ جتنے بھی ساتھیوں نے ہمارے بابا جان کی تعزیت کی ہے ان تمام کے لیے ہم بھی باری تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اللہ سائیں! تمام ساتھیوں کو صحت و زندگی عطا کرے۔ (آمین)۔ آپی رضوانہ کوثر

کی والدہ کے انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ آپی ہم کو بھی اسی منزل کی جانب جانا ہے۔ اللہ رب العزیز آپ کی والدہ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

سدرہ شاہین آپ کا نام سدرہ انور سے سدرہ شاہین اچھا لگتا ہے۔ اب کیسی طبیعت ہے رانی۔ گل ملک آپی کا انتقال ہوگیا، اللہ سائیں ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین)۔ اور دیگر تمام لکھاریوں کو سچی کہانیاں ایوارڈ ملنے پر دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ جو کہانیاں اس مختصر وقت میں پڑھ سکی ہوں۔ ان میں جدا نہ ہوں گے، سیما غزل، عشق زادے، ایڈیسن ادریس مسیح، وفا کیسی، اشفاق شاہین، کیا سے کیا ہوگیا، عمر علی شاہ بخاری، دیکھ میرا نصیب، ممتاز احمد۔ بہترین تحریریں تھیں۔

☆: اچھی بہن زرینہ! اللہ سائیں سے آپ کی صحت کی دعائیں بھی سب کے لبوں پر رہتی ہیں۔ آپ کی مختصر آمد نے ہمارے دل میں محبتوں کے دیپ جلا دیے ہیں۔

✉: خیر پور ناتھن شاہ، بورڑی شریف سے یہ آمد ہے۔ ہماری گڑیا تحسین جونیجو کی۔ لکھتی ہیں۔ سرورق پیارا ہے۔ ظہرانے میں سب کے ہنستے مسکراتے چہرے بہت بھلے لگ رہے ہیں ماشاء اللہ۔ محفل احوال میں نئے چہرے ثناء ابڑو، کنزہ ملک اور سبھی کو خوش آمدید۔ سدرہ انور علی ڈیئر، مجید احمد جائی بھائی اور شعبان کھوسہ بھائی ایوارڈ (شیلڈ سرٹیفکیٹ) حاصل کرنے پہ مبارک باد۔ ارم ناز جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اچھی منزل خان بہت عرصے بعد نظر آئیں۔ منزل پا کر غائب ہی ہوگئیں۔ یارا بہت مس کیا ہم نے، خوش رہو۔ زاہد حسین صاحب کیا آپ وہی پرانے لکھاری ہیں جی کے طویل تبصرے ہوا کرتے تھے کچھ سال پہلے؟ سوئٹ ڈیئر سدرہ انور علی لو ہم حاضر ہیں۔ سدرہ جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔ تمہارا تبصرہ بہت جاندار رہا۔ خوش رہو۔ سونیا خان، یاسر وکی، ڈاکٹر خادم حسین اور سلیمان شبیر تبصرہ پسند کرنے پر سپاس گزار ہوں۔ پیاری آپی حجاب فاطمہ آپ کی آمد سے دل سرشار ہوا۔ آتی رہا کریں۔ مور شاہد حسین، اشفاق شاہین بھائی اور صائمہ مجید بھائی شاد رہیں آباد رہیں۔ وہ تمام احباب جنھوں نے ہمارے بابا جانی کے درجات کی بلندی کی دعا کی، جزاک اللہ۔ رضوانہ کوثر آپی جانی آپ کی امی جان کا سن کر دل رنجیدہ ہوا۔ اللہ سائیں ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ اب کی بار شمارہ لیٹ ملا تو صرف چند کہانیاں پڑھ پائی۔ جن میں صائمہ بشیر کی 'وہ بلی کا بچہ' حیران کر گیا۔ نزہت ناز کی اپنی اپنی بات بہت اچھی تھی۔ 'وفا کیسی' اشفاق شاہین بھائی کی زبردست رہی۔ مجھے موت چاہیے، سلیم اختر انکل بہت عمدہ تحریر تھی۔ یاد رکھے گی دنیا، مجید احمد جائی بھائی کو بہت خوب، ممتاز احمد بھائی، دیکھ میرا نصیب، دیکھ لیا بہت اعلیٰ تحریریں 'زہر عشق' کاشی بھیا کی زبردست جا رہی ہے۔ واہ بھئی واہ سیما غزل اور اقبال بانو کی تحریریں بھی پرچے کی جان رہی ہیں بہت اچھا لگا اور تحریریں بھی خوب رہیں۔

☆: گڑیا! لو تمہارا تبصرہ بھی منزل پہ تو آیا...... نا جانے کیا دشمنی رہی پوسٹ مین کو تم سے۔ احوال تو تمہارا اپنا ہے......

✉: کنول عمران خان، گارڈن ایسٹ کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب کو میری طرف سے نیا سال بہت مبارک ہو اور یہ سال سب کے لیے ہزاروں لاکھوں خوشیاں لے کر آئے (آمین)۔ سب سے پہلے 'گل ملک' اور 'رضوانہ کوثر' کی والدہ کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین) اب شمارے کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے نئے سال میں پھر سرورق ڈبل کر دیا۔ پڑھنے میں بہت مشکل آتی ہے۔ پتا نہیں آپ بار بار کیوں اس کو ڈبل کر دیتے

بس دعا چاہیے!

ہماری دوست لکھاری شانی خامان کے والد شدید علیل ہیں۔ قارئین سے ان کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

ہیں؟؟؟ (ارے لڑکی سرورق پڑھتی ہو کیا؟؟؟) سدرہ میری بہت اچھی بہن ہے۔ ہر احوال میں مجھے یاد رکھتی ہی اور میری غیر موجودگی کو محسوس کرتی ہے۔ شکریہ جی۔ احوال میں سب کے خط اچھے ہوتے ہیں مگر یقین جانو میں صرف تمہارا خط ڈھونڈتی ہوں کہ سدرہ کا خط پڑھو تو سب حالات پتا چل جاتے ہیں۔ اتنا مکمل احوال ہوتا ہے۔ کہانیوں پر ایوارڈز ملنے پر سب کو میری طرف سے مبارک باد۔ کہانیوں کی طرف آئے تو۔ 'محمد سلیم اختر انکل آپ کی کہانیاں تو میری فیورٹ ہیں۔ زبردست، 'روگ، علاج، انوکھا نشہ، وہ بلی کا بچہ، شہید، یاد رکھے گی دنیا۔ بہت اچھی لگیں۔ اور ممتاز بھائی کی ''دیکھ میرا نصیب'' زبردست۔ ممتاز بھائی آپ تو ہر ماہ زبردست کہانی لاتے ہیں۔ Good۔

☆: اچھی کنول! ہم تمھیں بھی ملکہ کا خطاب دیتے ہیں۔ ہمیں تم سب کی احوال میں ہر ماہ حاضری چاہیے۔ سمجھیں نا۔

✉: زاہد حسین، لاہور سے اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں۔ ''تجدید عہد وفا'' کے فوراً بعد اسماء اعوان نے ناجیہ اور شرجیل کو اک دوسرے کے لیے بہتر ثابت کر دیا اور ہمیں مسرور کر دیا۔ ''جدا نہ ہوں گے ہم'' سیما جی نے بڑی ہی بہترین کہانی پیش کی ہے۔ ہم تم سے جدا ہو کے مر جائیں گے رو رو کے۔ سنتے آئے پر عملی طور پر اس پیاری سی کاوش میں مناظر دیکھ بھی لیے۔ ''گرہن لگا جیون'' فرحت صدیقی صاحبہ بھی کافی بلند مرتبہ لکھاری ہیں ان کی تحریر بھی نہایت اچھی ہے۔ ''عشق زادے'' کیا ہوا کیوں ہوا کچھ پتا نہ لگا۔ 'ٹھکانہ' مجھے موت چاہیے'' منہ مانگی موت نہ ملنے کو ''روگ'' کہتے ہیں، جس کا ''علاج'' کوثر خان خوب جانتی ہیں۔ ''انوکھا نشہ'' اک منفرد سی کہانی اک عجب سانحہ۔ پر یہ حقیقت ہے، ایسا ہوتا ہے۔ سلوشن کی بُو واقعی اپنا اثر جماتی ہے۔ ''کراس ٹاکنگ'' اور ''وفا کیسی'' ایس امتیاز احمد صاحب کو پسند کر لیا ہم نے۔ اشفاق شاہین بس جیسی کرنی ویسی بھرنی کا ہی کام نبھا سکے۔ ''کیا سے کیا ہوگیا ہوں'' اک افسردہ کر دینے والی مختصر سی کہانی ہے مگر میں کیا ہوگیا ہوں یہ صاف مایوسی ہے جو کہ ٹھیک نہیں۔ حمیرا قریشی کے ساتھ آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ''پشیمان'' زائرہ کو دیکھا تو لبوں پہ مسکان آ گئی۔ کیوں کہ موصوفہ محبت میں لٹ کے قتل کے جرم میں پھنسی تھی۔'' وہ بھی شوہر کے۔ شاید اسی لیے کرن نورین ''اسٹیپ چیکنگ'' پر چاق و چوبند کھڑی تھیں۔ صائمہ بشیر کا ''وہ بلی کا بچہ'' جس نے مالک کو سانپ سے بچا لیا اور تیس سال بعد بھی مالکن کو یاد ہے۔ نزہت ناز ''اپنی اپنی بات'' لیے لیڈیز پارک میں چار سہیلیوں کے ہم راہ موجود تھیں۔ غنی پرواز نے بکری کو شیر بنانے کا کرتب دکھا کے ہمیں واقعی ''مہمیز'' کر دیا۔ روشانے نے ''بڑا آدمی'' دکھایا اور وہ چاروں ملعون بھی جو آگے کی تصویر میں موجود کتے سے بھی بدتر اور کتے سے بھی گئے گزرے انسان نما کتے تھے۔ بڑی مونچھوں والا بھی باقی بھی۔ اقبال بانو نے ''وٹا سٹا'' دکھایا۔ آخری چوری نے متاثر کیا ہے۔ ''یاد رکھے گی دنیا'' مصنف کی اچھوتی تحریر ہے پسند آئی۔ ممتاز احمد صاحب ''دیکھ میرا نصیب'' کے ساتھ رونق افروز تھے۔ مسئلہ بیماری کا نہیں عذاب کا ہے۔ جو عاقب ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھگت رہا ہے۔ اسٹیشن سے گاڑی جب چھوٹ جاتی ہے تو ایک، دو، تین ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسی ٹرین سے ہم آپ کے

پاس آرہے ہیں۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش بطورِ زادِ راہ ہم راہ ہیں......

☆: پیارے بھیا! تبصرہ زبردست اور اندازِ بیاں کے کیا کہنے مگر...... ہم کیا کریں کہ قینچی چین نہیں لیتی۔ امید ہے آپ درگزر سے کام لیں گے۔ اگلے ماہ کے تبصرے کا ابھی سے انتظار ہے۔

✉: یہ پہلی آمد ہے شاہ زری کی، لیلیٰ مجنوں گیٹ، جھنگ صدر سے لکھتی ہیں۔ کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں سے تعارف میری عزیز از جان دوست سدرہ انور علی نے کرایا۔ سچی کہانیاں کو ہر لحاظ سے بہترین پایا۔ آج کے نفسانفسی کے دور میں ہمارے لیے بہترین مشعل راہ بھی ہے۔ اس میں تمام کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ اور ہمارے معاشرے کے لیے ایک سبق بھی ہیں۔ بس ہمیں دیکھنے کی ضرورت ہے اور یہ سب کاشی بھائی کی محنت و محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ منزہ سہام آنٹی بہت اچھا لکھتی ہیں اداریہ میں بہت خوب۔ اس دفعہ جدا نا ہوں گے ہم۔ گرہن لگا جیون، مجھے موت چاہیے، ٹھکانہ، انوکھا رشتہ، آخری دعا، اجنبی مسیحا، یاد رکھے گی دنیا یہ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ زہرِ عشق قسط 11 کمال کی ہے۔

☆: اچھی زری! خوش آمدید! گڑیا مزہ تو جب آئے۔ رونق تو جب لگے، جب تم ہر ماہ آؤ! تبصرہ اچھا لگا تمہارا۔

✉: میانوالی سے ہمارے ساتھی ملک محمد اکرم آھیر عرض گزار ہیں۔ ماہ دسمبر 2015ء کا شمارہ مجھے 28 نومبر کو ملا۔ اس میں اپنی تصویر اور کہانی پڑھ کر بے حد خوشی محسوس ہوئی کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ سچی کہانیاں کا پُراسرار نمبر 3 واقعی اپنی پراسراریت سے میرے وجود میں سنسنی پیدا کر گیا۔ سردی کے موسم میں حرارت نے میرے جسم کو گھما کر رکھ دیا۔ اور پھر کہانیاں پڑھ کر مزے لینے لگا۔ واقعی پراسرار نمبر کا تو جواب نہیں۔ باجی منزہ سہام کا اداریہ نابینا اندھوں کے شہر میں آئینے بیچنے جیسا تھا۔ اس کے بعد احوال تھا، تمام لوگوں کے تبصرے، اپنی جگہ اہمیت رکھتے تھے۔ تمام کے تبصرے مجھے بے حد پسند آئے خاص طور پر میں پیاری آپا مسز نوید ہاشمی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھیں میری کہانی پسند آئی۔ دیگر لوگوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری کہانی کو پسند فرمایا اور جن لوگوں نے پڑھا مگر تبصرہ کرنے سے قاصر رہے تو ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ اب میں آتا ہوں کہانیوں کی طرف۔ کمرشل کہانی لائف بوائے بہترین جا رہی ہے۔ بلی یا فردوس، انارکلی، چھپکلی یا...... زبردست تھیں۔ ایم اے راحت کی ہم شکل کامیابی کے جھنڈے گاڑے اپنی منزل کی طرف رواں رواں ہے۔ ہولناک کہانی میں کیا کرتا، خونی دنگل بھی ٹھیک تھی۔ زہریلی کوکھ سے جنم لینے والی کہانی حاسم وقاص کی، اپنی مثال آپ تھی۔ تمام کہانیاں ہی اپنی مثال آپ تھیں۔ ناول زہرِ عشق کاشی چوہان صاحب آپ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تیر نیم کش میں صائمہ روید، کراچی، نیہا، کراچی، رضوانہ کوثر، لاہور، سلمان ضیاء، کراچی کے شعر لاجواب تھے۔

☆: بھائی اکرم تبصرہ بھیج کر مان بڑھانے کا شکریہ۔ امید ہے ہر ماہ اپنی آمد کو یقینی بناؤ گے۔

✉: یہ احوال میں پہلی آمد ہے۔ کنول جی تنہا کی گگومنڈی، بورے والا سے۔ لکھتے ہیں۔ میں پہلی بار سچی کہانیاں میں خط لکھ رہا ہوں۔ یقین کرتا ہوں کہ سب مجھے ویلکم کریں گے۔ سچی کہانیاں اتنا اچھا ڈائجسٹ ہے کہ جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ مجھے اتنے پیارے ڈائجسٹ سے متعارف کروانے والے میرے پیارے بھائی شاہد رفیق سہو اور کاشی صاحب تھینک یو۔ بھائی جی سب سے پہلے ان رائٹرز کو مبارک باد جنھوں نے اتنی پیاری اور اچھی اچھی کہانیاں لکھیں جن میں مجید احمد جائی، ارم ناز، حنا بشریٰ، محمد سلیم اختر،

نزہت جبیں، شعبان کھوسہ سکندر وقاص حسین، ابو ہریرہ بلوچ، فوزیہ فرید احمد، ملک محمد اکرم، علی حسین، اسماء اعوان، شائستہ انور، ایم اے راحت، حنا فرید، حاسم وقاص، حمیرا خان، شمسہ قمر، نفیسہ فضل، ممتاز احمد، نوشین آراء، شازیہ محسن، ضرغام محمود، محمد اسماعیل، فرح انیس، عائشہ شفقت!!! بھائی جان میں اس محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو سب دوستوں سے معافی چاہتا ہوں۔

☆: پیارے سے منّے! خوش آمدید! تم اب تنہا نہیں رہے۔ ہم سب تمہاری تنہائیوں میں میلہ لگانے کے لیے آگئے ہیں۔ اب ہر ماہ تبصرہ ہمیں ملنا چاہیے۔ تاکہ یہ محبتوں کا سفر جاری و ساری رہے۔

✉: مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ پُراسرار نمبر کے حوالے سے ٹائٹل ٹھیک تھا۔ اس دفعہ جن لوگوں نے مجھے یاد رکھا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں، خاص کر ممتاز احمد صاحب کا۔ ممتاز بھائی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کی تحریریں واقعی قابلِ تعریف ہوتی ہیں خاص کر آپ جو پلیٹ فارم اسٹوریاں لکھتے ہو۔ کیوں کہ مجھے ٹرین کی کہانیوں سے بہت محبت ہے۔ اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ ہم بھی تو ساری زندگی انہی ٹرینوں پہ سفر کرتے رہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ جیل کوہاٹ سے سید ملازم حسین بھائی جان آپ کا خط پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ قید کی زندگی کتنی بُری ہوتی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کو اس قید کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ نجات دلائے (آمین)۔ فیصل آباد سے ہمارے بھائی ملک علی رضا احوال میں شامل تھے۔ بھائی یہ خاموش سلام کیا ہوتا ہے؟ میں کافی دیر سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ سدرہ انور علی سسٹر کیسی ہیں آپ؟ امید کرتا ہوں کہ خیر خیریت سے ہی ہوں گی۔ ساتھی مجید احمد جائی احوال میں شامل تھے۔ اسلام آباد سے ہماری بہن عظمیٰ شکور آپ کا احوال پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بورے والا سے ہمارے ساتھی دوست انیس الرحمٰن خوش آمدید۔ محمد قاسم خان بلوچ جناب ویلکم ٹو سچی کہانیاں۔ آپ کا احوال اور تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

☆: پیارے فوجی بھائی! سلامت رہو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ ''شہید'' لگنے کے بعد ہمارے کتنے فوجی بھائیوں نے خراجِ تحسین پیش کیا؟ تاکہ ہم بھی ادارے میں کہہ سکیں کہ اس کہانی کو ہمارے سیکڑوں فوجی بھائیوں نے 'پرچہ خرید کر' پڑھا۔

✉: ایم افضل آزاد، ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ 'نابینا' منزہ آپی نے بیان کر رہی تھیں۔ جسے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ احوال میں کافی دوست نئے آئے ہوئے تھے۔ سب کو ویلکم۔ احوال میں مقصود احمد بلوچ، مومنہ بتول، شازیہ گل، صائمہ مجید، سونیا خان کے تبصرے زبردست تھے گڈ! کہانیوں میں 'پری زاد، بلی یا فردوس، اجازت، جھولی میں شیطان، انہونی یادیں، زہرِ عشق، وہ لڑکا کون تھا، بھوت ٹرین، ناگن دوست، ہم نے گھر چھوڑ دیا شاندار تھیں۔ ملک علی رضا سچی کہانیوں میں آپ کو ویلکم کہتا ہوں۔ ہر ماہ انٹری ہونی چاہیے آپ کی۔ یاسر ہم ہر ماہ آرہے ہیں، آپ غائب کہاں ہو جاتے ہو۔ صائمہ بہن آپ نے یاد کیا بہت مہربانی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی لکھاری نسیم سکینہ صدف کی نند کے شوہر گزشتہ ماہ رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ ادارہ ان کے بلند درجات اور مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

☆: افضل! تمہاری محبت سر آنکھوں پر مگر تمہارے علاقے میں پرچے کی سرکولیشن کم کیوں ہے؟؟

✉: راجو شرپال کی گڑوی محلہ جھنگ صدر سے یہ پہلی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے سدرہ انور علی کی کہانی، اور میں مر گیا شائع ہوئی تھی۔ اسی کہانی کا ایک کردار میں بھی ہوں۔ مجھے راجو کہتے ہیں۔ سدرہ کی فیملی کے ساتھ ہمارے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں۔ اس وقت میرے دو بیٹے ہیں۔ میں اب بھی ایک بینڈ کے ساتھ ڈرم بجاتا ہوں۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ لیکن جب بھی وہ مناظر میری آنکھوں میں گھومتے ہیں تو یقین جانیے میں اندر سے بالکل ٹوٹ جاتا ہوں۔ جو درد میرے اندر ہے اس کا ادراک کوئی نہیں کر سکتا۔ ہماری برادری کی عورتیں ابھی بھی ناچ گانے والا کام کرتی ہیں۔ کیوں کہ یہ ہمارا پیشہ ہے اور نسلوں سے چلا آ رہا ہے، مگر ایک واقعے کے ساتھ ہم اپنی برادری کی روایات توڑ نہیں سکتے۔ لیکن اب بہت محتاط ہو گئے ہیں۔ مجھے اردو لکھنا نہیں آتی کسی سے لکھوا رہا ہوں۔ میں سدرہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں کہ اس کی کہانی کامیاب قرار دی گئی۔ تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ اس سے سبق حاصل کریں۔

☆: پیارے راجو! یقین کرو۔ اور میں مر گیا کا درد آج بھی ہمارے دل میں ہے۔ مگر کیا کریں۔ خوشی ہوئی تم نے گھر بسا لیا۔ تمہارے بچے ہی تمہاری محبت ہیں۔

✉: سنگم سنگھڑی بھی جھنگ صدر، گڑوی محلہ سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ میرا نام سنگم سنگھڑی ہے۔ گڑوی برادری سے میرا تعلق ہے۔ ستمبر 2015ء میں سدرہ انور علی کی کہانی ''اور میں مر گیا'' شائع ہوئی تھی۔ اسی کہانی کا ایک کردار میں بھی ہوں۔ ہم تینوں نے ہی سدرہ سے کہا تھا کہ کہانی لکھو۔ میں سمجھتی ہوں کہ شان کی موت شاید ہماری وجہ سے ہی ہوئی تھی۔ اگر ہم اس کا راز چھپا لیتے اور راجو کو نہ بتاتے تو شاید وہ آج ہمارے ساتھ زندہ ہوتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی زندگی یہیں تک تھی۔ اس کے بعد بندیا نے اس شہر میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ راولپنڈی میں رہتی ہے۔ ہم اب بھی ناچ گانے والا کام کرتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہم برادری کی روایات توڑ نہیں سکتے اور نہ ہی ہمیں اس کی اجازت ہے۔ اب چونکہ شادیوں کا سیزن ہے تو میں جھنگ آئی ہوں۔ اور سدرہ نے بتایا کہ ہماری کہانی کو ایوارڈ یافتہ قرار دیا گیا۔ اس بات کی مجھے بہت خوشی بھی ہے اور دکھ بھی کیونکہ سارے واقعات پھر سے یاد آ گئے۔ اس کہانی کے کامیاب ہونے پر سدرہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور مبارک باد دیتی ہوں۔

☆: اچھی بہن! اللہ تمہیں ماضی بھلانے میں مدد دے گا۔ آج میں جیو۔ سدرہ سے اور کوئی واقعہ ہو تو لکھواؤ۔ ہمیں اچھا لگے گا۔

✉: منزل خان نے ہمیں یاد کیا ہے کراچی سے۔ ہردلعزیز کاشی بھیا اور پیارے پیارے ساتھیو! کو میرا اسلام۔ اپنی کوشش کو سچی کہانیاں کے صفحات پہ جگمگاتا دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر آپ سے گلہ ہے کہ آپ نے اعزازی جریدہ مجھے ارسال نہیں کیا۔ خیر ٹائٹل گرل پراسرار کم اور حسین زیادہ لگ رہی تھی۔ اشتہارات پر نظر ڈالتے ہوئے ''نابینا'' تک پہنچے۔ اس کے بعد احوال میں پہنچے تو کاشی بھیا کی بات پہ دل کو متفق پایا۔ اب کچھ نوک جھونک پیارے قارئین کے ساتھ۔ ملازم حسین! وقتاً فوقتاً حاضری سے کام نہیں چلے گا۔ مستقل حاضر ہونا پڑے گا۔ ورنہ سزا ملے گی آپ کو۔ سدرہ انور علی جھنگ! بہت شکریہ پیاری سسٹر۔ میں نے اپنی خالہ ''شانی خابان'' سے دس سال پرانے تمام جرائد لے کر ان کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ علی حسنین تابش! آپ اتنی چھوٹی عمر میں ڈاکٹر کیسے بن گئے؟ مجید احمد جائی! ایک رسالہ آپ

لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

پیارے ساتھیو!

لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کسی بھی لکھاری کی ادبی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ محمد سلیم اختر ہمارے لیجنڈ لکھاری ہیں۔ آپ کے فن اور ادب دوستی کے اعتراف میں پہلا سچی کہانیاں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2014ء دیا گیا تھا۔ کچھ ساتھی 2015ء کے سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کی لسٹ میں محمد سلیم اختر صاحب کا نام نہ دیکھ کر دلبرداشتہ ہوئے۔ مگر وائے ان کی کم فہمی......

امید ہے اب ہمارے ساتھیوں کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کا صحیح معنوں میں ادراک ہو گیا ہوگا۔

اس ایوارڈ کو پانے والے خوش نصیب 'ہر ایوارڈ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

، دوسرا بیگم پڑھتی ہیں۔ مگر سمجھ نہیں آئی تیسرا کون پڑھتا ہے؟ عظمیٰ شکور! آپ کا حکم تھا کہ سچی کہانیوں کو پیار کروں تو میں نے ہر ہر کہانی کو بوسہ دیا اور پیار کیا۔ ندیم عباس! ہماری مٹھائی کہاں ہے۔ احوال میں خالی ہاتھ ہی چلے آئے۔ ارم خان! مشورے پہ عمل بھی ہوا یا نہیں۔ ملک علی رضا اور ایم تحسین! جی آیاں نوں۔ شاہد حسین اور سلیمان شبیر تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تحفہ، بیری کا آسیب، میں کیا کرتا، چمگاڈر کی مورتی، خونی ڈنگل، ناگن دوست، فرعون کی قید میں، بھوت ٹرین، جنوں والا بنگلہ، بہترین کہانیاں تھیں۔ بلی یا فردوس، پری زاد، کالا حبشی، اجازت، انارکلی، زہریلی کوکھ، چترہاری سانپ کا مذاق، فلائٹ ٹو تربت، بھی بہت پُراسرار تحریریں ثابت ہوئیں۔ جبکہ تین صدیوں بعد بھی وہ لڑکا کون تھا۔ ہم نے گھر چھوڑ دیا۔ پردے میں رہنے دو۔ ناقابل یقین تحریریں رہیں۔ باقی سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اس سے پہلے کہ کاشی بھیا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو۔ اس خوب صورت محفل سے اجازت۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

☆: لو جی! تبصرہ ہوا شائع پورا۔ خوش رہو۔ اور ہر ماہ احوال میں اسی طرح حاضر رہو۔

✉: کورنگی، کراچی سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں محمد سہیل خان۔ لکھتے ہیں۔ نئے سال کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ نئے سال کی مبارک باد دیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ نیا سال آپ سب لوگوں کو جو سچی کہانیاں ڈائجسٹ سے وابستہ ہیں۔ بہت ساری خوشیاں لائے اللہ آپ سب لوگوں کو صحت، عزت اور محبت عطا فرمائے اور آپ کے ڈائجسٹ کو دن دُگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین ثمہ آمین) کاشی بھائی فروری میں ہماری شادی کی 28 ویں سالگرہ ہے۔ سچی بات ہے کہ مجھے میری بیوی نے سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی طرف توجہ دلائی کہ آپ یہ ڈائجسٹ پڑھا کریں۔ کیوں کہ وہ بھی پڑھا کرتی تھیں۔ میں نے جب اُسے پڑھا مجھے اس میں کہانیاں اچھی لگیں اور اِس ڈائجسٹ سے سیکھنے کا موقع ملا۔ میں بھی تھوڑا بہت لکھنے لگا آپ نے میری ہمت بندھائی اور میں نے جو لکھا آپ نے ڈائجسٹ کی زینت بنایا۔ تو اُسی حوصلہ کے ساتھ آج شادی کی سالگرہ کے موقع پر اپنی شریکِ حیات کے بارے میں چند اشعار کی صورت میں ارسال کر رہا ہوں۔ کیوں کہ وہ جب یہ پڑھیں گی تو اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے۔ اُن کو دینے کا۔

میری ہم شریک، میرے ہم سفر ☆ ☆ تیرے بغیر کچھ نہیں سب ہوا ہُوا
تُو ہی میری جستجو، تُو ہی میرا امتحاں ☆ ☆ تُو نے قدم قدم پر دیا مجھے نیا حوصلہ

میں تجھے نہ کچھ دے سکا، نہ ہوئی تو مجھ سے خفا ☆ ☆ تیری اِس سادگی پر مجھے ہمیشہ ناز رہا
میری اللہ سے یہی دعا ہے تُو نہ ہو مجھ سے جُدا ☆ ☆ ہو سہیل کو عطا کی ہم سفر وہ زندگی کے ساتھ رہے

☆: لیجیے بھیا سہیل! آپ خوش، بھابی خوش تو ہم سب بھی خوش۔ سلامت رہو مگر...... احوال سے جڑے رہو بھائی۔

✉: اکوال، تلہ گنگ سے ہمارے پیارے سلیمان شبیر عرض کرتے ہیں۔ نئے سال کا پہلا ماہ نامہ 30 دسمبر کی یخ بستہ شام کو ملا۔ جس سے شام کا مزہ دوبالا ہوگیا۔ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا ''تجدید عہد وفا'' پڑھا۔ 16 دسمبر کا دن ہمارے لیے بہت سے سوال چھوڑ کے گیا ہے۔ پہلے 16 دسمبر 1971ء اور پھر 16 دسمبر 2014ء۔ آہ۔ احوال میں بھی سب نے بہت عمدہ تبصرے کیے۔ میری طرف سے تمام احوالیوں کو اور احوال میں نئے شامل ہونے والوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام خلوص اور نیا سال مبارک۔ اسماء اعوان لائف بوائے میں اس دفعہ بہت زبردست کہانی لے کر آئیں۔ ''جدا نہ ہوں گے'' سیما غزل کی واقعی شان دار کہانی تھی۔ ایڈیسن ادریس مسیح ''عشق زادے 2'' بھی زبردست کاوش تھی۔ ''ٹھکانہ''، ''مجھے موت چاہیے''، ''فراڈ کمپنی''، ''آخری دعا'' بھی زبردست کہانیاں تھیں۔ ''آخری چوری'' اور ''اجنبی مسیحا'' نہایت ہی منفرد تھیں۔ بھائی مجید احمد جائی کی ''یاد رکھے گی دنیا'' آنکھیں کھولتی ایک تحریر تھی۔ جس میں رشتوں کا خون ہوتے دکھایا گیا ہے۔ ممتاز احمد بھائی ہمیشہ کی طرح ''دیکھ میرا نصیب'' کے عنوان سے زبردست کہانی لائے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ہم شکل اور زہرِ عشق ہمیشہ کی طرح لاجواب۔ باباجی کو اللہ پاک جزائے خیر دیں۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں بھی سب کے انتخاب اچھے تھے۔ اور کاشی بھیا مجھے صرف پڑھنے کا شوق ہے لکھنا بہت مشکل اور بڑے لوگوں کا کام ہے۔ اس کے ساتھ اگلے ماہ تک اجازت۔

☆: اچھے سلیمان! محنت اور کوشش کر کے ہر شخص بڑا بن جاتا ہے۔ بس حوصلہ اور ہمت ہونا چاہیے۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری ساتھی مومینہ بتول عرض کرتی ہیں۔ سب سے پہلے آپ کو بھائی کی شادی کی مبارک باد پیش کرنی ہے۔ سو مبارک باد قبول ہو۔ آپ کے جواب نے جو کہ احوال میں شائع ہوا مجھے احساس فخر میں بتلا کر دیا ہے۔ خدا آپ کو کامیاب زندگی عطا فرمائے۔ برائے کرم حوصلہ مند جواب دے کر میری صلاحیتوں کو نکھار دیں کیونکہ یہ صرف تم ہی ہو جس نے مجھے محبت سے یاد رکھا اور شائع کیا۔ اس وجہ سے میری ذات قلم جیسے قبیلے میں پہچان بنی لہٰذا مجھے حوصلہ دیں

☆: بہت پیاری بہن! انشاء اللہ جلد سب کچھ شائع ہوگا بس آپ لکھیں اور بھیجیں۔

✉: ہماری آپا مسز نوید ہاشمی، نارتھ ناظم آباد کراچی سے لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں پُراسرار نمبر 3 پڑھا سچ پہلے والے سے زیادہ شان دار مزے دار تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک اچھی تھیں۔ بہت محنت اور لگن سے لکھا گیا تھا۔ ڈرنا ضروری نہیں مگر مزہ ہو۔ کہانی ایسی ہو جو پڑھنے والے کو ختم کرنے سے پہلے اٹھنے نہ دے وہ سب تھا پُراسرار نمبر میں۔ ایک احوال کے خط کو مختصر کرو کا طوطا ہمارے سر پر سوار کر دیا گیا ہے۔ صرف نام کہانیوں کے لکھاریوں کے نام اپنے بہن بھائیوں کی خیریت معلوم کرنے میں بیچ ختم ہو جاتا ہے اور اُس کو مختصر کرو کتنا۔ کیا نام کی جگہ اب آپ لکھیں کہانی کی جگہ 1,2,3 لکھیں۔ خیریت معلوم کرنا چھوڑ دیجیے۔ کیا کرتے۔ چلو کوشش کرتی ہوں۔ جن لوگوں نے میری کہانی پسند کی (دکھ کی فصیل کٹ گئی) اُن کی شکر گزار ہوں۔ زرینہ جونیجو کے والد کا سن کر افسوس ہوا۔ منزل خان آپ

کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ اپنا خیال رکھیے، فریدہ جاوید فری آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ احوال میں شامل سب افراد اپنا خیال رکھیے۔

☆: اچھی آپا! ہماری مجبوری، ہماری محبت کے آڑے نہیں آسکتی۔ کہتے ہیں ستم سہ کر ہی محبت کی قدر آتی ہے۔

✉: ہماری اچھی بہن، فرح انیس کراچی سے محفل میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ جنوری کا شمارہ کافی جلدی موصول ہوگیا تھا۔ احوال میں تمام احوالیوں نے خوب رونق لگائی ہوئی تھی۔ سب ہی کے تبصرے اچھے لگے پر یہ کیا؟ میرا تبصرہ کہاں گیا اور کس نے اغوا کیا؟ (ارے لڑکی! تبصرہ اتنا لیٹ آیا کہ شرمندہ ہوکر احوال کے دروازے سے داخل ہی نہ ہوا) رضوانہ کوثر کی والدہ اور گل ملک کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ نزاہت افشاں، اللہ کا شکر ہے بھائی آپ کیسے ہیں؟ رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے تمام لکھاریوں کو میری طرف سے بہت مبارک باد۔ سیما غزل اور فرحت صدیقی کی تحریر کافی دلچسپ لگی۔ ایڈیسن ادریس مسیح کی تحریر بہت زبردست تھی۔ شاہد رفیق سہو کی تحریر دکھی کرگئی۔ سچ ہے کہ ایک ماں باپ دس اولادیں پال سکتے ہیں پر دس اولادیں مل کر ماں باپ کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ محمد سلیم اختر کی تحریر میں ایک مرد کے شک نے بے چاری عورت کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ ارم ناز کی تحریر عمدہ لگی، واقعی بہت انوکھا نشہ تھا۔ صائمہ بشیر کی تحریر میں بلی کی وفاداری نے حیران کرڈالا۔ غنی پرواز کی تحریر بھی اچھی رہی۔ بابا جی بکری سے شیر بنادیا لڑکی نے تو۔ اقبال بانو کی تحریر بہت اچھی تھی۔ فرسودہ روایات میں جکڑی ہوئی ایک لڑکی کی بے بسی آنکھوں کو نم کرگئی۔ مجید احمد جائی کی تحریر میں بہن کی سنگ دلی پر افسوس ہوا۔ ممتاز احمد کی تحریر بھی بہت اچھی تھی۔ برائی کا انجام ہمیشہ برائی ہی ہوتا ہے۔ انیلا امام بخش، کوثر خان، فصیحہ آصف خان کی تحریریں بھی پسند آئیں۔ باقی اور ابھی پڑھی نہیں۔ زہر عشق ماشاء اللہ خوب صورتی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ہائیڈ پارک میں رضوانہ کوثر کی غزل اچھی لگی۔ تیر نیم کش میں سب ہی کے اشعار اچھے لگے۔ آخر میں ان لوگوں کا بہت شکریہ جنھوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔

☆: ارے فرح! تم نے تو پورے احوال کو اسیر کرلیا۔ خوش رہو! ہم اُس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں بہنوں کو مان دیا جاتا ہے۔ تم ہمارا مان ہو۔

✉: ایم یعقوب احمدانی، ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں۔ کاشی صاحب میں طویل عرصے کے بعد لوٹ آیا ہوں۔ یہ آپ کی محبت ہے اور سچی کہانیاں کا اپنا پن۔ یہ عرصہ مجھ پر بہت بھاری گزرا ہے۔ میں بہت بیمار ہوگیا اُٹھنے بیٹھنے سے قاصر تھا۔ علاج کر کر کے تھک گیا پھر خدا کی مہربانی سے صحت یاب ہوگیا تو آپ سب سے ملنے چلا آیا۔ جناب ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، شعبان کھوسہ بھائی، منعم اصغر صاحب آپ سب کیسے ہو؟ کاشی صاحب آپ تو دل کی تار کو مضبوطی سے جوڑے ہوئے ہو۔ آپ کی اس محنت و عظمت کو سلام۔ جولائی میں میری اسٹوری میں خوشی ہوں آئی تھی۔ بہت سارے دوستوں نے سوالوں کے انبار لگادیے تھے۔ مگر جواب بھی دیے تھے۔ تھوڑا یاد ہے۔ اور فرح انیس جی یہ آپ کی محبت ہے۔ میری اسٹوری پر آپ نے آنکھوں سے آنسو بہائے۔ یہ آپ کی عظمت ہے اور منعم اصغر جی اپنی طبیعت کو بدلو۔ اور میرے شہر کی ارم جی کیسی ہیں؟ کہاں ہیں اور میرے پیارے دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔

☆: یعقوب! خدا تمھیں صحت دے۔ یار ہمارے پرچے کی صحت بھی تو تم سب کی آرا سے ہی وابستہ ہے۔ امید ہے ہماری صحت کا بھی خیال رکھو گے۔ کہانی شائع ہورہی ہے۔ خوش!!

✉: ایک طویل عرصے بعد ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاول پور سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتے ہیں۔ 2015ء رخصت ہورہا ہے۔ نئے سال کی آمد آمد ہے۔ سال کا آخری دسمبر کا پُراسرار نمبر 3 اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ایک زبردست کہانیوں پر مبنی شمارہ ہے۔ تمام کہانیاں زبردست ہیں۔ اسکیچز بھی لاجواب ہیں۔ ٹائٹل بھی عمدہ ہے۔ کتابت بھی لاجواب رہی۔ فقروں میں تلفظ کی غلطیاں بھی نہیں ہیں۔ بڑی محنت سے آپ نے سنوارا ہے۔ اب نئے سال 2016ء جنوری کے شمارے کا انتظار ہے۔ آپ کی محنت رنگ لائی ہے۔ بلاشبہ پراسرار نمبر 3 کو آپ نے محنت سے سنوارا ہے۔ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف عملہ کو نیا سال مبارک ہو۔ سال کے آخر میں آپ نے اچھا شمارہ قارئین کو دیا ہے۔

☆: سچ مانیں بھائی بشیر! آپ کے تبصرے نے میرے چاروں اور محبت کے دیپ جلا دیے۔ میرے کان آپ کی آواز سننا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کا دیا ہوا موبائل نمبر گونگا ہے۔ پلیز کچھ کریں۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہمارے بھائی اشفاق شاہین کی۔ لکھتے ہیں۔ سرورق پر اذیت ہوتی ہے۔ ڈبل پیج کو دیکھ کر۔ (کچھ ساڈی وی مجبوری ہوندی اے) کاشی بھائی! ذرا ادھر بھی توجہ دیں۔ منزہ سہام کا اداریہ ہمیں نیا جذبہ عطا کرگیا۔ مہمانوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ احوال میں پہنچے، اپنی غیر حاضری ہمیں تو سمجھ نہیں آئی، خط لکھا تو تھا۔ (مگر......) سنبل سب سے پہلے موجود تھیں۔ بہت اچھا لکھا۔ ممتاز احمد بہت خوب، مور شاہد گڈ، سدرہ انور اور مجید جائی نے کیا خوب لکھا۔ شمسہ قمر، امتیاز عاصم پہلی بار آئے تہہ دل سے خوش آمدید۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی بہت عمدہ تھے۔ عبدالغفار عابد، جوینجو سسٹرز کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔ پہلی سچ بیانی ”جدا نہ ہوں گے ہم“ سیما غزل پرچے کے لیے ایک تحفہ ہے بہت خوب۔ گریٹ! گرہن لگا جیون نے بھی ہمیں پل بھر غافل نہ ہونے دیا۔ شاہد رفیق کا ٹھکانہ بہت عمدہ تھا۔ مجھے موت چاہیے، کراس ٹاکنگ بھی اچھی رہیں۔ وفا کیسی، میری پہلی کاوش ہے امید ہے دوست احباب اصلاح فرمائیں گے۔ ہم شکل بس ٹھیک ہی جارہی ہے۔ گو کہ بہت دلچسپ نہیں ہے۔ ساتوں حکایتیں مختصر مگر پراثر رہیں۔ پہلا شعلہ ’وٹا سٹا‘ بہت متاثر کن اور سبق آموز رہا۔ دوسرا شعلہ بھی سبق آموز تھا۔ ”آخری دعا“ ہمیں دکھی کرگئی۔ تینوں مرد کہانیاں بھی بہت پسند آئیں۔ تیر نیم کش میں ملازم شیرازی، ریاض تبسم اور صائمہ بشیر کا انتخاب لاجواب تھا۔ تمام احباب کو بہت بہت سلام۔

☆: بھیا اشفاق! آپ کا تبصرہ لیٹ ہوا سو...... اب تو کوئی گلہ نہیں ہے نا۔

✉: کوہاٹ جیل کے پی کے سے ہمارے نئے ساتھی لکھاری سید ملازم حسین شیرازی عرض گزار ہیں۔ ماہ دسمبر 2015ء کا شمارہ اپنی نت نئی رعنائیوں اور دلچسپیوں سے بھرپور ہے۔ کمپوزنگ، سرورق کی دیدہ زیب کلر اسکیم، احوالیوں کے خطوط، لکھاریوں کی کہانیاں، سب بے مثال اور عمدہ ہیں۔ فرداً فرداً 40/45 احوالیوں کے خطوط کے جوابات، کہانیوں پر تبصرے، اداریہ، تیر نیم کش، ہائیڈ پارک، مسئلہ یہ ہے پر اگر ایک ایک مختصر جملہ بھی لکھا جائے تو اس کی طوالت پر قینچی کی کاٹ تیز رفتاری سے اپنا کام دکھائے گی۔ لہٰذا مختصراً عرض کرنا پڑتا ہے۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ”نابینا“ ٹریفک کا اژدھام...... چند

لمحوں کی عدم برداشت سے بڑے بڑے سانحات رونما ہوتے ہیں' صحیح فرمایا۔ کاشی چوہان کا زہر عشق، سنسنی، تجسس اور محبت سے بھرپور داستان، نہایت عمدہ۔ ایم اے راحت، کا ہم شکل، بے مثال دل میں اُترنے والا سلسلہ۔ محمد سلیم اختر، بلی یا فردوس، اثر انگیز کہانی، وقاص حسین کی پری زاد...... اچھی تحریر، ابو ہریرہ بلوچ، تحفہ، انمول محبت کی داستان، شائستہ انور کی تحریر بیری کا آسیب، اچھی کاوش سکندر حبیب، خونی دنگل، ہولناک کہانی، ارم ناز، کالا حبشی، کسی عامل کی ہدایت اور اجازت کے بغیر کوئی عمل، چلہ الٹا بھی ہوسکتا ہے۔ حنا بشریٰ، اجازت، عبرت کہانی، محبت سب مخلوق میں پائی جاتی ہے۔ اس کی غلط اپروچ نقصان کا باعث بنتی ہے۔ اثر انگیز باقی سب لکھاریوں نے عمدہ کہانیاں لکھیں لاجواب ہیں۔ اب آتے ہیں احوالیوں کے خطوط کی طرف۔ ممتاز احمد، مقصود احمد بلوچ، ابوزر غفاری، سلیمان بشیر، نزہت ناز، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، اعجاز احمد فکرال، سونیا خان، عظمیٰ شکور، محمد ندیم عباس میوانی، منزل خان، ابوہریرہ بلوچ، فریدہ جاوید فری، ملک محمد اکرم آھیر، ارم خان، حجاب فاطمہ، ایم افضل آزاد، مورشاہد حسین، شاہد رفیق سہو، سب نے بہترین اور عمدہ خطوط لکھے ماشاء اللہ۔ مسز نوید ہاشمی، عارف شہزاد، صائمہ بشیر کا شکریہ کہ انھوں نے میری کہانی ''مجرم کون'' کو سندِ قبولیت عطا فرمائی۔ دل تو چاہتا ہے کہ احوالیوں اور تبصرہ نگاروں کی خدمت میں مزید عرضداشت پیش کروں۔ لیکن اس سے دیگر دوستوں کے حقوق تلف ہونے کا امکان پیش نظر ہے۔ خوش رہیں، آباد رہیں۔ پاک دھرتی کی محبت میں سرشار رہیں۔

☆: بھائی شیرازی! آپ کی کہانی جلد شائع ہوگی۔ تبصرے کے لیے دل سے ممنون ہوں۔ سلامت رہیے۔

✉: کراچی سے بڑے دنوں بعد ہماری ساتھی لکھاری جیجل میتلو احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے اندرونِ سندھ چلی گئی تھی۔ اس لیے رسالہ سچی کہانیاں پڑھ سکی نہ خط وغیرہ لکھا۔ کراچی آئی تو نومبر، دسمبر کے ڈائجسٹ آئے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے دسمبر کا رسالہ کھولا۔ منزہ جی کا نابینا پڑھنے کے بعد احوال میں انٹری ماری اور گڈی آپا کا پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ بہت افسوس ہوا گڈی آپا میری پسندیدہ رائٹرز میں شمار ہوتی تھیں۔ لیکن کوئی کتنا بھی پسندیدہ ہو، جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا ہے تو بس سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ آخر میں سب کو سلام۔ تبصرہ اگلے سال جنوری 2016ء میں جو کہ چند دن کی دوری پر ہے۔

☆: اچھی بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانیاں دور فرمائے۔ لیجیے آپ کی احوال میں حاضری تو ممکن ہوگئی 2016ء میں۔ باقی آپ کی کہانی زیرِ غور ہے۔

✉: لاہور سے ہماری بہت عزیز بہن، حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ آپ کے حادثے کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو صحت و زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔ پچھلے ماہ کا خط شاید ڈاک کی نذر ہوگیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اہم پیغامات دیے تھے۔ جو نیجو سسٹرز کو اللہ صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ان کے والد کے درجات بلند فرمائے۔ منزل خان کے بیٹے کے لیے دعا گو ہوں۔ گل ملک صاحب کی اللہ مغفرت فرمائے۔ رضوانہ کوثر صاحبہ کی والدہ کی وفات پر بہت دُکھ ہوا۔ اللہ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے (آمین) دسمبر کے شمارے پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ بہرحال سب نے بہت اچھا لکھا پری زاد بہت خوب صورت کہانی تھی۔ دسمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ پھر سے تبصرہ کیا تو شاید جنوری کا تبصرہ نہ ہوسکے۔ ٹائٹل دلکش تھا۔ احوال کے گلشن میں رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے۔ کاشی بھیا یہ آپ کی محبت ہے جس نے احوال کی رونق کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ پُراسرار نمبر کے حوالے سے صرف ایک بات کہنا چاہوں گی۔ کہانیاں حقیقی ہوں یا غیر حقیقی مگر اُس میں ایک سبق جس طرح ہمارے رائٹرز نکالتے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ ورنہ خوفناک کہانیوں پر مبنی اور بھی رسالے ہیں۔ مگر میں صرف سچی کہانیاں ہی پڑھتی ہوں۔ کیوں کہ صرف کہانی کو خوفناک بنانے سے بات نہیں بنے گی۔ اس لیے میں سچی کہانیاں کے پُراسرار نمبر کی بہت فین ہوں۔ اللہ مزید ترقی عطا فرمائے۔ لکھنے والوں کو مزید ہمت عطا فرمائے۔ بات بہت لمبی ہوجائے گی۔ بہرحال اوروں کو بھی موقع دینا ہے۔ مجید احمد جائی صاحب اور اُن کی بہن کو اللہ صحت عطا فرمائے۔ (آمین) 2015ء میں جن لکھاریوں نے رائٹرایوارڈ حاصل کیا اُن سب کو مبارکباد۔ اب کہانیوں کی بات ہوجائے۔ سچ بیانیاں تمام زبردست تھیں۔ کیا سے کیا ہوگیا ہوں، پشیمان، اسنیپ چیکنگ بہت اچھی تھیں۔ وہ بلی کا بچہ نے بہت متاثر کیا۔ نزہت ناز نے منفرد تحریر دی۔ مہمیز زبردست تھی۔ بالکل صحیح کہا۔ بڑا آدمی آج کے حالات کی عکاسی کررہی تھی۔ اقبال بانو کی وٹا سٹا واقعی ایک سنگین حقیقت ہے۔ سید ملازم حسین شیرازی کی فراڈ کمپنی نے واقعی لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہوں گی۔ آخری دعا بہت دلگداز تحریر تھی۔ تینوں مرد کہانیاں بھی پُر اثر تحریریں تھیں۔ یادر کھے گی دنیا مجید احمد جائی کی تحریر بلاشبہ بہترین تحریر تھی۔ واقعی یاد رہے گی۔ ممتاز احمد صاحب کی دیکھ میرا نصیب بہت عبرت انگیز تحریر تھی۔ زہر عشق بہت خوب جارہی ہے۔ کاشی بھیا اللہ آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ ہمیشہ خوش رہیں۔ آخر میں آپ سب کو تمام اسٹاف کو تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو نیا سال بہت مبارک ہو۔

☆: بہن حنا! آپ کا تفصیلی تبصرہ پسند آیا۔ اگلے ماہ کے تبصرے کا ابھی سے انتظار کررہا ہوں۔ امید ہے بھائی کی بات رَد نہیں ہوگی۔

✉: خضر حیات روڈہ تھل سے پہلی بار احوال میں شامل ہورہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ امید کرتا ہوں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے اور خوش آمدید کہیں گے۔ میں نے پہلی بار سچی کہانیاں پڑھا پہلی بار ہی اچھا لگا اور پہلی بار ہی خط لکھ دیا۔ میں اور بہت سے میگزین اور ڈائجسٹ پڑھتا ہوں۔ لیکن سچی کہانیاں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کا کوئی ثانی نہیں، یہ لاجواب ہے۔ میں نے پہلی بار ہی پڑھا تو بہت بہت اچھا لگا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ صرف پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ لکھتے بھی ہیں۔ میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں۔ میں نے بھی سچی کہانیاں میں لکھنے کا آغاز کیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔ اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆: پیارے خضر! خوش آمدید! لو بھیا ہم نے تمہارا خط شامل احوال کیا۔ اب سچی کہانیاں سے رابطہ نہ توڑنا۔

✉: محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے شاملِ احوال ہیں۔ جنوری 2016ء کا سندر شمارہ ملا۔ منزہ سہام کے قلم سے لکھا گیا تجدید عہد وفا ایک بار پھر پشاور آرمی پبلک اسکول کی یاد دلا گیا۔ ہم اور ہمارے مہمان میں سب کی دلفریب تصویریں پسند آئیں۔ سب کے تبصروں سے ایک بات تو صاف دکھائی دیتی ہے کہ لوگ سچی کہانیاں اور پیارے بھیا کاشی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اللہ ہم سب کا پیار ہمیشہ قائم دائم رکھے۔ آمین۔ تحریروں میں ماشاء اللہ جی۔ جدا نہ ہوں گے ہم، سیما غزل کی کہانی بہت اچھی لگی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ گرہن لگا جیون۔ فرحت صدیقی اور ایڈیسن

ادریس مسیح کی تحریر بھی کیا لاجواب رہی۔ آخری دعا بھی کہانی بہت اچھی تھی۔ فراڈ کمپنی پسند نہیں آئی۔ وٹا سٹا اقبال بانو کی تحریر جاندار تھی۔ اس کے بعد بھیا مقصود احمد بلوچ کی کہانی بہت اچھی تھی۔ ماشاء اللہ بھائی مقصود جی مجھے فخر ہے کہ آپ کا تعلق اس فیملی سے ہے۔ جس میں بہت سارے شہید موجود ہیں۔ ہائیڈ پارک میں سب لکھاریوں کی تمام من پسند تحریریں قابل تعریف تھیں۔ غزلیں اچھی تھیں۔ آخر میں بہت ساری نیک دعاؤں کے ساتھ اس محفل سے اجازت چاہوں گا۔

☆: اچھے قاسم! تبصرہ اچھا لگا۔ اور ہاں اپنی آمد اسی طرح ممکن بناؤ۔

✉: حفصہ خان، حسن نگر جھنگ صدر سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں سے تعارف کچھ عرصے پہلے اپنی دوست سدرہ انور علی کے ذریعے سے ہوا۔ سچی کہانیاں ہر لحاظ سے ایک زبردست ڈائجسٹ ہے۔ اس کے سارے سلسلے ہی بہترین ہیں۔ جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے دن دگنی، رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔ کاشی بھیا میں ایک لیڈی کانسٹیبل ہوں۔ ہر ماہ سچی کہانیاں پڑھتی ہوں اگر آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو آپ کو کہانی بھیجوں گی۔ جس پیشے میں، میں ہوں وہاں ایسی ہزاروں کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ تمام پڑھنے والوں کو سلام۔

☆: حفصہ جی! خوش آمدید۔ کانسٹیبل صاحبہ تبصرہ بھیجنے کا شکریہ۔ کہانی فوراً بھیجیں۔ ہمیں انتظار رہے گا۔

✉: اسلام آباد سے یہ ہیں ہماری بہت شریر، نٹ کھٹ سی عظمیٰ شکور۔ لکھتی ہیں۔ ارے ارے کانپ کیوں رہے ہیں۔ سردی اسلام آباد میں اور آپ کراچی میں جمے جا رہے ہیں۔ اُف خدا جھوٹ نہ بلوائے حد سے زیادہ سردی پڑ رہی ہے یہاں! ہم مر مر جا رہے ہیں مگر فروری میں کچھ کمی آجائے گی۔ دو اُبلے انڈے اور بڑا سا ئی مگ پی کر جب کچھ جان میں جان آئی تو رسالہ کھول کر دیکھا کہ کون کون ہمیں یاد کر رہا ہے۔ ہمیشہ کی طرح پھولوں سی تحریر منزہ سہام کی واہ بہت خوب۔ دوڑ کر احوال میں پہنچے سانس بحال ہونے پہ جو پڑھتے تو یوں سمجھیں گم ہو جاتے ہیں۔ سو تھینکس ارم خان یاد رکھنے کے لیے۔ سبھی خطوط زبردست تھے اور واقعی میں حیرانگی ہوتی ہے کہ سب کس قدر غور غور سے رسالہ پڑھتے ہیں۔ گڈ جناب! ذرا جو آگے بڑھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ رائٹر ایوارڈ ''ہائے میں مرجاواں'' میں بھی...... ویسے ایڈیٹر صاحب آپ بہت اچھے ہیں قسم سے۔ خوش ہونے کے بعد کہانیوں پہ نگاہ دوڑائی۔ ''گرہن لگا جیون'' پڑھا قسم سے رو رو کے بُرا حال ''فرحت صدیقی'' کوئی تو خوشی لکھ دی ہوتی کہ لبوں پہ مسکراہٹ کھل جاتی مگر نہیں...... محمد سلیم اختر صاحب دل دہلا دینے والی اسٹوری لیے آئے ''مجھے موت چاہیے'' اُف معاشرے کی ایک تلخ حقیقت...... لو جی آج تو لکھنے والوں نے ٹھان لی ہے کہ عظمیٰ کو بس رُلاتے ہی رہنا ہے۔ انیلا امام بخش جب ''روگ'' لیے حاضر ہوئیں تو مت پوچھیں دل پہ کتنے صدمات گزر گئے۔ اُف جائیں تو کدھر، کریں تو کیا۔ یا اللہ خوشی کیوں نہیں دکھتی۔ سو تھینکس کوثر خان آپ کی تحریر ''علاج'' سے دل کچھ مطمئن ہوا کہ زندگی صرف مایوسی کا نام نہیں۔ اچھا لگا پڑھ کر۔ طبیعت ذرا خوش ہوئی تو سوچا ہائیڈ پارک میں جایا جائے۔ فاطمہ عنبرین کا اچھا انتخاب تھا۔ ڈاکٹر محمد فاروق ایک بہت بڑی بات دو لفظوں میں کہہ گئے گڈ۔ یوسف لغاری صاحب آپ کا انتخاب بھی خوب رہا۔ اچھا لگا پڑھ کر۔ تیر نیم کش میں سب ہی شعر بے مثال تھے۔ تو ثابت ہوا کہ رسالہ ہر لحاظ سے زبردست ہے اور سب سے بڑی بات اچھے دوستوں کا حسین ساتھ بھی ہے۔ اور پھر کاشی چوہان جیسے ایڈیٹر ہوں ہمارے رسالے کو تو مغرور ہونے کو جی چاہتا ہے قسم سے۔ وہی ہوا نا! چائے ٹھنڈی ہوگئی میری۔ اوکے میں جاتی ہو آپ ذرا

تبصرے پر غور فرمائیں۔

☆: پیاری عظمیٰ! قسم سے تبصرہ بہت شاندار لگا۔ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ہمیں آپ کے تبصرے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ اپنا خیال رکھا کریں۔ کہیں زیادہ سردی میں ہماری نٹ کھٹ لڑکی ’مجسمہ‘ ہی نہ بن جائے۔

✉: سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی ممتاز احمد عرض گزار ہیں۔ سچی کہانیاں 29 دسمبر کو موصول ہوگیا۔ ٹائٹل پر خوب صورت حسینہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ ’’تجدید عہد وفا‘‘ کے عنوان سے منزہ سہام کا لہو رُلاتا اداریہ ایک بار پھر اشکبار کرگیا۔ احوال کی ابتدا میں کاشی نے خوب صورت لفظوں کے موتی پروئے اور چند لائنوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دیں۔ کاشی بھیا شمارہ بہت خوب صورت اور اچھا لگا۔ جس کے ہر ورق میں آپ کی محنت کا عکس نظر آرہا تھا۔ پیارے کاشی بھیا آپ کی محبت اور چاہت مجھے کراچی کھینچ کرلے گئی اور آپ نے جو پیار‘ خلوص‘ عزت واحترام اور اپنائیت مجھے دی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ سب میری زندگی کا قیمتی اور انمول سرمایہ ہے۔ سب سے پہلے تمام ایوارڈ یافتگان کو دل کی گہرائیوں سے بہت بہت مبارک باد۔ اللہ کریم سب کو اور زورِ قلم عطا فرمائے اور سب مایہ ناز اور بلند پایہ لکھاری بن کر اُبھریں۔ آمین۔ اُن تمام دوستوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے میری کہانی کو پسند فرما کر میری حوصلہ افزائی کی۔ اللہ رب العزت گل ملک اور آپا رضوانہ کوثر کی والدہ محترمہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ پیاری بہنا اُمّ عادل آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری محبت اور خلوص بھری پکار کے جواب میں اپنی حاضری سے احوال کو رونق بخشی۔ پلیز ہر ماہ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔ اس مرتبہ بہت عرصے کے بعد محترمہ سنبل اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر رونق افروز تھیں۔ شاہد رفیق سہو کی ’ٹھکانہ‘ اور ’روگ‘ علاج بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ ارم ناز کی ’انوکھا نشہ‘ واقعی ایک انوکھی اور اچھوتی کہانی تھی۔ ’کراس ٹاکنگ‘ پسند نہیں آئی۔ کیا سے کیا ہوگیا ہوں‘ پشیمان‘ مناسب تھیں۔ ’وہ بلی کا بچہ‘ مختصر مگر بے زبان اور معصوم جانوروں سے پیار کا درس دیتی بہترین کہانی تھی۔ ’اپنی اپنی بات‘ ’مہمیز‘ بڑا آدمی مختصر مگر اچھی کہانیاں تھیں۔ ’وٹا سٹا‘ ایک عمدہ تخلیق تھی۔ سید ملازم حسین شیرازی ’فراڈ کمپنی‘ کے نام سے بہترین کہانی لے کر آئے۔ ’آخری دعا‘ دردناک کہانی تھی۔ ’اجنبی مسیحا‘ بہت زبردست کہانی تھی۔ وکیل نے مجرم کو اپنے ہاتھوں کیفر کردار پہنچا کر اُس کی قبیح جرم کی سزا بھی دی اور پیسہ بھی کما لیا اور یہی پیسہ رفاحی اداروں میں بانٹ دیا۔ بہت خوب گڈ۔ ویلڈن۔ ’شہید‘ محمد اجمل کی زندگی اور شہادت کی داستان تھی۔ ایم ارشد وفا‘ مجید احمد جائی کی ’یادرکھے گی دنیا‘ بہترین اور لاجواب کہانی تھی۔ ہائیڈ پارک میں آپا رضوانہ کوثر‘ نوشابہ صدیقی اور شمسہ قمر کے انتخاب بہترین تھے۔ تیر نیم کش میں روبینہ ناز روبی‘ رانا حبیب الرحمٰن اور باجی صائمہ شبیر کے اشعار بہت زبردست تھے پسند آئے۔ آخر میں سب دوستوں کی خدمت میں خلوص اور پیار بھرا سلام۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

☆: اچھے بھیا! رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ...... وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے۔ آپ کی محبت‘ آپ کے ہر لفظ سے عیاں ہے۔ خوش رہیے۔

✉: شعبان کھوسہ‘ کوئٹہ سے شاملِ احوال ہیں۔ مارکیٹ کے کئی چکر لگانے کے بعد پانچ تاریخ کو سچی کہانیاں کے درشن نصیب ہوئے۔ کاشی بھائی ہماری طرف اتنا لیٹ کیوں رسالہ بھجواتے ہو۔ چکر لگا لگا

کر آدھا مہینہ ہوجاتا ہے۔ بھائی ذرا ہمارے حال پر ترس کھاؤ۔ باجی منزہ سہام کے اداریہ میں پہنچے۔ باجی ہماری قوم کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوچکی ہیں۔ پیاری بہن حجاب فاطمہ‘ منزل خان کو دوبارہ محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نئے آنے والوں کو دل سے خوش آمدید۔ احوال میں سب کے تبصروں نے دل جیت لیے۔ ہمارے قابلِ احترام رائٹر محمد سلیم اختر‘ ممتاز احمد‘ مجید احمد جائی کی کہانیوں کو پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اب کی بار بھی زبردست کہانیاں لے کر آئے۔ وقاص حسین‘ ارم ناز‘ حنا بشریٰ‘ ابوہریرہ بلوچ‘ نزہت جبیں ضیاء‘ فوزیہ فرید احمد‘ ملک محمد اکرم‘ سکندر حبیب‘ علی حسنین تابش‘ حاسم وقاص لاجواب تحریریں لائے۔ مختصر کہانیوں میں منزل خان‘ نفیہ فضل‘ شازیہ تحسین‘ عائشہ شفقت نے دل کو چھو جانے والی تحریریں لے کر آئے۔ ایم اے راحت کا ہم شکل‘ اور کاشی چوہان کے ناول‘ زہر عشق نے ہمیں اپنے عشق میں جکڑ لیا ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیتے ہیں۔ ویلڈن کاشی۔ باتیں تو بہت سی کرنی تھیں مگر کاشی کی قینچی غصے میں دیکھ رہی ہے۔ اِسی کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ حافظ۔

☆: پیارے کمانڈو! یقین کرلو تمہاری محبت کے تو ہم دل سے معترف ہیں۔ کہانیاں جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔ خاطر جمع رکھو۔

✉: محمد جاوید اقبال‘ ساہیوال سے پہلی بار احوال میں حاضری دے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے پیارے بھائی ندیم عباس کی اسٹوری شائع کی اور اسی کی وجہ سے آج میں لکھنے کی ہمت کررہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اور انشاء اللہ میں ہمیشہ سچی کہانیاں میں لکھتا رہوں گا۔ مجھے شاعری کرنے کا بے حد شوق ہے امید ہے کہ میری شاعری آپ کو پسند آئے گی۔ اور اگر حوصلہ افزائی کی تو میں انشاء اللہ ہمیشہ سچی کہانیاں میں لکھتا رہوں گا۔ میرا کسی بھی رسالے کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔ اگر اب میرا دل ٹوٹ گیا تو میں لکھ نہیں سکوں گا پھر آئندہ۔ امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گے۔ انشاء اللہ۔ آئندہ پورے شمارے پر تبصرہ کروں گا۔

☆: بھائی جاوید! سلامت باشد! خوش آمدید! ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ لو تمہارا شائع ہوا۔ دل نہ توڑو۔ دل میں رب رہتا ہے۔

✉: یہ احوال میں گرجدار انٹری دے رہے ہیں۔ چیچہ وطنی سے ہمارے ساتھی عبدالغفار عابد لکھتے ہیں۔ تین چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد اس پُررونق محفل میں حاضر ہورہا ہوں۔ سنائیں کیسے ہیں اپ لوگ؟ امید ہے آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ غیر حاضری کی وجہ اپنے علاقے کے ایم این اے چوہدری منیر اظہر کے ساتھ بطور سیکریٹری ڈیوٹی تھی۔ سچی کہانیاں کی مقبولیت میں کاشی بھیا کی محنت شامل ہے۔ باجی منزہ کا اداریہ ’تجدید عہد وفا‘ پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں۔ اگر ہم اپنے دشمن کو شکست دینا چاہتے ہیں تو یہ عہد بہت ضروری ہے۔ سسٹر ارم ناز جوتے کیا یہاں تو لفظ چوری ہوتے ہیں اور کچھ آفیسر لوگ لفظ قیمتاً بھی خریدتے ہیں۔ سستی شہرت کے لیے ’فن کار‘ رائٹروں نے ادب میں کرپشن شروع کررکھی ہے۔ اس کرپشن کو روکنے کے لیے آپریشن بہت ضروری ہے۔ محترم سلیم اختر کی تحریر ’مجھے موت چاہیے‘ عورت کی بے حسی کا رونا رو رہی تھی۔ سیما غزل اپنی تحریر ’جدا نہ ہوں گے ہم‘ میں انسانیت کا درس دے رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا احساس کرنا ہی اصل زندگی ہے۔ اشفاق شاہین بھائی‘ فصیحہ آصف خان نے بھی عورت پر ہونے والے مظالم کو خوب صورت انداز میں تحریر کیا۔ سید ملازم حسین شیرازی ’فراڈ کمپنی‘ لکھ کر بہت احسان کیا۔ آپ نے لکھا آپ کا کام

تھا۔ جو آپ نے کر دیا سمجھنا ہمارا کام ہے۔ کاشی چوہان کی 'زہر عشق' پورے رسالے کی جان ہوتی ہے اور ایم اے راحت کی 'ہم شکل' بہت خوب جا رہی ہے۔ گل ملک مرحومہ اور رضوانہ کوثر کی والدہ مرحومہ کے لیے دعا ہے کہ پروردگار ان کو آخرت کی آسانیاں نصیب فرمائے اور اہل خانہ کو صبر کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین۔ انعام یافتہ رائٹروں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اگر خطوط پر انعام ملتا تو سسٹر سدرہ کا پہلا انعام ہوتا۔ ان کا تبصرہ بہت جاندار ہوتا ہے۔ میری کہانی 'خود اپنے ہاتھوں' بھی ایوارڈ کے لیے منتخب ہوئی۔ اس حوصلہ افزائی پر میں ادارے کا شکر گزار ہوں۔ اب اجازت چاہتا ہوں انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور ملاقات ہوگی۔ بہت سی دعائیں آپ لوگوں کے نام۔

☆: اچھے بھیا! تبصرہ کہاں بیٹھ کر لکھتے ہو۔ تھوڑا ہمیں بھی بتا دو۔ ہم بھی حوصلہ پا جائیں گے۔ آپ کی آمد کے دل سے منتظر ہیں۔

✉: فتح جنگ' مہورہ اٹک سے نزابت افشال لکھتے ہیں۔ جنوری کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ نیا سال اور نیا رسالہ اور اس میں اک نیا پن بہت خوب بھایا۔ منزہ سہام آپی نے بہت اچھی بات کہی۔ مگر آپی جی واصف علی واصف نے کیا خوب کہا تھا کہ عظیم آدمی بھی مرتے ہیں۔ مگر موت ان کی عظمت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ احوال میں زیادہ تر نئے احوالی شامل ہوئے۔ سب کو خوش آمدید اور سونیا خان سسٹر آپ کو خوش آمدید کہا تھا میں نے۔ مگر میرا وہ لیٹر ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ فرح سسٹر' منزل آپی' نزہت ناز باجی اور بہت سے پرانے آشنا نظر نہیں آئے۔ کہانیوں میں جدا نہ ہوں گے۔ ٹھکانہ' مجھے موت چاہیے' وفا کیسی' کیا سے کیا ہو گیا' بلی کا بچہ' بڑا آدمی' دیکھ میرا نصیب' اور بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ پشیمان' بے اختیار غالب یاد آ گیا کہ

کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ☆ ☆ ہائے...... اُس زودِ پشیمان کا پشیماں ہونا

اور غالب کی تو کیا بات ہے۔ ویسے 15 فروری کو غالب کو دنیا سے رخصت ہوئے 147 سال ہو جائیں گے۔ مگر یہاں کے صاحبانِ اقتدار نے اقبال کو بھی نا بخشا سو اِن کی نظر میں غالب کیا چیز ہے؟

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے ☆ ☆ حق مغفرت کرے' عجب آزاد مرد تھا

ہائیڈ پارک میں سب نے اچھا لکھا۔ عظمی شکور نے کیا خوب لکھا۔ سلسلہ تیرِ نیم کش میں منزل آپی کا شعر بہت پسند آیا۔ آخر یہ سب کو سلام اور 7 فروری ہماری 22 ویں سالگرہ ہے۔ تحائف کے حق دار تو ہوئے تا ہم۔

☆: پیارے نزابت! سال گرہ مبارک! تبصرہ بہت زبردست کیا تم نے۔ تمہاری باقاعدگی' تمہاری محبت کا ثبوت ہے۔

✉: سونیا خان' بستی شاہ گردیز، کوٹلہ رحم علی سے برقی نامے کے ساتھ شریکِ احوال ہیں' لکھتی ہیں۔ سال 2016 کے آغاز کے دن ہی سچی کہانیاں ہماری دسترس میں آیا۔ ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے تجدید عہد وفا لکھا۔ سولہ دسمبر میں کہاں بھول سکتی ہوں۔ اُس دن ہم بھی اپنے اسکول میں تھے۔ ایک قیامت تھی۔ بس...... احوال میں کاشی بھیاء بڑی میٹھی باتیں کر رہے ہیں، کاش کہ ہر دل میں اُتر جائیں۔ سنبل کے حصے میں صدارت آئی۔ مبارک ہو۔ ایم اشفاق بٹ، ثنا ایڑو، مور شاہد حسین، سید ملازم حسین، محترم ممتاز احمد، پیارے مجید احمد جائی، صائمہ مجید، صائمہ بشیر، نزابت افشال، سدرہ انور علی، محمد قاسم خان، ارم خان، نعیم اللہ، اُم عادل، مزاح نگاری کرتی کنزہ

فروری 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا / کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:...

مکمل پتا:...

....

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

فروری 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا / بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:.......................... تعداد صفحات:..........................

نام:...

مکمل پتا:...

....

فون / سیل نمبر:...

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

فروری 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا / کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان:.......................... مصنف:..........................

دوم، عنوان:.......................... مصنف:..........................

سوم، عنوان:.......................... مصنف:..........................

نام:.......................... شہر:..........................

ملک، راشد لطیف، علی حسنین تابش، خوبصورت احوال کے ساتھ حاضر تھے۔ منشی محمد عزیز میئے، فیصل ندیم بھٹی، رانا شاہد، مسز نگہت غفار، مسز نوید ہاشمی اور بہت سے لوگ غیر حاضر ہیں۔ کہاں چلے گئے ہیں۔ کاشی بھیا اِس بار آپ کی نظم کہاں چلی گئی۔ کہانیوں میں لائف بوائے کمال کی لکھی گئی۔ جدا نہ ہوں گے، گرہن لگا جیون، عشق زادے، شہید، آخری چوری، بڑا آدمی، وہ بلی کا بچہ، اجنبی مسیحا۔ اچھی رہیں۔ دیکھ میرا نصیب، پلیٹ فارم خوبصورت تحریر تھی۔ یاد رکھے گی دنیا ترقی یافتہ معاشرے کی عکاس تحریر لگی۔ ہوس کے پجاری اندھے ہوجاتے ہیں اور اپنوں کے گلے کاٹتے پھرتے ہیں۔ عاشر جیسے کتنے معصوم ان درندوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ، محمود شام کا دوسرا سفر نامہ، اپنی گرفت طاری کر گیا۔ آخری دعا، فصیحہ آصف خان نے خوب دعا دی۔ ہم شکل۔ منزل کی طرف دوڑتی جا رہی ہے۔ زہر عشق۔ عجیب الجھن میں مبتلا میں کیسے ہوئے ہے۔ بھلا جنات انسانوں کے چنگل میں کیوں آن پھنسا۔ اب تو اُس کو نانی یاد آئے گی۔ حضرت انسان اپنے پیدا کرنے والے کو نہیں چھوڑتے تو جنات کی دُنیا سے آئے عاشق کی کیا مجال ہے۔ عاشق جن کو موت انسانوں میں لے آئی ہے۔ باقی کی تحریریں بھی زبردست تھیں۔ سچی کہانیاں اپنے لکھاریوں کو ایوارڈ سے نواز رہا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ میری طرف سے تمام انعام پانے والے لکھاریوں کو بہت بہت مبارک باد اور پھولوں کے گلدستے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش، سچی کہانیاں کی جان ہے اور اُس کی رونق بڑھاتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے۔ بابا جی، انسانیت کی خدمت کر کے آخرت کا سامان کر رہے ہیں۔ سلامت رہیں۔ اب بار سال نو کا سچی کہانیاں دل جیت گیا۔

☆: پیاری سونیا! تمہاری محبت کا بھی جواب نہیں۔ جب تم سب خوش ہوتے ہو تو ہم قدرتی طور پر مسرور ہوجاتے ہیں۔

✉: ہماری بہت پیاری بھابی' صائمہ مجید' ملتان شریف سے لکھتی ہیں۔ سال نو کا سچی کہانیاں جلدی مل گیا۔ ماشاء اللہ! ٹائٹل شاندار تھا۔ اداریہ میں باجی منزہ سہام عہد کروا رہی تھیں۔ ہم تن من دھن سے پاکستان کی حفاظت کریں گے اور ہر طوفان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوں گے۔ دوشیزہ لکھاریوں کو ظہرانہ دینا خوشی کی بات ہے۔ تصویریں جھلکیاں خوشگوار اثرات چھوڑ گئیں۔ احوال میں کاشی بھیا، آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں۔ سنبل باجی کو صدارت مبارک ہو۔ ثنا ابڑو، مور شاہد حسین، (کہانی جلدی لکھوں گی) اشفاق بٹ، سلیمان شبیر، سید ملازم حسین، نزاہت افشاں، پیاری باجی سدرہ انور علی، شمسہ قمر، محمد قاسم بلوچ، انکل ممتاز احمد (پاپولر ایوارڈ ملنے پر مبارک باد پیش کرتی ہوں اور ہاں برفی بھجوا دینا) ارم خان، فرزانہ نگہت، نفیسہ فضل، روبینہ ناز، امتیاز عاصم، (خوش آمدید) نعیم اللہ، اُم عادل، صائمہ بشیر، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، نٹ کھٹ کنزہ ملک، راشد لطیف بھائی، سونیا خان، علی حسنین تابش کے ساتھ ساتھ سبھی احوال جاندار تھے۔ نئے احوالیوں کو خوش آمدید، پرانے پُر اسرار طور پر غائب ہیں، کیا کوئی ڈھونڈ لائے گا یا......؟ کمرشل کہانی لائف بوائے کمال کی تھی، اور میرے سر کے تاج اِس فرم میں جاب کرتے رہے ہیں۔ جدا نہ ہوں گے، ہم گرہن لگا جیون، عشق زادے، واقعی انعام کی مستحق تھیں۔ دیکھ میرا نصیب' معاشرے کی عکاس تحریر تھی۔ آخری چوری، پاکستان میں ان کو بہت کچھ مل رہا تھا تو چوروں نے سعودی عرب جا کر'' آ بیل مجھے مار'' والا کام کیوں کیا۔ شہید، اچھی تحریر تھی۔ یاد رکھے گی دُنیا، یہ واقعہ سر تاج نے چند ماہ پہلے مجھے سُنایا بھی تھا۔ انوکھا نشہ، کیا واقعی ایسی نفسیاتی بیماریاں

پائی جاتی ہیں۔علاج، روگ، مجھے موت چاہے، وہ بلی کا بچہ، اپنی اپنی بات، وٹا سٹا، اجنبی مسیحا، فراڈ کمپنی، مہمیز، پشیمان، وفا کیسی، سپر تحریریں تھیں۔ہم شکل، زبردست جا رہی ہے۔زہر عشق۔لحہ لحہ ڈراتی تحریر نے اپنے جادو سے قید کرلیا ہے۔آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا (کاشی بھیاہ! آپس کی بات مجھے تو کان میں بتا دیں۔انتظار۔نہ کروائیں ناں) ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، اچھے رہے، میرے اشعار کہیں گم ہو گئے۔آخر میں تمام ایوارڈ پانے والے لکھاریوں کو بہت بہت مبارک باد اور تصویر کہانی نے رلا ہی دیا۔انسان سے حیوان جیت گیا۔ابھی تک اُس منظر سے نکل نہیں سکی۔اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو امن اور محبتوں سے ساتھ جینے کی توفیق دے آمین۔اب اجازت۔

☆: پیاری بھابی! تبصرے کی باقاعدگی آپ کی سچی کہانیاں سے محبت کا ثبوت ہے۔بس خدا آپ کے من کی مرادیں جلد بر لائے۔

✉: ہمارے پیارے ساتھی 'مجید احمد جائی' ملتان شریف سے عرض کرتے ہیں۔مزاج گرامی! سال نو سچی کہانیاں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ یکم جنوری کو مل گیا۔۔سرورق پر بیٹھی دوشیزہ مسکراتی ہوئی بھلی لگ رہی تھی۔منزہ سہام کا اداریہ ہمیشہ کی طرح سوچنے پر مجبور کر گیا۔کاش کے افواج پاکستان کی طرح عوام بھی دہشت گردوں کو نیست و نابود کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔''ہم اور ہمارے مہمان'' خوب رہے۔چہروں سے شناسائی ہوگئی۔احوال میں کاشی بھائی حق اور سچ کی بات کر رہے تھے۔آج کے اِس ترقی یافتہ دور میں کوئی حق سننے اور سچ کہنے کا روادار نہیں ہے۔جھوٹ کو کامیابی کی کنجی سمجھا جا رہا ہے۔کیا خوب بات کہی گئی کہ دل کا موسم بڑا سچا ہوتا ہے۔ویلڈن کاشی بھائی۔سنبل باجی، قرض کے بارے میں آپ نے تفصیلات میں نہ جانے کا کہا تو تفصیل میں جانے سے بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔مور شاہد حسین بھائی، آپ کی پُر خلوص دعاؤں کے ساتھ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت مطلوب چاہتا ہوں۔سلامت رہیں۔نزابت افشاں، ارم خان، نعیم اللہ، ڈاکٹر خادم حسین، عنزہ ملک، سونیا خان، اور علی حسنین تابش، میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند سے نوازا، ممنون و مشکور ہوں۔راشد لطیف، آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔میرے ایکسڈنٹ کا سُن کر دوڑے چلے آئے۔شکریہ۔۔محترم ممتاز احمد صاحب آپ کی رائے ہمارے لئے شکر کے برابر ہے۔پیاری سسٹر سدرہ انور علی، آپ کا مسٹر پرفیکٹ بھائی الحمدللہ پرفیکٹ جا رہا ہے۔نئے دوستوں کو جی آیاں نوں۔پرانے بھی واپس آجائیں، ہم کچھ نہیں کہیں گے۔اِس بار احوال کم ضرور تھے لیکن جامع اور جاندار تھے۔۔کاشی بھائی اِس بار اپنی نظم سے کیوں محروم رکھا۔کہانیوں میں ''دیکھ میرا نصیب'' کمال کی تحریر تھی۔ممتاز احمد دِل جمعی سے لکھتے ہیں۔پاپولر ایوارڈ ملنے پر بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔آخری چوری، شہید، اجنبی مسیحا، آخری دعا، بڑا آدمی، انوکھا نشہ، علاج، جدا نہ ہوں گے، گرہن لگا جیون، عشق زادے، وفا کیسی، پشیمان، اپنی اپنی بات، وہ بلی کا بچہ، جہیز، وٹا سٹا، روگ، جاندار تحریریں تھیں۔ملک الطاف سرور کے بارے محمد اقبال زمان نے خوب لکھا۔سفرنامہ، بھارت میں بلیک لسٹ، پہلا حصہ خوب رہا۔ہم شکل منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔زہر عشق میٹھے میٹھے زہر سے مدہوش کر رہی ہے۔ہائیڈ پارک، تیرنیم کش، شاندار رہے۔ایوارڈ پانے والے تمام لکھاریوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد قبول ہوں۔سال نو کا سچی کہانیاں زبردست رہا۔

☆: بہت پیارے مجید! تم سب کے دم سے ہی ہم اور ہمارا احوال ہے۔بس باقاعدہ رہو۔یاد رکھو!

بادب بانصیب ہوتا ہے۔

✉: راشد لطیف صبرے والا ملتان سے رقم طراز ہیں سال نو کا سچی کہانیاں جاتے سال کے آخری دنوں میں ملا۔ سرورق دل کو بھا گیا۔ اداریہ میں منزہ سہام، عہد وفا کی باتیں کر رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھائی، خوبصورت باتیں کر رہے ہیں۔ ممتاز احمد، مجید احمد جائی، مور شاہد حسین، کنزہ ملک، سونیا خان، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑ، انزابت افشال، ارم خان، سدرہ انور علی، سید ملازم حسین، علی حسنین تابش، صائمہ مجید اور صائمہ بشیر کے احوال زبر دست تھے۔ کہانیوں میں دیکھ میرا نصیب، خوبصورت تحریر تھی۔ بڑا آدمی، آخری چوری، شہید، فراڈ کمپنی، اپنی اپنی بات، علاج، انوکھا نشہ، پشیمان، کراس ٹاکنگ، عشق زادے، زبردست کہانیاں تھیں۔ یاد رکھے گی دُنیا، مجید احمد جائی نے کمال لکھا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا اِس طرح کے واقعات میں اضافہ کا سبب ہے۔ دوسرا موبائل فون نے جلتی پہ تیل والا کام کیا ہے۔ زہر عشق پُراسراریت کی تمام حدیں عبور کر رہی ہے اور ہم شکل بھی اچھی جا رہی ہے۔ سفرنامہ بھارت میں بلیک لسٹ اچھا رہا۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش زبردست چل رہے ہیں۔ ''پچھتاوا'' کہانی ای میل کروا رہا ہوں، امید ہے ہمیشہ کی طرح حوصلہ افزائی ہوگی۔ میں تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجید احمد جائی اور ممتاز احمد، شعبان کھوسہ، ایوارڈ بہت بہت مبارک ہو، ہماری دعائیں ہر پل آپ کے ساتھ ہیں۔

☆: اچھے راشد! پچھتاوا انتہائی کمزور تحریر ہے۔ بالکل پسند نہیں آئی۔ محنت کرو، جلد بہترین تحریر کے ساتھ آؤ۔ تبصرے کے لیے ممنون ہوں۔

✉: کنزہ ملک، قاسم پور کالونی ملتان، سے لکھتی ہیں۔ سال نو کا پرچہ خوب صورتی کے تمام ریکارڈ توڑ رہا ہے۔ منزہ سہام باجی۔ تجدید عہد وفا لے کر آئیں، واقعی ہمیں یک جان ہو کر دُشمنوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ 16 دسمبر کے دن نے ہماری روح تک کو گھائل کر دیا ہے۔ اب بھی ہم خاموش رہے تو خاموشی سے مٹی تلے دب جائیں گے۔ ہم اور ہمارے مہمان۔ ٹیبل پہ سجے کھانے دیکھ کر منہ میں پانی آ گیا۔ کاش! ہم بھی وہاں ہوتے۔ احوال میں کاشی بھیا سچ بات کر رہے ہیں۔ سنبل باجی صدارت کی کرسی مل گئی ہے تو انصاف بھی کیجئے گا۔ انکل ممتاز احمد، مجید احمد جائی، صائمہ بشیر، صائمہ مجید، مور شاہد حسین، علی حسنین تابش، سدرہ انور علی، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، سونیا خان، راشد لطیف، بہترین احوال کے ساتھ شریک تھے۔ ماموں مجید احمد جائی۔ اب آپ کیسے ہیں؟ مجھے تو ایکسیڈنٹ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کچھ لوگ غائب ہیں اور کچھ نئے آئے ہیں۔ پرانے کی کمی محسوس کر رہے ہیں اور نئے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کہانیوں میں جدا نہ ہوں گے ہم، مجھے موت چاہیے، آخری چوری، شہید، ٹھکانہ، بڑا آدمی، روگ، علاج، انوکھا نشہ، گرہن لگا جیون۔ کمال کی تھیں۔ دیکھ میرا نصیب۔ ممتاز احمد دی گریٹ۔ بہت خوبصورت الفاظ کے ساتھ موجودہ معاشرے میں تیزی سے پھیلتی بُرائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ''یاد رکھے گی دُنیا'' جدید معاشرے میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عشق نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ بھارت میں بلیک لسٹ۔ محمود شام کے قلم سے لکھا خوبصورت سفرنامہ پہلے حصے میں ہی اپنی گرفت میں لے لیا۔ جاوید راہی کی تحریر نہیں تھی۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش۔ رسالہ کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تمام ایوارڈ پانے والے لکھاریوں کو پھولوں کے ہار۔ بہت بہت مبارک۔ مٹھائی تو کھلاؤ۔ خالمو۔ امی کی ڈانٹ کھا کھا کر موٹاپا ہوا جا رہا ہے۔ آخر ہم بھی آپ کی تحریریں شوق سے پڑھتے

ہیں۔مٹھائی کا تو حق بنتا ہے۔

☆: اچھی گڑیا! مٹھائی ہمارے لکھاری بہترین کہانیوں کی صورت میں ہر ماہ تم تک پہنچاتے ہیں۔ تبصرہ ہے تمہارا گریٹ۔

✉: ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، رجب والا' ملتان سے احوالی بن رہے ہیں۔عرض کرتے ہیں گزشتہ سال بہت سے زخم دے کر رخصت ہو گیا۔اللہ کرے سال نو زندگیوں میں رنگ بھر دے اور زردی مائل چہروں میں سُرخی بھر دے۔آمین! سال نو کا سچی کہانیاں یہی درس دے رہا ہے۔اداریہ عہدِ وفا کروا گیا اور کاشی بھائی سچ کا درس دے رہے تھے۔احوال میں سبھی احوال اچھے تھے۔خاص طور پر ممتاز احمد، راشد لطیف صبرے والا، علی حسین تابش، پیارے مجید احمد جائی، بھابی صائمہ مجید، سونیا خان، کنزہ ملک، مور شاہد حسین، ارم خان، صائمہ بشیر، روبینہ ناز، نزاہت افشاں، بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔شعبان کھوسہ، رانا شاہد حسین، منشی محمد عزیز مئے، شاہد رفیق سہو، ندیم عباس میواتی اور بہت سے احوالی غیر حاضر تھے۔غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔کاشی بھائی، اِس بار آپ کی نظم پڑھنے کو نہیں ملی، دل اُداس سا ہے۔اگلے بار نظم ضروری ہے۔(جو حکم!) کہانیوں میں سب سے پہلے زہر عشق پڑھی۔یقیناً رات کے پچھلے پہر میں لکھتے ہوں گے تبھی تو اتنی پُر اسراریت ہے۔اس طرح کی کہانیاں میری کمزوری رہی ہیں۔بہت خوب۔ہم شکل بس ٹھیک جا رہی ہے۔یاد رکھے گی دُنیا، میرے محسن نے کمال تحریر لکھی۔آزاد خیال معاشرے کی عکاس تحریر تھی، ہمارے گردونواح میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔دیکھ میرا نصیب، ممتاز احمد نے بھی اچھوتی تحریر لکھ کر دل جیت لیا ہے۔ایسے واقعات ناخواندگی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔اور گلی گلی میں منی سنیما بھی ایسے گناہ کی درس گاہ بنے ہوئے ہیں۔اِس کے علاوہ علاج، انوکھا نشہ، مجھے موت چاہیے، عشق زادے، آخری چوری پڑھ سکا ہوں۔باقی کہانیاں بھی یقیناً بیسٹ ہوں گی۔سچی کہانیاں کے ایوارڈ یافتہ لکھاریوں کو بہت بہت مبارک باد پیش کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ اُن کے قلم میں مزید طاقت عطا فرمائے آمین۔

☆: ڈاکٹر صاحب! آپ بھی تو سب کے محسن ہیں۔آپ کی محبت کے تو ہم اسیر ہو چکے۔بس نئے سال کی ہماری بھی یہی دعا ہے کہ ہمارا آپ کا یہ ساتھ ہمیشہ قائم دائم رہے۔

لیجیے ساتھیو! ہماری آپ کی اس ماہ تک کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔انشاء اللہ اگلے ماہ انہی صفحات پر آپ سے ملاقات ہوگی۔تب تک کے لیے اجازت۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

دیر سے موصول ہونے والے خطوط

ملک محمد اکرم آحیر' میانوالی' محمد ابو ہریرہ بلوچ' بہاول نگر' محمد ندیم عباس میواتی' چتوکی' عثمان بلوچ' بہاول پور' محمد انیس الرحمٰن' بورے والا' عظیم الدین' ایبٹ آباد' مسز نگہت غفار' کراچی' روبینہ ناز روبی' فیصل آباد' عمارہ ناز' کمالیہ' رانا حبیب الرحمٰن' لاہور سینٹرل جیل' منعم اصغر' ڈیرہ غازی خان' فیصل ندیم بھٹی' چک نمبر 58 شمالی سرگودھا' نسیم سکینہ صدف' ڈسکہ سیالکوٹ' ثمینہ طاہر بٹ' لاہور' کے خطوط دیر سے موصول ہوئے اس وجہ سے شاملِ احوال نہ ہو سکے۔

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!



آیئے! دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے...... اپنے قلم سے......!

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کو یاد رہتے ہیں۔

شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے

میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے

ماہنامہ دوشیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

ہو سکتا ہے عنقریب منعقد ہونے والی

تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

لائف بوائے...... رشتے مضبوط بنائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''مضبوط بال...... مضبوط رشتے...... بیسٹ ایور لائف، لائف بوائے شیمپو کے ساتھ۔''

ماڈل ماں بیٹی کے روپ میں بال لہرا رہی تھیں۔ مجھے یکدم سے کچھ یاد آیا۔ آنکھیں نم ہوئیں اور عکس دھندلے ہوتے ہوتے مجھے پیچھے لے گئے۔ بہت پیچھے......

صدائیں بازگشت بن کر میرے اطراف گونجنے لگیں۔

''شہزین! بچی کیا حلیہ بنایا ہوا ہے۔ پلیز چینج کرو حلیہ بچے!''

''بی بی جان! پلیز!''

''نو...... ہری اپ...... یہ لو نیو لائف بوائے شیمپو اور مجھے فوراً باتھ کے بعد گڈ بے بی بن کر دکھاؤ۔''

''بی بی جان!'' وہ منہ بسور کر بولی۔

کچھ ہی دیر میں وہ بال لہراتی لان میں بی بی جان کے پاس موجود تھی۔ بی بی جان نے لان میں ہی ناشتا لگوا لیا تھا۔

''بے بی...... مائی کیوٹی...... سو لو یو۔'' وہ اُسے چومتے ہوئے بولیں۔ ''ہمیشہ اسی طرح خوش باش رہو۔''

''بی بی جان! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کل کالج ٹرپ پر مری جانا ہے۔ پلیز پرمیشن لیٹر پر دستخط کر دیجیے۔''

''سوئٹی کیا ضرورت ہے اس طرح جانے کی...... ابھی میں تم کو اکیلے بھیجنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

''اوہ گاڈ! بی بی جان! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ......؟''

''اوہ مائی سوئٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ ہمیں ہی سمجھانے لگی۔ OK گاڈ بلیس یو۔'' یہ کہتے ہوئے بی بی جان نے پرمیشن لیٹر پر دستخط کر دیے۔

رابعہ شہزین کے پیدا ہوتے ہی اُسے بی بی جان کی گود میں دے کر ملکِ عدم سدھار گئی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی رابعہ کی یاد میں دیارِ غیر بس گئے اور پھر کبھی پلٹ کر وطن واپس نہ آئے۔ ملک مصطفیٰ علی نے جیسے اپنی ہر ذمہ داری بی بی جان کے سپرد کر دی تھی۔

محبت کا ایسا انجام دیکھ کر بی بی جان نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ اب وہ لفظ محبت سے بھی نفرت کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

بی بی جان نے شہزین کی پرورش ماں بن کر کی تھی۔ پیدائشی طور پر شہزین کے بال بہت روکھے پھیکے اور بے جان تھے۔ ہر طرح کے علاج کے باوجود بال نہایت بے رونق ہی رہے تھے۔ شہزین 6th اسٹینڈرڈ میں تھی جب امپورٹڈ شیمپو کے بجائے بی بی جان نے لائف بوائے شیمپو کا استعمال آخری حل کے طور پر کیا تھا۔ اور پھر...... جادو ہو گیا۔

لائف بوائے شیمپو کے مستقل استعمال نے شہزین کے بال دنوں میں بہترین کر دیے تھے۔ اب اُس کے مضبوط بال ہی اُس کی خوبصورتی کو دوچند کرتے تھے۔

شہزرین خود یہی کہتی تھی۔

’’لائف بوائے شیمپو کام دکھائے اور بیوٹی گرلز کو بیوٹی کوئین بنائے۔‘‘

☆......☆......☆

مری کے ٹرپ سے واپسی پر شہزرین اپنا دل وہیں بھول آئی تھی۔ ’’شہریار‘‘ سے اُس کی ملاقات مال روڈ پر ہوئی تھی اور کب وہ اُس کی دھڑکنوں کا امین بن گیا پتا ہی نہ چلا تھا۔

بی بی جان نے اُس کی بے کلی محسوس کی تھی۔ جب اُس سے باز پرس کی تو وہ اپنا دل کھول کر اُن کے آگے رکھ گئی۔

☆......☆......☆

’’نہیں سوئٹی! کبھی نہیں ...... میں نے تمہاری ماں کے ایک غلط فیصلے پر سر جھکایا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی سے رابعہ کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ مگر آپ نہیں...... I Hate Love......‘‘

’’اوکے آئندہ شہریار کا نام تمہاری زبان پہ نہ آئے۔‘‘ بی بی جان رابعہ کے بعد بہت محتاط ہوگئی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی نے بیٹی کو قبول نہ کر کے دولت کے ترازو میں محبت کو تول دیا تھا۔ یہ بات بی بی جان کے لیے قطعاً قابلِ قبول نہ تھی۔ سو وہ محبت کی دشمن بن گئی تھیں۔

☆......☆......☆

شہریار نے جب شہزرین سے بی بی جان کا فیصلہ سنا تو وہ ڈٹ گیا۔ اُس نے ہر رکاوٹ دور کر کے شہزرین سے کورٹ میرج کر لی۔

شہزرین نے جیسے دنیا پالی تھی۔ وہ محبت میں بی بی جان کو بھی بھلا گئی تھی۔

عارفین کی صورت دوسری شہزرین سامنے تھی۔ عارفین کے ساتھ بھی بالوں کے مسائل نے جنم لیا تو شہزرین کے سامنے لائف بوائے شیمپو کی مثال تھی۔ سو اُس نے بچپن ہی سے عارفین کو لائف بوائے شیمپو استعمال کرایا تھا۔ آج عارفین کے معمولات میں لائف بوائے سے سر دھونا لازم وملزوم تھا۔

☆......☆......☆

شہریار آفس سے آرہے تھے‘ آگے‘ بہت آگے انہیں ایک سائیکل چلاتی لڑکی نظر آرہی تھی‘ تب ہی ایک بائیک اُس کے پاس آکر رکی۔ وہ لڑکی سائیکل روک کر اس سے بات کرنے لگی۔

انہوں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ بات مکمل کر کے وہ دونوں اپنی اپنی راہ پر ہولیے۔

سائیکل خاصی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی‘ انہوں نے بھی اپنی گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھالی۔

کھڑکی پر رکھے بازو کی دو انگلیاں پیشانی مسل رہی تھیں۔ انہوں نے ’شہریار لاج‘ کے آگے گاڑی روک کر اندر نظر ڈالی۔ سائیکل ناریل کے درخت کے پاس کھڑی تھی جسے چوکیدار گیرج میں لے جا رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی اندر بڑھالی اور لاک کر کے گھر کے اندر آگئے۔

’’شریفاں بوا‘ بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟‘‘ لمحہ بھر کو رک کر انہوں نے ملازمہ سے پوچھا۔

’’وہ جی‘ ابا جان کے ساتھ گئی ہیں۔ چھوٹے بابا کوچنگ اور عارفین بی بی ابھی آئی ہیں‘ اپنی سہیلی کے گھر سے اور مانی صاحب یونیورسٹی سے نہیں آئے۔‘‘

’’ہوں......‘‘ وہ اتنا کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

آج کل وہ اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی عارفین کو اٹھتے بیٹھتے‘ چلتے پھرتے‘ غرض اس کا ہر عمل نوٹ کر رہے تھے۔ وہ انہیں شہزرین کا پرتو لگتی‘ شوخ و چنچل‘ مست‘ کچھ ضدی سی۔ عارفین میں ان کی جان تھی مگر اس کی ضدی طبیعت ان کی ایک ایک ہارٹ بیٹ مس کر دیتی تھی۔ بے اختیار ہی وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مسلنے لگتے تھے۔

شہزرین بھی ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ بہت گہرائی میں جا کر نہیں سوچتی تھی یعنی جو کل ہونے والا تھا‘ اس کی آج فکر نہیں کرتی تھی‘ اسے اپنا حال بہت عزیز تھا۔

اور انہیں مستقبل کی فکر تھی کہ کہیں......

عارفین کی چنچل ہنسی‘ شوخ و شنگ لہجہ‘ شرارتی انداز‘ آج کل کا ماحول میڈیا کی بڑھتی ہوئی آزادی...... اور اندر ہی اندر ایک انجانا سا خوف کہ کہیں ماضی ایک بار پھر خود کو ان کے سامنے نہ دہرائے۔

☆......☆......☆

شہزرین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

’’تو اس میں حیرت زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟‘‘ انہوں نے گرم شال اوڑھے شہزرین کو دیکھا۔

بلیک گرم سوٹ میں ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ شہریار کے دل میں آج بھی اکثر انہیں دیکھ کر پہلے دن والی لہر اٹھتی تھی۔ بلیک اور ریڈ رنگ ان پر بہت کھلتا اور سجتا تھا۔

’’شیری‘ عارفین ابھی اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی؟‘‘

’’تو کیا ہوا‘ ابھی تو رشتہ دیکھیں گے‘ جانچ پڑتال ہوگی‘ جب تک عارفین بھی بیس سال کی ہو ہی جائے گی۔‘‘ انہوں نے اخبار سامنے پھیلا لیا۔

’’شادی کے لیے وہ بہت چھوٹی ہے؟‘‘ وہ اپنی حیرت پر قابو نہیں پا رہی تھیں کہ شہریار کیوں عارفین کی شادی کی فکر کر رہے تھے‘ کیوں؟

’’تو کیا ہوا؟‘‘ انہوں نے دھیرے سے اپنا چشمہ اتار لیا۔ آنکھوں پر لگا چشمہ ان کی وجاہت کو بڑھا دیتا تھا‘ کنپٹیوں کے سفید بال ان کی شخصیت کو مزید گریس فل بناتے تھے۔

’’آپ بھی تو سترہ سال کی تھیں شادی کے وقت؟‘‘ دھیمے سے انداز میں مسکرائے۔ لمحہ بھر کو وہ بھی مسکائیں۔

’’شیری......‘‘ اس نے سر اٹھایا۔ ’’وہ زمانہ اور تھا‘ آج سے بائیس سال پہلے لڑکیوں کی شادیاں جلد ہو جایا کرتی تھیں اور پھر مدمقابل آپ تھے‘ ایک مکمل گھرانہ تھا‘ اچھے لوگ تھے۔‘‘

’’تو آج کل تو حالات اور بھی خراب ہیں؟‘‘ بغور دیکھ کر انہیں کچھ بتانا چاہا۔

’’بس مجھے نہیں پتا۔‘‘ وہ ٹھنکی۔ ’’ابھی نہیں‘ ابھی تو آپ نے بچوں کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھے ہیں‘ عارفین کو ڈاکٹر بنانا ہے‘ آپ تو پڑھانا چاہتے ہیں اسے؟‘‘

’’شہزرین......‘‘ انہوں نے دھیرے سے سانس لیا۔ ’’میں مرا ہوں اور نہ میرے خواب......‘‘

’’اللہ نہ کرے۔‘‘

’’عارفین کا رجحان بھی ہے۔ وہ شادی کے بعد بھی میری بیٹی رہے گی اور ڈاکٹر بن گئی تو قابلِ فخر بات ہوگی۔‘‘

’’مگر شیری‘ شادی ایک ذمے داری ہے اور عارفین......‘‘

’’تو کیا ہوا؟ ہمیں عارفین کی صلاحیتوں پر فخر ہے۔‘‘ شہزرین نے سر ہاتھوں میں تھام لیا اور انہوں نے ایک نگاہ ان پر ڈال کر دوبارہ سے اخبار پھیلا لیا۔

☆......☆......☆

’’ارے‘ تو اس میں فکر کی کیا بات ہے؟‘‘

’’آپا! عارفین بہت چھوٹی ہے‘ بالکل بچی سی‘ لاڈلی ہے‘ اتنی بڑی ذمے داری سنبھال سکتی ہے بھلا؟ اُسے تو بس اپنے بال سنبھالنا بھی نہیں آتے۔ وہ تو بھلا ہو لائف بوائے شیمپو کا کہ اُس کے بالوں کی نگہداشت مجھ سے زیادہ اسی شیمپو کی مرہونِ منت ہے۔‘‘

آپا کے اطمینان کو انہوں نے حیرت سے دیکھا۔

’’شہزرین‘ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم سے زیادہ اُس کے بال لائف بوائے شیمپو نے سنبھالے ہیں۔ مگر بی بی اولاد اور بال ایک ہی چیز ہیں۔ پنجاب میں بال، بچے ہی کو کہتے ہیں۔ تم بجائے اس کے کہ شہریار سے بحث کرتیں کہ عارفین کی شادی کیوں کر رہے ہیں‘ یہ پوچھتیں کہ کس سے کر رہے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی بہت اچھا رشتہ ہو شہریار کی نظر میں؟‘‘

شہزرین نے انہیں دیکھا۔ ’’ان کی پسند پر مجھے اعتراض نہیں ہے‘ وہ اپنی حیثیت‘ اپنے مرتبے سے کم پر کمپرومائز نہیں کریں گے۔ مجھے اعتراض بس عارفین کی کم عمری پر ہے‘ اکلوتی بیٹی ہے۔ آپ ان سے بات کریں‘ ابھی نہیں‘ کم سے کم دو تین سال تک تو بالکل نہیں‘ اس کی تعلیم مکمل ہونے تک تو بالکل نہیں۔‘‘ انہوں نے حتمی سے انداز میں کہا۔

’’اچھا‘ میں بات کرتی ہوں مگر تم تو جانتی ہو کہ اپنے معاملات میں وہ کم ہی بولنے دیتا ہے۔‘‘

’’بس مجھے نہیں معلوم۔‘‘ وہ اندر تک ناراض تھیں۔

اس مان‘ اس اعتبار پر آپا فخر سے مسکرادیں۔

☆......☆......☆

فراز اور عارفین لان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے‘ ٹراؤزر‘ ٹی شرٹ اور گلے میں بے نیازی سے ڈلا پنک اسکارف‘ اونچی سی پونی اور پونی ٹیل سے نکلتے بال مسلسل متحرک رہنے سے عارفین کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ فراز کو ہرانے کی خوشی الگ اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی ہنسی بند نہیں ہو رہی تھی۔ کنارے پر بیٹھے تانیہ‘ جنید‘ رفیق‘ شانزہ‘ واثق تالیاں بجا رہے تھے۔ فراز اسے مسلسل چڑا رہا تھا۔

اسٹڈی روم سے دیکھتے شہریار کے وجود میں کرنٹ سا دوڑ گیا‘ بھولی بسری یادوں نے دل کو چھو لیا۔ ہنسی کی

آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔
کھیل ختم ہو گیا تھا۔ عارفین میچ جیت چکی تھی۔
''چلو' میں ہارا' مانگو جو مانگنا ہے۔'' فراز ٹاول سے پسینہ خشک کر رہا تھا۔
'تم...... تم...... تم......' کانوں میں ایک بازگشت سی اترنے لگی۔ شہریار کا دل سکڑنے لگا۔ ایک بار پھر ہارٹ بیٹ مس ہوئیں۔ 'کہیں...... کہیں...... ماضی خود کو تو نہیں دہرا رہا؟ ماضی ضرور خود کو دہراتا ہے۔' سوچتے سوچتے انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔
عارفین ہنس رہی تھی' اس نے ہاتھ اٹھایا ہوا تھا۔ فراز 'باادب' باملاحظہ' کی پوزیشن میں تھا۔
شہریار کے دل میں پتنگے سے لگ گئے۔ بے اختیار وہ اگلے دریچے کے قریب رکے۔ عارفین کی آواز اور شرارتی ہنسی صاف سنائی دے رہی تھی۔
''جاؤ' معاف کیا' ہم دینے والوں میں سے ہیں' لینے والوں میں سے نہیں۔'' اس کا انداز شاہانہ تھا۔ سب ہنسنے لگے۔ فراز نے گھٹنے ٹیک دیے۔
''شکریہ' نوازش' ملکۂ عالیہ' ورنہ میں کس قابل تھا' میری جیب میں تو صرف آپ کو دینے کے لیے صرف یہ ہے۔'' سب ایک بار پھر ہنس دیے۔ جب فراز نے لائف بوائے شیمپو کا ساشے نکال کر اُسے پیش کیا۔ واثق اسے مکے مارنے لگا۔
''ابے بزنس مین کی اولاد...... اور اتنا بڑا کنجوس' سالا' بنیا بنے گا۔'' فراز ہنستے ہوئے سیدھا ہوا۔
''بنیا بنوں گا تو بزنس مین کہلاؤں گا نا۔'' ایک بار پھر ہنسی مذاق شروع ہو گیا۔
''سوری ٹو سے...... یہ بات میں نہیں مانتی لائف بوائے شیمپو سستا ضرور ہے مگر اس کا معیار دنیا کے بہترین شیمپوز کی برانڈ میں ہوتا ہے۔ میرے سلکی اور مضبوط بال اس بات کے گواہ ہیں۔'' عارفین نے پونی کھول کر بال لہرائے تو سب نے اس کے چمکتے بالوں کو دیکھ کر ''واؤ'' کہا تھا۔
شہریار کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ دھیرے سے باہر آئے شہزرین کی تلاش میں۔ وہ کچن میں مل گئیں۔ ان کے چہرے پر سکون اور مسکراہٹ تھی۔
''شیری' آج آپ گھر پر ہیں نا؟ میں آپ کے لیے چکن جاؤمن اور رشین سلاد بنا رہی ہوں۔'' شہزرین نے اُسے محبت آمیز انداز میں دیکھا۔
آپا پر سب کچھ چھوڑ کر وہ مطمئن تھیں اس لیے ناراضگی بھی دور ہو گئی تھی۔
''شہزرین' یہ لوگ ایسے ہی کھیلتے رہتے ہیں۔'' کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھتے اور سگار سلگاتے ہوئے وہ سنجیدہ تھے۔
''تو کیا ہوا شیری؟'' انہوں نے بھی کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ''آپس میں کزنز ہیں' گھر پاس پاس ہیں' یونیورسٹی کالج کی چھٹیاں ہیں۔'' ان کا سہل سا انداز تھا۔
''عارفین نے ایف ایس سی مکمل کر لیا ہے نا؟''
''جی' اور وہ آپ کی خواہش پر پری میڈیکل میں جانا چاہتی ہے۔''
''شہزرین' میں نے رشتہ دیکھا ہے۔ لڑکا مجھے پسند ہے۔ انہیں ویک اینڈ پر میں نے کھانے پر بلایا ہے۔ اچھی طرح سے مل لینا اور......'' وہ جاتے جاتے رکے۔ ''اور عارفین کو بھی لڑکے کے متعلق بتا دینا۔''
اتنی بات کہہ کر وہ چلے گئے اور شہزرین ساکت کھڑی رہ گئیں یعنی آپا نے ان سے بات نہیں کی؟

☆......☆......☆

شہزرین رو رو کر ہلکان ہو گئیں مگر شہریار کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور نہ ان کا دل پسیجا۔
''شیری...... ہماری اکلوتی بیٹی ہے' بہت معصوم اور بھولی سی ہم نے اسے ابھی تک اس پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔ وہ کیسے اتنی بڑی ذمے داری نبھا سکے گی؟ مجھے کم عمری میں اس کی شادی نہیں کرنا۔'' ان کا روہانسا انداز تھا۔
''اپنی مثال مت بھولو' تم بھی تو......'' انہوں نے ان پر نگاہ ڈالی' رویا رویا چہرہ' متورم آنکھیں' بھرایا ہوا لہجہ۔
''شیری' میرے ساتھ...... آپ کا ساتھ تھا' آپ کی محبت تھی' مشکلیں کتنی تھیں۔ مجھے کوئی کام نہیں آتا تھا' آپ کی امی اور آپا اچھی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ سکھایا اور مسئلہ نہیں بنایا۔ ضروری نہیں ہے کہ عارفین کو بھی اتنا اچھا سسرال' اتنے اچھے لوگ ملیں؟ میں اسے سب کچھ سکھا کر سسرال بھیجنا چاہتی ہوں۔'' شہریار نگاہ چرا کر آتش دان کے شعلوں کو دیکھنے لگے۔
''شیری' ہر لڑکی نے پرائے گھر جانا ہوتا ہے' ہم عارفین کی بھی شادی کریں گے مگر اپنے وقت پر پلیز......''
ان کے سامنے کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''خدا کے واسطے۔'' اور پھر انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔
''شہزرین......'' انہوں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''تم ابھی ان لوگوں سے تو ملو' دیکھیں گے' کتنے مرحلے ہوتے ہیں' ابھی تھوڑی بیاہ رہے ہیں۔''
شہزرین نے ان ہاتھوں پر پیشانی ٹکا دی۔ ''آپ کو عارفین کی معصومیت پر پیار نہیں آتا؟ کتنا بچپنا ہے اس کے اندر؟ کم سے کم گریجویشن تو کرنے دیں؟''
وہ شہزرین کے آنسو خشک کرتے خاموش سے ہو گئے۔

☆......☆......☆

آپا آج کل اپنی بیٹی نوشین کے پاس اسلام آباد گئی ہوئی تھیں۔ شہریار کے بلائے ہوئے مہمان کھانے پر آئے تھے۔ شہزرین ان سے اچھی طرح سے ملیں مگر انہوں نے عارفین کو وجہ نہیں بتائی تھی۔ اپنے سب بچوں سے انہیں ملوایا تھا' وہ لوگ ظاہر میں انٹرسٹڈ نظر آرہے تھے۔
'اچھا ہے' ان کی توجہ عارفین پر نہیں گئی۔' شہزرین نے رسان سے سوچا۔ 'ظاہر کون سا ابھی شادی کر رہا ہے' اسے تو بزنس میں اپنے بابا سے آگے جانا ہے۔' شہزرین دل ہی دل میں سوچتی رہیں۔
انہیں آپا کا انتظار تھا' اس سے پہلے کہ شیری کوئی اور گیدرنگ رکھ لیتے' کسی اور مہمان کو بلا لیتے' اماں ہوتیں تو انہیں سمجھا بجھا لیتیں لیکن اب آپا ہی انہیں سمجھا سکتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا' گویا انہوں نے عارفین کی شادی کرنے کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔
کیا تھا اگر آپا' اس بار زرتاج کو ادھر ہی بلوا لیتیں؟ ہر بار فون کر کے وہ انہیں جلدی آنے کا کہہ رہی تھیں۔ انہیں شیری کے ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ شہریار کی گہری خاموشی میں کوئی نہ کوئی راز پنہاں ہوتا ہے اور پردہ اٹھنے سے انہیں ڈر لگ رہا تھا۔
ان سب سے بے نیاز عارفین سب کزنز کے ساتھ پھوپو کے گھر بیٹھ کر مووی دیکھ رہی ہوتی' چچا کے لان میں دھمال ڈل رہا ہوتا' تایا کے گھر میں ون ڈش پارٹی ہو رہی ہوتی یا تو اپنے گھر کے وسیع و عریض لان میں کرکٹ کا میچ ہو رہا ہوتا تو کبھی بیڈمنٹن کا کورٹ لگ رہا ہوتا۔
شوخ و شریر' چنچل عارفین ہر دل کی خوشی تھی' ہر پروگرام کا آغاز بھی اور ہر جھگڑے کی بنیاد تو کبھی کسی لڑائی کی امن کی فاختہ۔ گویا اس کے بغیر ہر پروگرام ادھورا' ویران اور پھیکا سا ہوتا۔
بابا جان سے لاڈ پیار تو...... دونوں بھائیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔
''جانے کب جائے گی اپنے گھر؟'' اس وقت بھی وہ سرور سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی' اسے فون سننے نہیں دے رہی تھی کہ سرور نے الجھ کر کہا۔
'باپ کے بعد بھائی بھی......' شہزرین سوچ کر خاموش سی ہو گئی۔
''بے فکر رہیں' ابھی نہیں جانا' بھابیاں لا کر جاؤں گی۔'' اس نے چڑایا۔
''اے' اے۔'' سرور نے بھی جواباً منہ چڑایا۔
''منہ دھو رکھو' بابا تو تمہارے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ بس آج کل میں نکالی جاؤ گی پرائے دیس۔''
شہزرین کو سانپ سونگھ گیا۔ عارفین' بھائی کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے منہ چڑاتی رہی کہ شہریار آگئے۔
''یہ کس کو دیس نکالا مل رہا ہے؟'' ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔
''آپ کی بیٹی کو۔'' سرور ہنسا۔ عارفین سیدھی ہو کر بیٹھی۔
''بتائیں بابا' میں کتنا سچا ہوں؟''
''سرور......'' عارفین گھورنے لگی۔
سرور مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا۔ شہریار ہنس دیے۔
''یہ تو حقیقت ہے کہ ہر لڑکی نے سسرال جانا ہوتا ہے۔''
''میرے بابا کوئی جاہل' گنوار' زمیندار یا وڈیرے نہیں ہیں جو بلا سوچے سمجھے میری مرضی کے بغیر مجھے بیاہ دیں۔'' عارفین نے لاڈ سے بابا کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ٹھنک کر محبت سے کہا۔
شہزرین کا انداز ساکت تھا' آنکھیں نم' نظریں باپ بیٹی کے محبت آمیز منظر پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت ننھی منی بچی لگ رہی تھی باپ کے سینے سے لگی' شانے پر سر رکھے۔
''رشتہ اچھا ہو تو تمہاری مرضی چہ معنی دارد؟'' سرور'

بازنہیں آرہا تھا چڑانے سے اور عارفین سیریس نہیں ہورہی تھی۔ باپ کے کندھے پر سر رکھے جوابی کارروائی کررہی تھی۔

☆......☆

"شہزین' عارفین کہاں ہے؟" گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔

"نصرت کی طرف گئی ہے۔" خفگی بھرے انداز میں انہوں نے کہا۔

"مگر وہاں تو کوئی نہیں ہے؟ ادھر سے ہی آرہا ہوں۔"

"اوہو تو پھر یہ لوگ دھمال ڈالنے بھائی صاحب کے گھر ہوں گے پھر فراز انہیں آئس کریم کھلانے گیا ہوگا۔" ان کی جانب دیکھے بنا انہوں نے کہہ دیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ شہریار کے قدم رک گئے۔

"تم کیسی ماں ہو کہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری اولاد کہاں ہے؟" شہزین نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور سناٹے میں رہ گئیں۔

"آج کل کے حالات کیسے ہیں؟"

"کیا ہوگیا ہے شیری؟ برابر میں پھوپو' چچا' تایا کے گھر ہیں' ان گھروں میں جانے پر پابندی لگا دوں؟"

"وہ بڑی ہوگئی ہے' اسے پابندی کی ضرورت ہے۔" ان کا لہجہ سخت تھا۔

"وہ سب آپ کے بھائیوں اور بہن کے بچے ہیں شیری؟"

"مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی اولاد کی طرف سے بےفکر ہوجائیں؟" شہریار نے غصے سے منہ پھیر لیا۔

"ہمیں اپنی اولاد پر بھروسہ ہے۔"

"عارفین بہت معصوم اور بھولی ہے۔"

"اتنی معصوم نہیں کہ اپنی حفاظت نہ کرسکے' سمجھدار ہے وہ۔" زچ ہونے کے انداز میں انہوں نے شہزین کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ شہزین انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

ان کا رخ باہر کی جانب تھا۔ جانے کیسی بےچینی دل کو لگ گئی تھی؟ مگر شہزین کا دل مطمئن تھا۔ اس وقت انہوں نے آپا کو فون ملایا۔

"خدا کے واسطے آپا' آجائیں۔ شیری اتنے حساس ہورہے ہیں کہ بس۔"

"اسے سمجھاؤ شہزین......!"

"نہیں آپا' انہیں آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔"

"اچھا' میں آرہی ہوں جلدی۔" انہوں نے انہیں اطمینان دلایا اور فون رکھ دیا۔

شہزین کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔ ایک خیال' ایک احساس ان کے دل کو چھو گیا۔ چھٹی حس انہیں کلک کرنے لگی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی' ایسے ہی تو شیری' عارفین کی شادی کے لیے بےچین نہیں تھے۔

عارفین کی شوخی' شرارت و ظرافت' فری انداز کو وہ کسی غلط انداز میں تو نہیں دیکھ رہے تھے؟' وہ بس سوچ کے رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

"شہریار' یہ کیا حماقت ہے' تم کوئی جاہل' ان پڑھ جاگیردار ہو جو کسی خوف سے اتنی کم عمر بیٹی کی شادی کا سوچ رہے ہو؟" آتش دان کے آگے بیٹھے شہریار ایک نگاہ آپا کو دیکھ کر رہ گئے۔

"تم عارفین کے لیے رشتے دیکھ رہے ہو' ہولا کر رکھ دیا ہے مجھے؟ خبردار جو تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی اور کوئی اولاد ہے تمہاری' وہ تو ابھی بچپنے سے نہیں نکلی اور تم......" اپنے پیروں پر کمبل ٹھیک کرتی آپا نے محبت و پیار سے بھائی کو دیکھا۔ بھتیجی کے لیے بےبہا محبتیں تھیں۔

شہریار خاموشی سے کتاب کے صفحے پلٹ رہے تھے۔

"اور ذرا اس وقت کو آنے تو دو۔ رشتے خاندان سے ہی نکل آئیں گے۔ تمہیں کسی خوف کا شکار ہونے کی ضرورت ہے اور نا سوچنے کی' میں بھی ابھی بیٹھی ہوں۔"

"آپا!" شہریار نے ایک گہرا سانس لے کر آپا کو دیکھا اور آتش دان میں جلتی آگ کو دیکھنے لگے۔ "میری بیٹی بہت معصوم ہے' میری جان ہے' اکلوتی بیٹی ہے۔ میں جانتا ہوں آپا! مگر...... اس کی معصومیت ہی مجھے خوف زدہ کیے دیتی ہے۔ آپا! وہ بالکل شہزین کا پرتو ہے' اس کی جوانی کا عکس ہے۔"

باہر کھڑی شہزین محبت آمیز انداز میں مسکرادی۔ دل ایک بار پھر سے پرانے انداز سے دھڑکا تھا۔

"اور یہ معصومیت انسان کو ضدی بنا دیتی ہے' بعض اوقات ہمیں پتا نہیں چلتا اور ہم چاند کے تمنائی بن جاتے ہیں۔" آپا ایک ٹک بھائی کو دیکھے گئیں۔

"اور میں نہیں چاہتا کہ اپنی معصومیت اور ضد کو لے کر عارفین کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس کو میں قبول نہ کرسکوں اور شہزین کی طرح وہ بھی کوئی انتہائی قدم اٹھا کر میرے

لیے پشیمانی کا باعث بن جائے؟"

آپا ساکت ہوئیں اور...... باہر کھڑی شہزین کا دل دھک سے رہ گیا۔

"شہزین میری محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آگئی تھی' سامنے میں تھا۔ اس کے گھر والوں نے میرا رشتہ قبول نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسے جھٹک دیتا تو کیا ہوتا؟ وہ میری محبت میں پاگل تھی۔ میں نے اسٹینڈ لیا اور اپنی عزت بنا لیا۔" شہریار دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔

شہزین کا وجود ٹھنڈی دیوار سے جالگا۔

"میری بیٹی نے ماں کی طرح کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تو میں کیا کروں گا؟ اس کے مقابل کوئی میرے جیسا نہ ہوا تو کم پر تو میں سمجھوتا نہیں کرپاؤں گا آپا! اور میں نہیں چاہتا کہ وقت کسی طور خود کو دہرائے۔ میرے اندر جگ ہنسائی کو سہنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے میں......" وہ چپ ہوگئے۔

آپا چپ ہوگئیں۔

شہزین کے دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی۔

آج محبت کا قصور اس کے کھاتے میں لکھ دیا گیا تھا۔

"بیٹی' ماں جیسی نہ ہو۔"

آنکھیں بھیگنے لگیں جب حساب کتاب ہو' سود و زیاں کی بات ہو تو سب زیاں عورت کے حصے میں آتا ہے۔ آپا نے بھی تو ایک بار نہ کہا کہ اس سب میں تمہارا قصور بھی تو ہے مگر گھر تو انہوں نے چھوڑا تھا شہریار کے لیے۔ آج یہ بات جو اس زمانے میں محبت تھی' طعنہ بن گئی۔

اندر کمرے میں آپا کہہ رہی تھیں۔ "تم کوئی انتہائی قدم مت اٹھاؤ' کچھ مت سوچو۔" انہوں نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ "عارفین کو فراز کے لیے مجھے دے دو۔"

"OK آپا! مگر......" جیسے وہ ہوش میں آئے۔ لائف بوائے شیمپو سے لہراتے بالوں والی شہزین اور آج کی عارفین......

"آپا زکیے! میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر شہریار باہر آیا تو دیوار سے لگی شہزین کی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔ اُس نے اُسے کاندھوں سے پکڑ کر ساتھ لگایا۔

"سوری! معاف کردو۔"

"مگر میرا قصور تھا صرف! جیسی ماں، ویسی بیٹی۔" یہ کہہ کر شہزین پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"لو یو شہزین! آئی ایم سوری یقین کرو میں آج بھی تم سے پہلے دن ہی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ تم میرے لیے سب کچھ چھوڑ کر آگئیں! کبھی خیال ہی نہ کیا اس طرف، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مگر جیسی تم حوصلہ مند اور ثابت قدم رہیں میری دعا ہے میری عارفین بھی اپنی ماں جیسی ثابت ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

اتنے میں ہال کمرے سے شور اٹھا تھا۔ اور ہم سب کا فخر ہے یہ۔

فراز نے لائف بوائے شیمپو نکال کر عارفین کو تھمایا۔ ہال میں سب کزنز نے "ہرے" کا نعرہ لگایا اور پھر سب نے شہزین اور شہریار کو گھیر لیا۔

"ماموں! مامی جیسی عارفین ہی میری آئیڈیل تھی۔ مامی جیسے سلکی بالوں والی......"

"ارے لڑکے ہوش کر! یہ کمال لائف بوائے شیمپو کرتا ہے، تیری عارفین پر بھی اُس کا جادو اِس شہزین نے چلایا ہے۔" آپا بیگم دھیرے سے بیٹے کی بات پر مسکائیں۔

اتنے میں صدر دروازہ کھلا اور بی بی جان نے کمرے میں قدم رکھے۔

"بی بی جان!" شہزین پر جیسے شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔

"سوئٹی آئی لو یو! اتنی سنگدل ہوگئیں کہ مجھے بھول گئیں۔"

"آپ نے بھی تو......"

"شہزین پلیز!" شہریار نے کچھ بھی کہنے سے اُسے روک دیا۔

"بی بی جان آجائیں۔ آج کے دن آپ کو ایک کے ساتھ دوسری بیٹی بونس میں مل جائے گی۔" عارفین کو آگے کرتے شہریار نے کہا۔

"ہمیں سب خبر تھی۔ اس لیے ہم اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے گفٹ لائے ہیں۔"

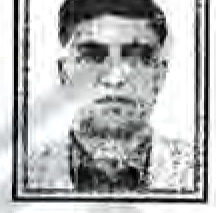
بی بی جان نے گفٹ کا ریپر کھولا تو اندر سے لائف بوائے شیمپو نکلے۔

"میرے لیے تم آج بھی چھوٹی سی، کیوٹ سی سوئٹی ہو۔ جسے میرے بعد اس لائف بوائے شیمپو نے Grown Up کیا۔"

"مضبوط بال...... مضبوط رشتے......" شہریار کے کہتے ہی سب نے قہقہہ لگایا۔

☆☆......☆☆

یہ دوستی ہے



محمد سلیم اختر

سلیم اختر کی جانب سے ایک تحفۂ خاص یادگار کہانی کی صورت

وہ رات مجھ پر گزرنے والی تمام راتوں پر بھاری تھی۔ میرے سامنے پڑا ہوا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں اوران کی راکھ سے بھر چکا تھا۔ مگر میں پھر بھی سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہا تھا۔ کیونکہ میرے عدوست رابیل کے مقدر کی طرح سیاہ رات ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ میں خوف زدہ تھا کہ صبح کا اُجالا میرے لیے افشائے راز کا سبب بن جائے گا، آنے والا کل میری اور رابیل کی دوستی کا بھرم کھول دے گا۔ لوگ مجھ پر سنگ برسائیں گے، مجھے یار مار کا لقب دیں گے، مجھے قاتل کہا جائے گا...... ہاں، میں اس قابل ہوں۔ میں دوستی کے قابل نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے پیارے دوست رابیل کو زہر دے دیا ہے۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوگا، وہ تڑپ رہا ہوگا، درد سے بلبلا رہا ہوگا میں بھی اس بھیانک صبح کا منتظر ہوں جب رابیل کی موت کی خبر پھیلے گی اور ساتھ ہی یہ بھی تو بتایا جائے گا کہ رابیل کا قاتل اس کا جانی دوست ہے، اسی نے اسے زہر لا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

ہماری دوستی کی ابتدا کالج میں ہوئی تھی۔

تھرڈ ائیر میں داخلہ کے لیے میرا نام آخری میرٹ لسٹ میں آیا تھا، فیس جمع کرانے کے لیے صرف ایک دن دیا گیا تھا۔ میری جیب میں اتنی رقم نہ تھی کہ میں اسی دن فیس جمع کرا دیتا۔ لہٰذا مجھے گھر واپس آنا پڑا، واپسی تک کالج کا دفتر بند ہو چکا تھا۔ میں نے اگلے روز فیس جمع کرانے کا ارادہ کرلیا۔ اگلے روز میں نے کالج جلدی پہنچنے کی غرض سی بس کی بجائے ویگن میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر بھی ویگن نے جگہ جگہ اسٹاپ کر کے ایک گھنٹہ لگا دیا۔ ویگن میں گنجائش سے زیادہ مسافر سوار ہورہے تھے۔ میں نے بھی بڑی مشکل سے یہ سفر طے کیا۔ میں کالج کے دفتر کے سامنے پہنچا تو وہاں پہلے ہی فیس جمع کرانے والوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی، لگتا تھا کہ اپنی باری دو گھنٹوں کے بعد ہی آئے گی۔ خدا خدا کر کے میری باری آئی تو میں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالنی چاہی مگر میرے ہاتھوں میں کچھ نہ آیا۔ میری جیب خالی تھی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دوسری جیبوں میں ہاتھ ڈالا مگر وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ ویگن کے سفر کے دوران کسی نے میری فیس کی رقم اُڑا لی تھی...... دکھ اور شرمندگی کے مارے میرا بُرا حال ہوگیا کیشئر بھی میری طرف ہی دیکھ رہا تھا، میری حالت دیکھ کر بولا۔

''اگر آپ کے پاس رقم نہیں ہے تو لائن سے ہٹ جائیں، دوسروں کو موقع دیں۔ م''

میں نے شرمندگی کے مارے لائن چھوڑ دی اور کھڑکی کے ساتھ کھڑا ہو کر پھر سے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا کہ شاید کسی جیب سے رقم نکل آئے۔

''کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا؟'' میرے پیچھے کھڑے طالب علم نے میری پریشانی دیکھ کر پوچھا، اس کے لہجے میں ہم دردی کا عنصر نمایاں تھا۔

''کالج کے آتے ہوئے ویگن میں کسی نے میری رقم نکال لی ہے۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''اب اگر گھر جاؤں اور پھر واپس آؤں تو کالج کا ٹائم ختم ہو جائے گا۔''

''آپ کا نام اور گروپ؟'' اس نے پوچھا۔

''شکیل احمد ولد احمد دین۔ آرٹس گروپ تھرڈ ائیر۔'' میں نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''آپ پارک میں بیٹھیں۔ میں آتا ہوں۔''

میں پارک میں آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بدقسمتی کا ماتم کرنے لگا، ساتھ ہی ساتھ جیب کاٹنے والے کو بددعائیں دینے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ آ گیا ہے، آتے ہی بولا۔

''شکیل صاحب! یہ لیں رسید...... آپ کی فیس میں نے جمع کرادی ہے۔ یہ اُدھار ہے۔ جس روز کالج کھلے گا، میری رقم لوٹا دینا۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔'' ایسا کہتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔

''نہیں شکیل! یہ احسان نہیں، ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے نبھایا ہے۔''

''آپ اپنا تعارف تو کرائیں نا؟'' میں نے اس سے دوستی کرنے کا عہد کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں عیسائی ہوں۔ رابنسن میرا نام ہے۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، لاڈلا ہوں۔''

''تم عظیم ہو، رابنسن! تم نے مجھ پر مہربانی کی ہے اس کا اجر تمھیں ضرور ملے گا۔''



میری آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر آئیں تو رابنسن نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگا۔

"انسان ہی انسان کے کام آتا ہے، اب شکریہ کا لفظ زبان نہ لانا۔ آج سے ہم دوست ہوئے۔"

"مجھے تمہاری دوستی پر فخر رہے گا، رابنسن! ہماری دوستی مثالی ہوگی، اس کی مثالیں دیا کریں گے۔"

ہم دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کینٹین میں چائے پی، واپسی کا کرایہ بھی مجھے رابنسن نے ہی دیا اور میں گھر لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

میں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں اور ان سے چھوٹا بھی، اس لیے میں گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ ابا جان ایک سرکاری ادارہ میں کام کرتے تھے۔ وہ بہت ہی محبت کرنے والے اور زندہ دل انسان تھے، ہر ایک کے کام آنا اور احترام کرنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کا رویہ ہم سے دوستوں جیسا تھا، ہم اپنی ہر بات ان سے بلا جھجک کہہ دیتے اور وہ بھی ہمارا بھرپور ساتھ دیتے، تعاون کرتے اور ہمارا ہر مسئلہ ترجیحی بنیاد پر حل کرتے ہمیں اپنے ابا جان پر فخر تھا ہماری امی جان، ابا جان کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ ہر کام میں تفریق اور نفاست برتنے کی عادی تھیں، ہم بہن بھائی ان سے دبتے تھے۔ گھر کے ملازموں اور مانگنے والوں سے ان کا رویہ نہایت ہی ظالمانہ ہوتا تھا۔ وہ کسی کی کوئی بھی غلطی معاف نہ کرتی تھیں۔ اپنے سے چھوٹے لوگوں سے ان کی خواہ مخواہ کا بیر تھا، گویا وہ انسان کو انسان ہی نہ سمجھتی تھیں۔ ہم بہن بھائیوں کا ان کے ساتھ اکثر ایسی ہی باتوں پر اختلاف ہوتا تھا مگر ان کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ ابا جان تو امی جان سے کے معاملات میں دخل ہی کم دیتے تھے، اسی وجہ سے امی اور بھی شیر ہوگئی تھیں کہ گھر میں ان کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہم تینوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ وہ ہمیں بھی اپنے جیسا ہی سنگدل دیکھنا اور بنانا چاہتی تھیں مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو پاتی تھیں کیونکہ ہم اپنے ابو کے نقش پر چل رہے تھے مگر گھر کا ماحول پرسکون ہی رہتا تھا۔

اس روز میں گھر پہنچا تو ابا جان ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ میں نے امی جان کو رقم چوری ہونے اور پھر رابنسن کی طرف سے فیس جمع کرانے کی پوری تفصیل سنائی تو انھیں غصہ آ گیا۔ پہلے تو انھوں نے ویگن والوں کو سنائیں، پھر رقم چوری کرنے والے کو بددعائیں دینے لگیں کہ خدا کرے، اس کے گھر میں آگ لگ جائے۔ اس کے وہ ہاتھ ٹوٹ جائیں، جن ہاتھوں سے اس نے میری جیب صاف کی ہے...... پھر میری طرف متوجہ ہوئیں اور غصہ سے کہنے لگیں۔

"تم نرے بدھو ہو، تم سے رقم بھی نہیں سنبھالی گئی۔ پہلے دن ہی باپ کی کمائی لٹادی اب آئندہ کیا کروگے......؟"

"آئندہ سے میں بس میں جایا کروں گا، امی! اور بس والے تو طالب علموں سے صرف پچیس پیسے کرایہ لیتے ہیں، وہ بھی کئی لڑکے گول کر جاتے ہیں۔"

"جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہاری رقم چوری ہو گئی ہے تو گھر آ جاتے اور گھر سے رقم لے کر دوبارہ کالج جا کر جمع کرا آتے۔ تم نے تو خاندان کی ناک کٹوادی ہے۔"

"میں گھر آتا اور پھر یہاں سے رقم لے کر دوبارہ کالج جاتا تو کالج بند ہو چکا ہوتا، فیس جمع نہیں ہو پاتی تو داخلہ نہ ملتا اور قیمتی تعلیمی سال ضائع ہو جاتا۔"

میں نے غصہ بھرے انداز میں کہا تو ان کے لہجے میں معمولی سی نرمی آ گئی، کہنے لگیں۔

"کسی مسلمان لڑکے سے رقم لے کر فیس جمع کرادی ہوتی، کرسچین سے رقم لے کر تم نے فیس جمع کرا کے مسلمانوں کو خوار کر دیا ہے۔"

"نہیں امی جان، ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے کسی سے رقم نہیں مانگی تھی، رابنسن نے خود ہی میری فیس جمع کرادی تھی۔ امی جان! آپ کو تو اس کا ممنون ہونا چاہیے۔"

امی نے اُٹھ کر الماری سے رقم نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "ابھی جاؤ اور رقم اسے دے کر اس کا احسان اتار دو، مجھے نہیں اچھے لگتے یہ لوگ۔"

میں نے رقم لے کر جیب میں رکھی اور کہا۔ "ابھی کہاں دوں اسے، میں تو اس کا گھر ہی نہیں جانتا...... چار دن بعد کلاسز شروع ہوں گی تو رقم اسے دے دوں گا اور ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔"

"جب رقم لوٹا دو گے تو شکریہ کس بات کا......؟"

امی سوالیہ لہجے میں بولیں۔

"شکریہ بروقت میری مدد کرنے، میرے کام آنے، میرا تعلیمی سال بچانے کا......؟" میں نے بھی اس لہجے میں جواب دیا۔

"اب تو تم اس سے دوستی بھی کروگے؟" امی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو ہو چکی ہے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"اب اس دوستی کو کالج تک ہی محدود رکھنا، گھر تک نہ لانا...... سمجھے!"

امی یہ کہہ کر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

☆......☆......☆

یہ اتفاق ہی تھا کہ میرے اور رابنسن کے مضامین اور سیکشن بھی ایک ہی تھے، یہ ہم دونوں کے لیے راحت کا باعث تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ رابنسن کو اس کی رقم واپس کر دی تھی...... کلاس میں ہم ایک ہی بینچ پر بیٹھتے تھے۔ کالج ٹائم کے دوران ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لائبریری اور کھیل کے میدان جانا ایک ساتھ ہی ہوتا۔ ہمارے مزاج میں بھی قدرتی طور پر ہم آہنگی تھی۔ دن بدن ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی، ہمیں ایک دوسرے پر فخر تھا۔ مجھے کئی بار مسلمان طالب علموں کی طنزیہ باتیں بھی سننی پڑتی تھیں مگر مجھے کسی کی پرواہ نہ تھی، مجھے صرف رابنسن سے غرض تھی جسے میں اب پیار سے رابی کہہ کر بلاتا تھا۔ کیونکہ اس کے گھر میں بھی اسے رابی ہی کہا جاتا تھا۔ ہم تعلیم کے معاملہ میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ میں اپنے گھر میں ابا جان اور اپنی بہنوں سے رابی کا ذکر کرتا تھا۔ ابا جان کی خواہش تھی کہ میں رابی کو اپنے گھر لاؤں، وہ اس سے ملنا چاہتے تھے مگر امی کی وجہ سے میں رابی کو گھر آنے کی دعوت نہ دے رہا تھا حالانکہ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں رابی کو اپنے گھر والوں سے ملواؤں۔ اِدھر رابی تھا کہ ہر روز ہی مجھے اپنے ساتھ گھر جانے کے لیے اصرار کرتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میرا تعارف اچھے انداز میں کرا کے میرے نمبر بنا رکھے تھے۔ میری طرح رابی بھی والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی ایک اس کی بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور کسی دوسرے شہر میں شوہر کے ہمراہ رہتی تھی۔ اب گھر میں اس کی ماں اور باپ تھے، رابی ان کی آنکھوں میں تارہ تھا، ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے میرا ذکر نہایت ہی اچھے انداز میں کیا تھا۔ وہ بھی کئی بار پیغام بھیج چکی تھیں کہ میں رابی کے ہمراہ ان کے گھر آؤں مگر میں رابی کو ٹال رہا تھا محض اس ندامت کی بنا پر کہ میں رابی کو ایک بار بھی گھر آنے کی دعوت نہیں دے رہا تھا، میں ڈرتا تھا کہ کہیں میری امی کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں کہ ہماری دوستی کے ستون کمزور ہو جائیں۔ میں رابی کو کھونا نہیں چاہتا تھا، نہ جانے کیوں رابی کے بغیر مجھے ادھورے پن کا احساس ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

وہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ کالج میں طلباء یونین نے اپنے مطالبات منظور نہ ہونے کی بنا پر کلاسوں کا بائیکاٹ کر ڈالا اور ایک جلوس نکالا...... میں اور رابی بھی اس میں شامل تھے۔ جب ہمارے ساتھیوں نے توڑ پھوڑ شروع کی تو ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا، ہم جلوس سے علیحدہ ہو گئے۔ میں نے گھر آنے کا پروگرام بنا لیا مگر رابی نے میرے اس فیصلہ سے اتفاق نہ کیا بلکہ مجھے اپنے گھر جانے پر بضد ہو گیا۔ مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میں اس کے ہمراہ اس کے گھر پہنچا تو اس کی امی نے میرا استقبال بڑے ہی خوشی بھرے انداز میں کیا، انھوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور سینے سے لگایا۔

"میں تم میں اور رابی میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ رابی تمہاری تعریفیں روزانہ ہی کرتا ہے اس لیے تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ آج سے میرے دو بیٹے ہو گئے، ایک تم اور دوسرا رابی۔"

رابی کی ماں کی محبت نے مجھے نہال کر ڈالا۔ اتنی محبت، چاہت اور خلوص میں نے کہیں نہ دیکھی اور نہ پائی تھی۔ ان کی محبت بھری باتیں میری روح کو سیراب کر گئیں، میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھنے لگا کہ کاش! میری ماں بھی رابی کو اس طرح بیٹا کہہ کر پیار کرتیں...... رابی اور اس کی ماں کو معلوم تھا کہ میں روزے سے ہوں۔ اس وجہ سے انھوں نے بھی نہ ہی کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔

میں نے رابی سے کہا کہ وہ کھانا کھا لے مگر اس نے انکار کر دیا۔ رابی نے میرے گھر فون کر کے کہہ دیا کہ میں اس کے گھر ہوں اور رات تک آؤں گا۔ میں نے اسے لاکھ کہا کہ میں گھر جاؤں گا مگر رابی اور اس کی ماں کی بے لوث اور بیکراں محبت میرے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ مغرب کے وقت میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ رابی کی ماں میرے لیے نہایت پرتکلف افطاری تیار کی تھی۔ میں نے افطاری کی، پھر نماز پڑھی اور پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات کو جب میں روانہ ہونے لگا تو رابی کی ماں نے مجھے ایک سوٹ کا کپڑا تحفے میں دیا، ساتھ ہی ڈھیروں دعائیں بھی اور آتے رہنے کی تاکید بھی کی...... گھر پہنچا تو امی کے تیور دیکھ کر ڈر سا گیا۔

''تم مجھ کو بتا کر کیوں نہ گئے کہ تم رابنسن کے گھر جاؤ گے؟''

امی نے غصہ سے پوچھا، جواب میں نے کالج میں کلاسوں کے بائیکاٹ، جلوس اور توڑ پھوڑ کے بعد رابنسن کے اصرار کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں مجبور ہو گیا تھا اس لیے انکار نہ کر سکا، اور اس کے گھر چلا گیا۔

''رات تک وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا تھی؟'' امی کے لہجے میں مزید تلخی آ گئی۔

''رابنسن کی امی نے نہ آنے دیا، انھوں نے بہت ضد کی تو میں ان کے خلوص کو رد نہ کر سکا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''میں خوب جانتی ہوں ان لوگوں کو، وہ تمھیں اپنے ماحول اور اپنے مذہب کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے میں تمہاری اس دوستی کے خلاف ہوں اور آج تم نے روزہ بھی صحیح طرح افطار نہ کیا ہوگا؟'' امی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''امی جان! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ رابنسن اور اس کی ماں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں بتا نہیں سکتا، رابنسن کی امی نے میرے لیے افطاری بھی بنائی تھی، انھوں نے روزہ کا پورا اور مکمل احترام کیا تھا۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم، میں اب تمہاری کوئی بات نہ سنوں گی، بہتر ہے کہ تم اس عیسائی لڑکے سے دوستی ختم کر لو۔ میں آئندہ تمہاری زبان سے اس کا نام نہ سنوں۔''

امی نے اس قسم کی کئی باتیں کیں جو میں نے خاموشی سے سنیں اور پھر بھلا دیں کیونکہ میں رابی سے دوستی کا ناتا ختم کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں آئندہ کے لیے محتاط ضرور ہو گیا کہ امی کے سامنے رابی کا نام نہ لیتا تھا البتہ ابا جان اور بہنوں کے ساتھ اس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ مجھے یہ دکھ بھی کھائے جا رہا تھا کہ میں رابی کو اپنے گھر نہیں بلا سکتا۔ رابی کو میری اس مجبوری کا علم نہ تھا پھر بھی اس نے کبھی اس سلسلہ میں مجھ سے بات نہ کی تھی، البتہ وہ امی اور ابا کے بارے میں کبھی کبھی پوچھ لیتا تھا کہ وہ کیسے ہیں؟

☆......☆......☆

بی اے کرنے کے بعد ہم نے ایم اے میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کالج میں ہی ایم اے کی کلاسیں ہو رہی تھیں۔ میں مہینہ میں ایک دو بار رابی کے گھر ضرور جاتا تھا، اس کی وجہ سے رابی کی امی سے ملاقات اور ان کی ڈھیروں پرخلوص دعائیں لینا ہوتی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر اور مل کر بہت ہی خوش ہوتی تھیں۔

ان دنوں ہم فائنل ایئر میں تھے کہ رابی کی امی بیمار ہو گئیں، انھیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ میں روزانہ ہی رابی کے ہمراہ ان کو دیکھنے اسپتال جاتا تھا۔ کئی دن کی تشخیص کے بعد پتہ چلا کہ ان کو کینسر کا موذی مرض لاحق ہے۔ ان کا علاج کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی مگر اس موذی مرض نے بالآخر ان کی جان لے لی۔ اس روز میں دھاڑیں مار مار کر رویا، لگتا تھا، جیسے میری سگی ماں فوت ہو گئی ہو۔ رابی کا بھی رو رو کر برا حال تھا، میں اس کو دلاسہ دیتے ہوئے خود بھی رو پڑتا۔ کئی دن تک میری اور رابی کی طبیعت نہ سنبھل سکی تھی۔ رابی کو امی کی بیماری کے دوران خون کی ضرورت پڑی تو رابی کے ساتھ میں نے بھی ان کو خون دیا تھا، دکھ تھا کہ میرا خون بھی ان کے کام نہ آیا۔ رابی کی بہن اب یہاں ہی آ گئی تھی۔ میں اسے باجی کہتا تھا اور وہ مجھے رابی کی طرح چھوٹا بھائی ہی سمجھتی تھی۔ میرے ابو افسوس کرنے کے لیے رابی کے گھر آئے تھے مگر میری امی نے مجھے بھی دو لفظ افسوس کے نہ کہے، ان کے گھر جانا تو دور کی بات ٹھہری۔ وہ اب مطمئن تھیں کہ شاید اب میرا رابی کے گھر آنا جانا کم ہو جائے گا مگر وہ یہ نہ جانتی تھیں کہ ماں کے بعد مجھے اس جیسی باجی مل گئی ہے۔

ماں کی وفات کے بعد رابی کا پڑھائی سے جی اچاٹ ہو گیا، اس کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی۔ اس کے معدہ میں کوئی تکلیف ہو گئی تھی، کبھی کبھار پیٹ میں شدید درد اٹھتا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو انھوں نے اسے معمولی تکلیف قرار دیا اور مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ میں نے رابی کی پڑھائی ختم نہ ہونے دی۔ بالآخر ہم دونوں نے ماسٹر کر لیا اور پھر سروس کی تلاش شروع ہو گئی۔ رابی ابھی تک ماں کی جدائی کا غم نہ بھولا تھا، خود میں بھی ان کی میٹھی اور پیار بھری باتیں نہ بھول پایا تھا۔ میں رابی کے گھر جاتا تو اس کی بہن خوشی سے کھل اٹھتی۔ وہ میری اور میرے گھر والوں کی خیریت پوچھتی اور مجھے کسی قسم کی اجنبیت کا احساس تک ہونے نہیں دیتی۔ رابی اور اس کے گھر والوں کا بے لوث پیار پا کر میں خود سے شرمندہ ہو جاتا اور سوچتا کہ میں کتنا مجبور ہوں اور بے بس ہوں کہ رابی کو ایک بار بھی اپنے گھر لے کر نہیں گیا، وہ کیا سوچتا ہوگا؟ مگر آفرین ہے رابی پر کہ اس نے کبھی بھی اس بارے میں بات نہ کی تھی، اس نے کبھی بھی میرے گھر آنے اور میرے گھر والوں سے ملنے کی خواہش نہ کی تھی، شاید اسے میری مجبوری کا علم ہو گیا تھا مگر اب میں مجبوری کی یہ زنجیر توڑنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا، رابی کی اداسی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

رابی کو ایک پرائیویٹ ادارہ میں اچھی ملازمت مل گئی تھی مگر میں ابھی تک سروس کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ بالآخر رابی کی ہی کوششوں سے مجھے بھی ایک اچھے ادارہ میں جاب مل گئی، تنخواہ بھی معقول تھی اس لیے میں بھی خوش تھا۔ اس عرصہ میں میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں مگر میں بہنوں کی شادی پر رابی کو نہ بلا پایا تھا۔ گھر میں جب میں نے سروس ملنے کی خبر سنائی تو امی اور ابو دونوں ہی خوش ہوئے کہ میں اب گھر کی کفالت کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ ابو ریٹائر ہو گئے تھے اس لیے اب گھر کا نظام مجھے ہی چلانا تھا، مجھے پہلی تنخواہ ملی تو میں نے وہ امی کے ہاتھوں میں لا کر رکھ دی، اس کے ساتھ ہی ان سے فرمائش کر دی کہ میں نے ایک دو دوستوں کی دعوت کی ہے اس لیے اچھا سا کھانا تیار کریں۔ امی نے دعوت کا پروگرام اگلے روز پر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

اس روز میں نے اپنے دفتر سے آدھا گھنٹہ قبل ہی چھٹی کر لی اور سیدھا رابی کے دفتر پہنچا۔ میں نے رابی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اسے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھلاؤں گا اور یہ سب کچھ سروس ملنے کی خوشی میں ہوگا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اس کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔

''یہ تم کون سے ہوٹل جا رہے ہو؟'' رابی نے مجھے محلہ کی گلیوں میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

''اپنے ذاتی ہوٹل، اپنے گھر۔''

میں نے مختصر سا جواب دیا۔ رابی میرا جواب سن کر خاموش ہو گیا اور مزید کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی کیونکہ آج میں نے عہد کر لیا تھا کہ رابی کو میں اپنی ماں اور باپ سے ملواؤں گا اور اپنی ماں سے التجا کروں گا کہ وہ رابی کو ماں کا پیار دیں، بالکل اسی طرح جس طرح رابی کی ماں مجھ پر محبتیں نچھاور کرتی تھیں۔ میں نے رابی کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر ابا جان کو ساتھ لے کر آ گیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو میں امی کے پاس کچن میں آ گیا جہاں وہ کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

''آ گئے تمہارے دوست؟'' امی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

''صرف ایک دوست آیا ہے، امی جان۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم تو کہہ رہے تھے، دو ہوں گے۔'' امی بولیں۔

''میرا دوست تو صرف ایک ہی ہے۔'' میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''کون ہے وہ؟'' امی نے میری طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رابنسن۔''

میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ امی کے تیور بگڑ گئے، کہنے لگیں۔

''میں نے تمھیں منع کیا تھا کہ کسی بھی عیسائی دوست کو گھر نہ لانا مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ جاؤ، اسے ہوٹل پر لے جا کر کھانا کھلا دو۔ میں کھانا نہیں بناؤں گی۔''

دکھ اور درد کی کیفیت سے میری آنکھیں بھر آئیں، میں امی کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''امی جان! ایسا مت کریں میں آپ کا بیٹا ہوں، میری مان مت توڑیں۔ رابی میرا واحد اور جان سے عزیز دوست ہے۔ اس کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی، وہ ماں کی محبت کا ترسا ہوا ہے۔ آپ اسے شکیل سمجھ کر ماں کا پیار دے دیں۔ ماں کا دل تو سمندر ہوتا ہے، ماں تو سراپا محبت ہوتی ہے اور محبت میں کوئی غیر نہیں ہوتا۔ آج رابی پہلی بار گھر آیا ہے۔ پلیز، امی جان! صرف آج کا دن اسے ماں بن کر خوش آمدید کہیں، ایسا کرنے سے میرے من کو چین مل جائے گا۔''

''نہیں شکیل! میں ایسا نہ کرپاؤں گی۔ میں کھانا پکا دیتی ہوں۔ تم اسے کھانا کھلاؤ اور فارغ کردو۔'' امی کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

''امی جان! اتنی کٹھور نہ بنیں! کیا میں آپ کو عزیز نہیں ہوں؟'' میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں تو دیکھ کر میں جیتی ہوں۔''

پھر بھی میری خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتیں؟''

''یہ خواہش نہیں، تمہاری ضد ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سے کھانا بنانے لگیں۔

''ٹھیک ہے، امی جان! اگر آپ میرے دوستوں سے اچھا سلوک نہیں کرسکتیں تو میں بھی اس گھر میں نہیں رہوں گا، میں کل یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' میں نے بالآخر دھمکی آمیز رویہ اختیار کرلیا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' امی غصہ سے بولیں۔

''رابی کے ساتھ، اس کے گھر۔''

میری دھمکی کام کرگئی، امی نے ہتھیار ڈال دیے اور کہنے لگیں۔

''پہلے تم لوگ کھانا کھالو، پھر میں تمہارے رابی سے مل لوں گی۔''

میں نے امی کا شکریہ ادا کیا اور کوشی خوشی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں کھانا تیار ہوگیا۔ ہم تینوں نے مل کر ڈرائنگ روم میں ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ابا جان اُٹھ کر چلے گئے، میں خود ہی برتن اٹھا کر کچن میں لے گیا۔ پھر میں نے امی کو ساتھ چلنے کو کہا تو وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ رابی نے ان کو دیکھا تو اُٹھ کر سلام کرکے ان کی شفقت پانے آگے بڑھا تو امی پیچھے ہٹ گئیں۔ انھوں نے رک کر سلام کا جواب دیا اور اس کے علاوہ رابی کوئی بات نہیں کی۔ وہ نظریں جھکائے کھڑا تھا کہ جب امی بیٹھ جائیں گی تو پھر وہ بھی بیٹھے گا۔ مگر ابھی مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ بغیر کوئی بات کیے واپس لوٹ گئیں۔ امی کے اس رویہ نے مجھے رابی کے سامنے نادم کرڈالا۔ رابی ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی جاگتی آنکھوں میں بلا کی ویرانیاں پھیل گئی تھیں، ایک عجیب سی وحشت ان میں جھانکنے لگی تھی۔ وہ لمحے میرے لیے بھی بڑے ہی اذیت ناک بن گئے، ایک بے رحم سچائی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے آ گئی تھی۔ میں رابی سے نظریں چرانے لگا کیونکہ میرے دل میں بھی انگارے دہک اُٹھے تھے۔ رابی کی آنکھوں کی گہرائی میں طلاطم بپا تھے جو اس کی پلکوں کے کناروں پر تھرتھرانے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس دنیا میں اکیلا ہو، اس کا کوئی غم گسار نہ ہو اور وہ تنہا اپنی تقدیر پر ماتم کناں ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آنسو پلکوں کے کناروں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا، خود میری آنکھیں بھی ساون بھادوں بن گئیں۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے اپنا دل چیر کے دکھانا چاہتا تھا مگر زبان میرا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔ کوئی گلہ نہ کیا، زبان نہ کھولی بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھ سے اجازت مانگی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں اسے روک بھی نہ سکا۔ میں اسے بھلا کیسے روک سکتا تھا؟ اس کے نازک احساسات، محبتوں سے لبریز من کو میں نے ہی تو مجروح کیا تھا۔ میرے گھر ہی سے اسے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا تھا...... میں کرسی پر ڈھے کر سسکنے لگا۔ ابا جان نے آ کر مجھے تسلیاں دی اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ امی جان نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، وہ جو کچھ چاہتیں تھیں ہو گیا۔ رابی مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد میں اس کے دفتر اس سے ملنے گیا تو اس خبر نے مجھے چونکا دیا کہ رابی نے سروس چھوڑ دی ہے، اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میرا رخ اب اس کے گھر کی طرف تھا۔ مجھے اس سے اس اقدام کی توقع نہ تھی۔ میں اس کے گھر پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوس والوں سے معلوم ہوا کہ وہ اور اس کی بہن حیدرآباد چلے گئے ہیں جہاں اس کا بہنوئی ملازمت کرتا تھا۔ مجھے وہاں کا ایڈریس معلوم نہ تھا۔ رابی کو یہی کرنا چاہیے تھا، دل دکھانے والوں کے شہر میں اسے رہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دکھ کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مجھے یہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوکر گیا ہے۔ اسے میرے گھر والوں سے جس ہمدردی اور خلوص کی توقع تھی، وہ اسے نہ ملا تھا۔ وہ یہ شہر چھوڑ کے جانے میں حق بجانب تھا۔ میں پریشان اور بے بس سا ہو کر گھر لوٹ آیا مگر مجھے کسی پل بھی چین نہ تھا۔ میں نے امی سے جی بھر کر لڑائی کی اور ان کو ہی رابی کے چلے جانے کا ذمہ دار قرار دیا۔ میں نے امی سے کہا تھا کہ رابی چلا تو گیا ہے مگر میرے دل کے صفحہ پر اب بھی جا بجا اس کا نام لکھا ہے۔ میں اسے کبھی بھی نہ بھول پاؤں گا، میں دوستی کے اس امتحان میں پورا اتروں گا۔

☆......☆......☆

مجھے نہ دن کو چین تھا، نہ رات کو سکون تھا۔ رابی کے بعد میں اپنے آپ کو اُدھورا محسوس کر رہا تھا۔ یوں ہی ایک ہفتہ گزر گیا۔ میرا کسی کام میں بھی جی نہ لگتا تھا، دفتر میں بھی اور گھر میں بھی کسی سے زیادہ بات نہ کرتا، رابی کے بغیر میری دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ جیسے گلشن میں چپکے سے بہار آ گئی ہو، اندھیری رات میں اچانک بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہوگیا ہو۔ وہ خوشبو بن کر میرے انگ انگ میں سما گیا۔ رابی کا خط میرے نام آیا اور میرے وجود کو پیار کی مدھر خوشبو سے مہکا گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

''پیارے دوست! معذرت چاہتا ہوں کہ میں تمہیں بتائے اور ملے بغیر آ گیا۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ یقین جانو، تم مجھے اس دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو۔ مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے اور تمام عمر رہے گا۔ جب سے میری ماں اس دنیا سے گئی ہے، تب سے میں بے سکون اور بے آرام ہوگیا ہوں۔ اگر تم اور میری باجی نہ ہوتے تو میں زندگی ہار گیا ہوتا۔ تم نے تو کبھی نہیں بتایا مگر میں تمہاری کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ اس دنیا کے ہر انسان کی اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری امی کو میری اور تمہاری دوستی پسند نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں عیسائی مذہب کا پیروکار ہوں مگر ماں تو سب کی اور سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ میں تمہاری ماں کو اپنی ماں سمجھتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں اور تمام عمر کرتا رہوں گا۔ وہ دن جلد آئے گا کہ تمہاری ماں مجھے بیٹا کہہ کر سینے سے لگالیں گی کیونکہ ماں کا روپ تو شفقت کا روپ ہوتا ہے۔ اس عظیم ہستی کو بنانے کے لیے خالق دو جہاں نے ایک بہت ہی بڑی صراحی لی ہوگی۔ اس میں لازوال محبت کا عرق ڈالا ہوگا۔ پھر اس عرق میں ایثار کی خوشبو، نیکی کے پھول، خوش اخلاق کا ذائقہ، عبادت کا نور اور خلوص بے کراں کی ٹھنڈک ڈالی ہوگی۔ عفو در گزر کے پھولوں سے اس صراحی کو سجایا ہوگا، پھر اسے انسانی پیکر میں ڈھال کر دنیا میں اتارا گیا ہوگا تو بھلا میں ایسی عظیم ہستی کی محبت سے کیوں محروم رہوں گا؟ تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی اور یہ خبر ماں جی کو بھی سنا دو کہ میں اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود مسلمان ہوگیا ہوں کیونکہ مجھے تمہاری دوستی اور ماں جی کی محبت سے بڑھ کر پیاری ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بہت عرصہ قبل ہی کرلیا تھا اور اسلام کے ارکان وفرائض سے واقفیت حاصل کرلی تھی۔ ایمان کی طاقت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اسی ایمان کی قسم کہ مجھے مذہب اسلام پر ناز ہے، یہ مذہب دلوں کو مسخر کرنے والا مذہب ہے۔ میں جلد ہی واپس تمہارے شہر لوٹ کر آ رہا ہوں۔ اب میں وہاں ہی رہوں گا، تمہارے سنگ۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہماری دوستی کی راہ میں دیوار نہ بنے گی۔ تمہارا رابیل۔''

رابی کا خط پڑھ کر خوشی سے میری آنکھیں بھر آئیں، میری سونی زندگی میں جیسے بہار آ گئی، میں جو اکیلا اور اُدھورا رہ گیا تھا، رابی کے خط نے میری تکمیل کردی۔ میں سیدھا امی کے پاس پہنچا اور وہ خط پڑھنے کے لیے دے دیا۔ امی نے بڑے غور سے رابی کا خط پڑھا۔ خط پڑھ کر ان کے چہرے پر خوشیوں کا میلہ سا لگ گیا، وہ اٹھیں اور دو نفل شکرانے کے پڑھنے کے بعد سجدہ میں گر گئیں۔ وہ رابی کے مسلمان ہونے پر اللہ کا شکر ادا

کرنے لگیں اور پھر مجھے مبارک باد دے کر کہنے لگیں۔

"رابی کا نام رابیل مجھے پسند آیا ہے، تم سے ملتا جلتا ہے۔ آج سے رابیل مجھے تمہاری طرح عزیز ہے۔ میں تم میں اور اس میں کوئی فرق روا نہیں رکھوں گی۔ میں نے تمہارا اور رابیل کا بہت دل دکھایا مگر اب میں ماضی کی ہر زیادتی کی تلافی کردوں گی، آج میری ایک خواہش کی تکمیل ہوگئی ہے۔ تم سوچتے ہوگے کہ میں تمہارے عیسائی دوست سے کیوں نفرت کرتی تھیں مگر تم نے مجھ سے کبھی اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ اس کی وجہ میرے علاوہ کم لوگوں کو معلوم ہے، حتیٰ کہ تمہارے باپ کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ آج میں تمہیں اس کی وجہ بتا رہی ہوں۔"

پھر وہ بتانے لگیں کہ بچپن میں یاسمین میری بہت ہی پیاری سہیلی تھی۔ ہم کلاس فیلو بھی تھیں۔ ہر جگہ ہماری دوستی کے چرچے تھے۔ یاسمین ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حسن میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتی تھی پھر بھی نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ ایک عیسائی لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ میں نے اسے منع کیا، لاکھ سمجھایا مگر اس پر محبت کا بھوت سوار تھا کہ اسے جیکسن کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کاش! جیکسن، یاسمین کی خاطر مسلمان ہوگیا ہوتا مگر ایسا نہ ہوا۔ یاسمین، جیکسن کی محبت میں اتنی دور نکل گئی کہ وہ اس کی ہم مذہب بن کر اس کی بیوی بن گئی۔ پھر اس نے ملک چھوڑ دیا اور جیکسن کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔ اب معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے۔ مجھے اس روز سے نہ صرف یاسمین بلکہ ہر عیسائی سے نفرت ہوگئی۔ یاسمین کا باپ اس کے غم کو سینے سے لگا کر مرگیا اور ماں پاگل ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے اس دوست رابنسن سے نفرت کرتی تھی، میری یہ خواہش تھی کہ میں کسی عیسائی کو اسلام کے دائرہ میں داخل کروں تو تب ہی مجھے چین آئے گا اور آج میری اس خواہش کی تکمیل ہوگئی ہے، اوپر والے نے میری یہ خواہش پوری کردی ہے۔ رابنسن کے مسلمان ہونے سے میرے اندر لگی ہوئی وہ آگ سرد پڑ گئی ہے جو یاسمین نے لگائی تھی۔"

☆......☆......☆

رابیل آیا تو امی نے سگی ماں کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اب وہ ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔ اسے پھر سے اسی ادارہ میں ملازمت مل گئی۔ اس نے اپنا آبائی مکان فروخت کر ڈالا اور ہمارے نزدیکی محلہ میں مکان خرید لیا۔ اب وہ اکثر ہمارے گھر آجاتا۔ امی اس کی ہر صورت کا خیال رکھنے لگیں۔ پھر امی نے ہی اس کے لیے لڑکی پسند کی۔ رابیل کی بارات ہمارے گھر سے ہی روانہ ہوئی اور دلہن لے کر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ امی اور میں نے جی بھر کر رابیل کی شادی پر خوشی منائی، میری بہنوں نے اپنے ارمان پورے کیے۔ کچھ عرصہ بعد میری بھی شادی ہوگئی۔ رابیل اور شازیہ بھابھی نے میری شادی پر اپنے ارمان پورے کیے اور جی بھر کر دولت لٹائی، خوشیاں منائیں۔ اب ہر طرف سکھ ہی سکھ اور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ہماری دوستی کا درخت دن بدن گھنا اور مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔

یوں ہی سات سال کا عرصہ بیت گیا۔

ہم بچوں والے ہوگئے امی اور ابا دونوں ہی زندگی سے ناطہ توڑ گئے۔ مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھ گئیں مگر ہماری دوستی میں فرق نہ آیا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو اسی طرح ملتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹتے تھے۔ اب کوئی غم، کوئی دُکھ اور پچھتاوہ نہ تھا۔ زندگی پر سکون گزر رہی تھی کہ اچانک زندگی کے پرسکون تالاب میں ایک پتھر آن پڑا اور زندگی کا نظام درہم برہم ہوگیا۔

رابیل بیمار ہوگیا، پیٹ درد کی وہ تکلیف جو اسے کالج کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ دوبارہ شروع ہوگئی۔ پہلے تو اس کے پیٹ میں ہلکا درد شروع ہوا جس کی طرف اس نے خاص توجہ نہ دی، پیٹ درد کی گولیاں کیمسٹ سے لے کر کھالیں۔ مجھے علم ہوا تو میں اسے سول ہسپتال لے گیا جہاں اس کے کئی ٹیسٹ لیے گئے مگر مرض کی تشخیص نہ ہوسکی کیونکہ تمام ٹیسٹ نارمل تھے مگر اس کے باوجود درد کی شدت میں کمی نہیں آرہی تھی۔ کسی نے ایک پرائیویٹ ہسپتال کے بارے میں بتایا کہ وہاں کا ڈاکٹر نہایت ہی قابل ہے، اس کے ہاتھوں میں قدرت نے شفا دے رکھی ہے۔ میں رابیل کو وہاں لے گیا۔ وقتی طور پر اس کے علاج سے آرام آگیا، چندروز بعد دوبارہ تکلیف شروع ہوگئی۔ پھر وہ سرکاری ہسپتال میں داخل رہا مگر وہاں بھی شفا نہ ملی۔ کسی لمحہ تو یوں لگتا تھا کہ جیسے رابیل کو کوئی تکلیف

نہیں ہے، وہ نارمل اور تندرست ہے مگر اچانک جب اس کی لہر اٹھتی تو وہ بے حال ہوجاتا، درد کی شدت سے وہ رونے لگتا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں سے مایوس ہوکر ہم نے درباروں، پیروں اور فقیروں کی طرف رخ کیا۔ درباروں اور مزاروں پر گئے، ہر طرح کی منتیں مانیں مگر سکھ اور چین رابیل سے رُوٹھ گیا۔ اس کی تکلیف کی کسی کو سمجھ ہی نہ آرہی تھی۔ ہر ڈاکٹر، حکیم اور عامل نئی بیماری بتاتا۔ کوئی تبخیر کہتا، کوئی معدے کا السر، کوئی کینسر اور کوئی گیس بتاتا۔ ہر کوئی دعوے سے علاج شروع کرتا مگر ناکام رہتا۔ رابیل نے جو کچھ سروس کے دوران بچایا تھا وہ اس کے علاج پر خرچ ہونے لگا۔ دن بدن اس کا جسم کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر جمع شدہ پونجی بھی ختم ہوگئی تو اس کی بیوی نے ملازمت کرلی۔ میں بھی حسب توفیق اس کی مدد کررہا تھا۔ میں ہر دن اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھا۔ میں نے رابیل کی خاطر اپنا سکھ اور چین قربان کر ڈالا، دفتر سے چھٹی کے بعد میرا زیادہ وقت رابیل کے ساتھ ہی گزرتا۔ جو کوئی کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا بتاتا تھا، میں اسی کے پاس لے جاتا مگر اس کی بدقسمتی کی کوئی دوا بھی کارگر ثابت نہ ہورہی تھی۔ لگتا تھا، رابیل دنوں کا مہمان ہے۔ دن بدن اس کی بھوک ختم ہوگئی، کھانا بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ وہ کوئی چیز کھا ہی نہیں سکتا تھا، کوئی چیز کھاتا تو اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھتا، اس کو قے ہوتی اور کھایا پیا سب کچھ باہر نکل آتا۔ رابیل کی بیوی بھی دن رات اس کی خدمت کرتی اور کبھی اُف نہ کرتی۔ رابیل کے گھر میں اداسیوں، پریشانیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ رابیل کی صورت دیکھ کر وحشت سی ہونے لگتی۔ اس کے بچوں کی حالت بھی نہ دیکھی جاتی، یوں لگتا کہ جیسے وہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہوگئے ہوں، مجھے ان پر ترس آتا، میں ان کو اپنے گھر لے آتا تو وہ میرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتے اور یوں ان کے مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشیاں لوٹ آتیں۔ دوستی نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ رابیل اس بیماری اور زندگی سے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ کبھی کبھی وہ موت کی دعائیں مانگنے لگتا۔ میں ایسے لمحوں میں اسے دلاسہ دیتا، اس کی ڈھارس بندھاتا کہ اوپر والا اس کو ضرور صحت یاب کرے گا مگر وہ زندگی سے مایوس ہوگیا تھا، جینے کی امنگ ختم ہوگئی تھی۔ وہ خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا، بجھا بجھا اور افسردہ سا...... اس کا گلاب جیسا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کونپل سے کوک جدا کردی گئی ہو۔

☆......☆......☆

اس روز میں نزدیکی شہر کے ایک حکیم سے رابیل کی دوا لے کر آیا تھا۔ میں نے لوگوں سے اس کی بہت مشہوری سنی تھی۔ اس نے دوا دیتے وقت دعویٰ کیا تھا کہ اس سے رابیل کے معدہ کی تکلیف ختم ہوجائے گی اور کھانا بھی ہضم ہوجائے گا۔ میں اس کے گھر داخل ہوا تو پتہ چلا کہ بھابھی بازار گئی ہیں، گھر میں رابیل اور بچے تھے۔ میں جب رابیل کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہ کہنے لگا۔

"شکیل! دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگادو۔"

"کیوں؟" بے اختیار منہ سے نکلا۔

"میں نے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ کراہتے ہوئے بے کسی سے بولا...... میں نے کنڈی لگادی۔ اس کے قریب بیٹھ گیا اور حسب معمول اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ رابیل! کون سی ضروری بات کرنی ہے تم نے۔"

"شکیل! مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے، اور رہے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری کوئی بھی خواہش رد نہ کروگے۔ آج اس دوستی کے ناطے میں تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ جو کچھ میں مانگوں گا، لاکردوگے۔"

"تم جان مانگو، رابیل! میں اُف نہ کروں گا۔"

میں نے دعوے سے کہا۔ رابیل نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پھر دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑتے ہوئے بولا۔

"شکیل! میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ میں نہ زندوں میں ہوں اور نہ مردوں میں...... میں موت کی دعائیں مانگ کر تھک گیا ہوں۔ تم۔ تم کہیں سے مجھے زہر لادو، میں اس زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔"

میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے رابیل کے دونوں ہاتھ تھام کر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"یہ کس امتحان میں تم مجھے ڈال رہے ہو دوست؟"

میں نے بھیگی آواز میں کہا۔ ”کیوں دوستی کا نام بدنام کرنے لگے ہو۔نہیں، رابی! میں ایسا نہ کروں گا۔“

”تمھیں اپنی دوستی کی قسم، شکیل!“ وہ میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں دوست! میں ایسا ظلم نہ کرسکوں گا۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے اس طرح مت آزماؤ کہ ساری زندگی میں اپنے آپ سے شرمندہ رہوں۔ ویسے بھی مایوسی کفر ہوتی ہے، حوصلہ رکھو۔“

”اس سے بہتر ہے کہ آج سے دوستی ختم کر ڈالو۔“ رابیل کے الفاظ برچھیوں کے مانند میرے سینے میں اتر گئے۔ وہ اتنا بے درد بن جائے گا، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

”نہیں، رابیل! میں دوستی ختم نہیں کروں گا، میں اس آزمائش میں بھی پورا اُتروں گا لیکن تمہارے بعد جو زندگی میں گزاروں وہ زندگی نہیں، جہنم کی آگ ہوگی جس میں مرتے دم تک جلتا رہوں گا۔ تمہاری بے کسی دیکھ کر میں یہ ظالمانہ قدم اٹھا رہا ہوں، تم نے مجھے عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے۔“

رابیل کے آنسوؤں اور بے کسی نے مجھے مجبور کرڈالا کہ میں اس کی خواہش کی تکمیل کرڈالوں۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ تو رات میں نے جاگتے ہوئے گزاردی۔ میں فیصلہ کی صلیب پر لٹتا رہا صبح تک میں فیصلہ کرچکا تھا کہ میں دوستی کا بندھن ٹوٹنے نہ دوں گا۔ میں نے دفتر سے چھٹی کرلی اور اپنے ایک جاننے والے کی دکان پر چلا گیا۔ وہ دیسی دوائیں فروخت بھی کرتا تھا مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ میں نے پھر اسے رابیل کی موجودہ حالت تفصیل سے بتائی کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، میں اسی کے کہنے پر اس کے لیے کوئی زہر لینے آیا ہوں جو اس کی موت آسان کردے۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد اس نے معقول رقم لے کر ایک ایسا زہر دیا جس میں نیلے طوطے کی آمیزش تھی۔ اس نے یہی بتایا کہ اس کی دو خوراکیں کھانے سے دو دن کے اندر اندر رابیل زندگی کی قید سے آزاد ہوجائے گا۔

☆......☆......☆

رابیل میرا ہی منتظر تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے لیے زہر لے آیا ہوں تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے وہ پڑیا اس کے حوالے کی، استعمال کا طریقہ بتایا، اس کے ساتھ ہی میں رونے لگا۔ میں نے رابیل کے پاؤں پکڑ لیے اور اس سے معافی مانگتا رہا۔ میں نے رابیل سے الوداعی ملاقات کی اور اپنا سب کچھ لٹا کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ میں اپنے آپ سے نادم تھا کہ یہ میں نے کیا کرڈالا ہے، میں اپنے ہی دوست کی زندگی ختم کرنے کا ذمہ دار بن گیا تھا۔

تمام رات میں نے سسکتے تڑپتے گزاردی، اگلا دن بھی یہ منحوس خبر سننے کے انتظار میں گزر گیا کہ رابیل فوت ہوگیا ہے۔ وہ رات اور دن میری زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات بن کر گزرے مگر اب دوسری رات دن ان سے بھی بھاری بن کر گزر رہی تھی کیونکہ حکیم کے کہنے کے مطابق آج کی رات رابیل کی موت یقینی تھی، صبح کا سورج رابیل کی موت کی خبر کے ساتھ طلوع ہونا تھا۔ وہ رات سناٹوں سے لبریز، سوگوار، شرمسار رات گزرتی جارہی تھی۔ میری زندگی کے افق پر بدنصیبی کا سورج طلوع ہونے والا تھا جس کی ایک ایک کرن نے میرے زخمی وجود پر شعلے بن کر برسنا تھا۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے میرے ارد گرد دہکتے ہوئے انگار ڈال دیے ہوں۔ میرے اندر احساسِ ندامت اور پچھتاوے کی آگ بھڑک رہی تھی جس میں میرا وجود بڑی طرح جھلسنے لگا تھا، دُکھ اور درد کی ملی جلی کیفیت نے میرے کرب میں اور بھی اضافہ کرڈالا تھا۔ میری بیوی اور بچے جاگ گئے، ناشتہ کرنے کے بعد اسکول اور کالج چلے گئے مگر میں ابھی تک بستر پر پڑا تھا۔ میری بیوی نے ناشتہ کرنے کو کہا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج میں نے دفتر سے چھٹی لے لی ہے، دیر سے ناشتہ کروں گا۔ وہ بار بار میری پریشانی اور دفتر سے چھٹی کرنے کی وجہ پوچھنے لگی مگر میں اسے مختلف حیلوں بہانوں سے ٹال رہا تھا۔ میں نے اسے بھی نہ بتایا تھا کہ میں دوستی کے ستون میں شگاف ڈال آیا ہوں۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی جس کی آواز گولی کی مانند میرے سینے میں اتر گئی۔ میری بیوی نے جا کر دروازہ کھولا، چند لمحوں بعد وہ لوٹی اور بولی۔

”رابیل بھائی کا بیٹا جواد آیا ہے۔“

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ ابھی جواد، رابیل کی موت کی خبر سنائے گا۔ وہ یہی بتانے کے لیے آیا ہوگا۔ مجھے اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی، یوں لگ رہا تھا کہ رابیل کی موت کی خبر سن کر میں بھی زندہ نہ رہوں گا، میری روح بھی اس کی ہم سفر ہوجائے گی اور یہی دوستی کی معراج ہوگی۔ اتنے میں جواد میرے کمرے میں آگیا۔

”آؤ، بیٹے خیریت تو ہے نا؟“ میں نے لرزتے ہونٹوں سے پوچھا۔

”جی انکل! خیریت ہے۔ ابو نے آپ کو بلوایا ہے۔“

”کیسے ہیں تمہارے ابو؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”پہلے سے کافی ٹھیک ہیں۔“ وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے ہوئے بتانے لگا۔ ”کل رات انھوں نے کھانا جی بھر کر کھایا تھا۔ نہ ہی درد ہوا اور نہ ہی قے ہوئی۔ آج صبح بھی انھوں نے سیر ہو کر ناشتہ کیا ہے۔“

”سچ کہہ رہے ہو بیٹا؟“ میں نے بستر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی انکل! ابو کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہوگئی ہے، اس لیے تو آپ کو بلایا ہے۔“

جواد کی باتوں پر مجھے یقین نہ آیا تھا۔ رابیل کی صحت کی بہتری کی خبر سن کر میری آنکھیں بھر آئیں، میں تو اس کی موت کی خبر سننے کا منتظر تھا مگر اوپر والے نے اس کی زندگی لمبی کردی تھی۔ مارے خوشی کے مرا تمام وجود کانپنے لگا۔ من نے نہ کپڑے بدلے، نہ ناشتا کیا اور جواد کے ہمراہ اس کے گھر روانہ ہوگیا۔ رابیل کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر جواد کی باتوں پر یقین ہوگیا۔ رابیل واقعی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر رابیل کو بازوؤں میں لیا اور اس کی پیشانی چومی اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں رو پڑے ہم دیر تک ایک دوسرے کے گلے مل کر روتے رہے۔ ہمارے وہ آنسو خوشی اور مسرت کے آنسو تھے۔

”یہ کیا معجزہ ہوگیا، میرے دوست؟“ میں نے رابیل سے علیحدہ ہوکر پوچھا۔

تمہاری محبت اور خلوص سے کھلایا ہوا زہر تریاق بن گیا۔ یہ تمہاری محبت اور دوستی کا معجزہ ہی نہیں بلکہ اس مذہب کا بھی معجزہ ہے جو دلوں کو مسخر کرتا ہے، جو آگ میں پھول کھلاتا ہے۔ میں نے اسلام صرف ایک ہستی یعنی تمہارے لیے قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس مالک حقیقی کے لیے اپنایا تھا جو اس کائنات کا پالن ہار ہے، اسی نے مجھے زندگی دی ہے۔“

رابیل کے لہجے میں زمانے بھر کی خوشیاں سمٹ آئی تھیں۔ میں بھی قدرت کے اس کرشمہ پر حیران تھا، اور خوشی بھی کہ پروردگار نے میری اور رابیل کی دوستی کا بھرم رکھ لیا ہے۔ میں اپنے پالن ہار کا شکر گزار تھا، میرے اندر بھی خوشیوں کی برسات ہونے لگی۔ میں جو ندامت اور پچھتاوؤں کی آگ میں جل رہا تھا، خزاؤں میں گھر گیا تھا، اب یک لخت پھولوں سے مہکتے ہوئے چمن میں آگیا۔ سارے موسم دل کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل خوش ہے تو جون جولائی کی لو رگ وپے میں ٹھنڈک کا احساس بن جاتی ہے ورنہ ساون کی بوندیں بھی دل وجان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔ میرا دیا ہوا زہر رابیل کے لیے تریاق بن گیا، اس کی معدہ کی تکلیف ختم ہوگئی۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی بہتر ہونے لگی۔ دو ماہ بعد وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا۔ اس نے پھر سے ملازمت کرلی، خوشیاں اور مسکراہٹیں پھر سے لوٹ آئیں۔ میں دوستی کے امتحان میں سرخرو ہوگیا۔

☆......☆......☆

برسوں بیت گئے ہیں۔ ہم دونوں بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ہماری اولاد شادی شدہ اور بچوں والی ہوگئی ہے مگر ہماری دوستی اب بھی برقرار ہے۔ ہم جب تک ایک دوسرے سے دن میں ایک بار مل نہ لیں ہمیں چین نہیں آتا۔ صبح اب بھی ہوتی ہے، چاند اب بھی نکلتا ہے، شفق اب بھی پھوٹتی ہے، ستارے اب بھی ٹمٹماتے ہیں، آبشاروں کی آواز اب بھی کانوں میں رس گھولتی ہے، کوئل اب بھی کوکتی ہے اور بالکل اس طرح ہماری دوستی بھی جوں کی توں ہے اور مرتے دم تک رہے گی۔

☆☆☆

ڈراپ سین

اقبال بانو

عورت، عورت کی دشمن ہو جائے تو...... ایک یادگار کتھا، دوبارہ سے



عورت بدل جائے تو مرد کو فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی مسئلہ ہے اور جب مرد کا دل بدلے تب عورت بھی جان جاتی ہے کہ اُس کا شوہر کسی اور آسمان کو تسخیر کرنے کا سوچ رہا ہے۔ بعض عورتیں بہت ہوشیار ہوتی ہیں اور فوراً کمند ڈالنا چاہتی ہیں۔

کبیر کے بھی انداز و اطوار بدلے تھے تو طاہرہ کو فوراً پتا چل گیا تھا کہ وہ آج کل کس ڈریم لینڈ میں رہ رہا ہے مگر اُس ڈریم لینڈ کی ملکہ کا اُسے علم نہ ہو پا رہا تھا۔

مگر پھر تیز روشنی ہوگئی، اور وہ لڑکھڑائی ضرور مگر فوراً سنبھل گئی۔ ”سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہوتا رہا اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ کیا لوگ اس طرح محبت کا صلہ دیتے ہیں۔

احسان کا بدلہ اس طرح چکاتے ہیں۔

ارے ثانیہ بیگم تم تو میری دوست تھیں اور دوست ہو کر میری ہی سلطنت پر شب خون مارنا چاہتی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ میں چوکنی ہوگئی ہوں۔ تمہارے ہر حملے کا جواب دوں گی۔“ طاہرہ نے نہایت عزم سے سوچا۔

”تم نے میرے کپڑے نکال دیے؟“ کبیر باتھ روم سے تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے نکلا۔

”کہاں جانا ہے؟“ طاہرہ نے پوچھا۔

”ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”آخر اچانک تمہارے دوست کہاں سے بن گئے؟“ وہ مسکرائی۔

”بس بن گئے۔“ وہ چہکا۔

”پہلے تو دوست ٹائپ کے لوگ تمہیں خرافات لگتے تھے۔“

”وقت وقت کی بات ہے۔“

”اب وقت میں کون سی تبدیلی آگئی ہے۔“ طاہرہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔

”تم نہیں سمجھو گی۔“ کبیر نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم سمجھا دو۔“

”میرا وقت برباد نہ کرو۔“ کبیر جھنجلا گیا۔ جب مرد جواب نہ دے سکے تو یونہی جھنجلا جاتا ہے۔

طاہرہ نے خاموشی سے ہینگر میں سے اس کا آف وائٹ سُوٹ نکال کر دے دیا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا اور جب وہ جا رہا تھا تب طاہرہ نے کہا۔

”کب تک آجاؤ گے؟“

”کیوں؟“ کبیر نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”بچوں کو ٹیوشن سے لانا ہے؟“

”باسط کو بھیج دینا۔“

”وہ میچ کے لیے جا چکا ہے۔“ طاہرہ نے اطلاع دی۔

پہلے اُس سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔“ کبیر تلملا کر بولا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ تم کو بھی کہیں جانا ہے۔“

”خیر، بچوں کو رکشہ پر جا کر لے آنا۔“ کبیر نے حکم سنایا۔ وہ چپ رہ گئی۔ اور کبیر سوزوکی نکال کر لے گیا۔

”ایسی کون سی اہم مصروفیت تھی کہ تم بچوں کو ہی بھول گئے۔“ طاہرہ نے دل ہی دل میں شکوہ کیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ پھر بھی اُس نے حوصلہ نہ ہارا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ایک بار وہ کمزور پڑی تو اُس کے گھر کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔

وہ اندر آئی۔

”میں۔ میں کبیر تمہیں کسی اور کا نہیں ہونے دوں گی اور اگر تم نے چھپ کر میرے اور میرے بچوں کے حقوق کسی اور کو دیے تو میں تمہیں نہ بچوں کی شکل دیکھنے دوں گی اور نہ ہی اپنے گھر میں گھسنے دوں گی اور۔ اور وہ تمہارا بہنوئی اشرف اُس کو تو میں نے ذلیل نہ کیا تو میرا نام نہیں۔“

”لیکن تم کیا کر سکتی ہو طاہرہ۔“ اُسے لگا جیسے کوئی بہت ہی قریب ہو کر اُس سے بولا ہو۔

”بہت کچھ کر لوں گی۔“

کبیر ایسا نہیں تھا۔ اُسے تو اشرف کی صحبت نے خراب کیا ہے۔ طاہرہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ اُس نے طاہرہ کو کسی دوست کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ہر کسی کو بہن، بی بی کر کے بات کرتا تھا۔ اول تو وہ طاہرہ کی دوستوں سے بہت کم بات کرتا بس کبھی کوئی سامنے آگئی تو کہہ دیا۔

”بی بی! کیا حال ہیں؟“

”گھر میں تو خیریت ہے؟“

اور بس۔ اُسے اپنے شوہر پر حد درجہ اعتبار تھا۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ پتا نہیں کیسے مرد ہوتے ہیں جو بدل جاتے ہیں۔ اور اب جبکہ کبیر بدلا تھا تو اُسے معلوم ہا تھا۔

مرد ایسے بدل جاتا ہے۔

کبیر سرکاری ملازم تھا۔ دو سال قبل اُس نے اپنی

آبائی زمین بیچ کر اپنے بہنوئی کے ساتھ کاروبار شروع کیا۔ جننگ فیکٹری میں دونوں حصے دار تھے۔ قدرت نے ساتھ دیا اور پہلے سال ہی خاصا منافع ہوا۔ کبیر نے گاڑی بھی لے لی اور گھر میں آسائشیں بھی مہیا کردیں۔ اشرف اُس کا بہنوئی بھی تھا اور دوست بھی۔ مگر اسرف میں ایک عادت بے حد بُری تھی کہ اپنی ڈھلتی عمر کا لحاظ کیے بغیر وہ عورتوں سے دوستی کرتا اور خوب لٹاتا۔ جب بھی زرینہ آتی،، وہ طاہرہ سے ہی شکوہ کرتی۔ اشرف کی اپنی ٹریولنگ ایجنسی بھی اور اب کبیر کے ساتھ فیکٹری میں پارٹنر تھا۔ مگر گھر میں اُس کا رویہ انتہائی خراب تھا۔

''آپ بھیا پر بھی نظر رکھا کریں۔'' زرینہ نے ایک روز کہا۔

''کبیر تمہارے میاں جیسے نہیں۔'' طاہرہ نے اعتماد سے کہا۔

''مرد تو بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی، صحبت کا اثر تو ہوتا ہے۔''

''خیر، تم فکر نہ کرو۔'' طاہرہ نے نند کو دلاسا دیا۔

اور آنکھیں بند ہی رکھیں کہ اُسے کبیر پر حد درجہ اعتماد تھا اور اُسے یقین تھا کہ کبیر کبھی بھی اُس سے دُور نہیں ہوگا۔ اُس کا حق کسی پر نچھاور نہیں کرے گا، اور یوں بھی وہ چار بچوں کا باپ تھا۔

مگر اُسے علم نہ تھا کہ جب مرد بدلنے پر آئے تو نہ بیوی کی خدمتیں اُس کا راستہ روکتی ہیں اور نہ ہی بچوں کی زنجیر اسے جکڑتی ہے۔ تانیہ سے طاہرہ کی دوستی کالج کے زمانے سے ہی تھی۔

طاہرہ نے انٹر کیا تھا کہ اُس کی کبیر سے شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد بھی اُس کی تانیہ سے دوستی رہی تھی، اور پھر دو سال بعد تانیہ بھی بیاہ کر لاہور چلی گئی۔ مگر جب بھی وہ کراچی آتی تو ملاقات ضرور ہوتی۔ دونوں ملتیں۔ اور طاہرہ، تانیہ کی کئی دعوتیں کر ڈالتی۔

پھر وقت گزرتا رہا۔ طاہرہ بھی بچوں میں مصروف ہوگئی۔ تانیہ اب بھی آتی۔ اُس کی گود میں بڑی پیاری سی گڑیا سی بیٹی جویریہ تھی۔ جو طاہرہ کی بیٹی عائشہ سے صرف چار ماہ ہی چھوٹی تھی۔ طاہرہ کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور بیٹی عائشہ۔ فاروق عائشہ سے بڑا تھا پھر فیروز تھا۔ جبکہ تانیہ کی صرف جویریہ ہی تھی اور جب جویریہ سات برس کی تھی۔ تب تانیہ طلاق لے کر ہمیشہ کے لیے میکے آگئی۔ اُس کے سسرال والوں نے محض اس وجہ سے اسے طلاق دلوائی تھی کہ اُس نے مزید بچے پیدا نہ کیے تھے اور وہ طاہرہ کے کندھے سے لگ کر بے تحاشہ روئی تھی۔

''طاری۔ دیکھو تو۔ مقدر کی بات ہے۔ اللہ میاں ایک بیٹی دے سکتا تھا تو اور اولاد نہ دے سکتا تھا۔''

''تم علاج کرواتیں۔'' طاہرہ نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں نے کوئی کسر چھوڑی ہوگی۔ کتنے ہی ڈاکٹرز کو دکھایا۔ تعویذ گنڈے کیے مگر میرا گھر اُجڑنا تھا۔ سو اُجڑ گیا۔'' تانیہ کی آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی، اُسے دلاسا دیتے دیتے طاہرہ بھی رو دی تھی۔

''چلو، یہ بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔''

''صبر و شکر خدا کو پسند ہے۔ تانیہ نے بھی صبر کیا اور اب تو ان دونوں کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ دونوں ایک جان دو قالب تھیں۔ کبھی کبھی تو تانیہ رات رہنے بھی آجاتی۔ جب کبیر سرکاری دورے پر جاتا تو تانیہ یہیں رہتی تھی۔ اُن کی بچیوں جویریہ اور عائشہ کی دوستی بھی عروج پر تھی۔

یونہی دن گزرتے گئے۔ تانیہ نے بیوٹیشن کا کورس کرلیا اور پھر اپنا پارلر بھی کھول لیا۔ پارلر ٹھیک ٹھاک چلنے لگا تھا۔ اب وہ روپے پیسے کی طرف سے مطمئن ہوگئی تھی۔ تب اُس کی زندگی میں ڈاکٹر شہباز آیا۔ اُسے لگا جیسے شہباز اُس کی منزل ہو۔ ڈاکٹر شہباز بھی شادی شدہ تھا مگر اُس کی بیوی چٹی اَن پڑھ تھی جو گاؤں میں رہتی تھی۔ اُس نے تانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اُسے یہیں رکھے گا اور پہلی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ آپس میں دونوں نے ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں کو قبول کرلیا۔ مگر تانیہ کے والدین نہ مانے کہ ڈاکٹر شہباز شادی شدہ تھا۔

''اب کوئی کنوارہ رشتہ تو ملنے سے رہا۔ میں بھی تو ایک بیٹی کی ماں ہوں۔'' تانیہ کو شدید غصہ تھا مگر وہ اظہار نہ کرسکتی تھی۔ طاہرہ نے بھی تانیہ کی ماں سے بات کی مگر وہ صاف انکار کرگئیں کہ ایسا ممکن نہیں ہے

اور یوں یہ سلسلہ ختم ہوگیا باوجود اس کے کہ ڈاکٹر شہباز نے کہا بھی۔

''ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔''

یہاں تانیہ نے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا اور اُس کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ وہ اپنی بیک مضبوط رکھنا چاہتی تھی۔ قسمت سے وہ بہت ڈری ہوئی تھی، کہ کہیں پھر بے سائبان ہوجائے تو آسرا ہی نہ ہو۔

یوں یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا اور پھر تانیہ نے کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا تھا۔ بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی۔ طاہرہ کے ساتھ اُس کی شدید دوستی قائم تھی۔ اب تو وہ کبیر کے ساتھ بھی ہنسی مذاق کرلیتی تھی۔ بلکہ وہ اُس کے گھر ہی کی فرد بن گئی تھی۔ طاہرہ کو اُس پر بے حد بھروسا تھا۔ لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کا شوہر تیرہ سال کے ساتھ ایک دم ہی بھول جائے گا۔

نئے آسمانوں کی تلاش شروع کردے گا۔

''بعض عورتیں خوب صورت ناگن ہوتی ہیں۔ تانیہ مجھ سے زیادہ حسین تو نہیں۔'' طاہرہ نے سنگھار میز کے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تانیہ کا رنگ ہی تو مجھ سے زیادہ صاف ہے اور کیا ہے اُس میں کبیر، جو مجھ میں نہیں۔''

اُسے شک کبھی نہ پڑتا اگر اُس روز عائشہ کی سالگرہ والے روز کبیر، تانیہ کے ساتھ رقص نہ کرتا اور پھر اُس نے طاہرہ سے کہا تھا۔

''یار! میری اور تانیہ کی ایک یادگار تصویر تو کھینچو۔''

اور طاہرہ اُسی لمحے چونکی تھی اور دو روز قبل کی بات طاہرہ کے ذہن میں گونجی تھی جب رات کو کبیر مووی دیکھتے دیکھتے ایک دم ہی بولا تھا۔

''طاہرہ۔ اگر میں دوسری شادی کرلوں تو؟''

''تو کیا؟'' طاہرہ مسکرائی۔

''کچھ ہوگا تو نہیں؟''

''اونہوں یہ زمین آسمان اپنی جگہ سلامت رہیں گے اور۔''

''اور تم؟'' کبیر نے پوچھا۔

''میں بھی زندہ رہوں گی مگر یہ ایک دم ہی تمہیں شادی کا خیال کیوں آیا؟''

وہ سمجھی کہ کبیر مذاق کر رہا ہے اور پھر بات آئی گئی ہوگی تھی۔ عائشہ کی سالگرہ کے انتظام کی بات ہونے لگی تھی اور وہ بھول گئی تھی۔ اُس نے تو کبیر سے پوچھا بھی نہ تھا کہ آخر وہ کس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر عائشہ کی سالگرہ والے دن تو لمحہ لمحہ کبیر، تانیہ کے ساتھ ہی رہا تھا اور طاہرہ اتنی بے وقوف نہ تھی کہ کچھ نہ جان سکتی۔ اُس کو تو یہ تقریب اور ہلہ گلہ ہی بُرا لگ رہا تھا۔

اور پھر رات کو اُس نے میک اپ اُتارتے ہوئے کبیر سے کہا تھا۔

''تم اُس روز کہہ رہے تھے کہ تم دوسری شادی کرلو تو کیا ہوگا۔''

''ہاں کہا تھا پھر؟'' کبیر نے اُس کی طرف دیکھا۔

''کس سے کر رہے ہو دوسری شادی؟''

''پتا چل جائے گا۔''

''پھر بھی۔'' طاہرہ نے جاننا چاہا۔

''یار! ہے ایک بے سہارا عورت اور طاہرہ! یہ تو ثواب کا کام ہے نا۔ کسی کو سہارا دینا۔''

''ہوں اپنا گھر اجاڑ کر۔''

''کیا مطلب؟'' کبیر نے پوچھا۔ وہ اسٹول سے اُٹھ کر اُس کے قریب آئی اور بولی۔

''کبیر! میں تمہیں دوسری شادی نہیں کرنے دوں گی۔ تم میرے بچوں کا حق کسی اور کو نہیں دے سکتے۔''

''میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

''کوتاہی کی نہیں جاتی خود بخود ہوجاتی ہے مگر مجھے بتاؤ، وہ گشتی ہے کون؟'' طاہرہ کا وجود غصے سے لرزنے لگا۔

''تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اُسے گالی دو۔'' کبیر گرجا۔

''ابھی وہ اس گھر میں آئی بھی نہیں ہے اور تم نے اُس کی حمایت شروع کردی ہے اور جب آ گئی تو۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' وہ ایک دم نرم ہوگیا۔

''میں سب سمجھتی ہوں کبیر۔ میں جانتی ہوں۔'' وہ رو دی۔

اور کبیر نے لائٹ آف کرکے کروٹ بدل لی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ساری رات روتی رہی۔ اور کبیر نے ایک بار بھی اُسے چپ نہ کرایا تھا۔

صبح وہ اُٹھی تو طبیعت میں بوجھل پن تھا۔ رات بھر رونے سے آنکھیں سُرخ تھیں۔ اُس نے اُٹھ کر بچوں کے لیے ناشتا لگوایا۔ اُنھیں اسکول جانے کے لیے تیار کیا اور پھر اُن کی وین آ گئی۔ تب وہ اُنہیں سی آف کر کے اندر آئی تو ٹیبل پر کبیر موجود تھا۔

''آج مجھے ناشتا نہیں ملے گا؟'' وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

''کیوں نہیں ملے گا؟''

''میں نے سوچا ناراض ہو۔''

''نہیں، میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔'' طاہرہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسوؤں کو پیا۔ اور مسکرا کر بولی۔ ''کوئی اپنے آپ سے بھی خفا ہوتا ہے۔ آپ تو میرا اپنا آپ ہیں۔''

''یہ تو ہے۔'' کبیر نے سر ہلایا، تبھی رحمت چاچا نے ناشتا لا کر رکھا۔ حسبِ معمول طاہرہ نے سلائس پر مکھن اور جیم لگا کر کبیر کو دیا۔ پھر اُس کے لیے چائے بنائی۔ وہ ناشتا کرتا رہا اور وہ منتظر رہی کہ شاید کبیر اپنے رات کے رویے پر معافی مانگے، شاید کہے، طاہرہ میں نے مذاق کیا تھا۔ بھلا میں اپنی اتنی خوب صورت زندگی کو تباہ کر سکتا ہوں۔

مگر وہ کچھ بھی نہ بولا۔ ناشتا کر کے وہ واپس کمرے میں گیا اور آفس کے لیے تیار ہونے لگا۔

پھر طاہرہ نے بھی کوئی بات نہ کی کہ وہ آفس جاتے شوہر کو تنگ اور پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ کبیر کے جانے کے بعد بھی وہ پریشان بیٹھی رہی۔ نہ اُس نے لباس بدلا اور نہ ہی میک اپ کیا تھا پھر تانیہ آ گئی۔

''ارے تجھے کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' طاہرہ نے کہا۔

''پھر آج یہ اُداسی۔ یہ اُجڑا اُجڑا روپ۔'' تانیہ نے ہنس کر کہا اور طاہرہ کو لگا جیسے وہ اُس پر ہنس رہی ہو۔

''بس ذرا طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''رات تو ٹھیک تھیں تم۔'' وہ نجانے کیا جاننا چاہتی تھی۔

''بس ذرا تھکن ہے۔''

''میاں سے کھٹ پٹ تو نہیں ہو گئی؟''

''میرا میاں بہت اچھا ہے اگر کھٹ پٹ ہو بھی جائے تو وہ مجھے منائے بغیر آفس نہیں جاتا۔ دن کو ہم لڑ پڑیں تو رات کو مجھے منا کر پھر سوتا ہے۔'' طاہرہ نے زناٹے کا جھوٹ بولا۔

''پھر تو زبردست ہوا۔'' تانیہ مسکرائی۔

''آف کورس۔'' طاہرہ مسکرائی۔ ''تم بیٹھو۔ میں نہا کر کپڑے بدل لوں۔''

طاہرہ اُٹھ گئی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ تانیہ کو کوئی شک ہو جائے اور وہ محتاط ہو۔

پھر ہوا یہ کہ اُس نے پہلے سے زیادہ کبیر کا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا مگر کبیر بدلتا جا رہا تھا۔ اکثر وہ آفس سے غائب ہو جاتا۔ وہ آفس فون کرتی تو پتا چلتا کہ کبیر گھر جا چکا ہے مگر وہ شام ڈھلے آتا اور مصروفیت کا رونا روتا کہ آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ اور وہ خاموش ہو جاتی۔ اور ہمیشہ یونہی ہوتا۔ جب کبیر آفس میں نہ ہوتا تو تانیہ بھی اپنے پارلر سے غائب ہوتی اور وہاں یہی بتا کر جاتی کہ میک اَپ کا سامان خریدنے جا رہی ہے۔ طاہرہ چاہتی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مگر لگتا تھا کہ وہ سانپ اُسی کو ڈس لے گا۔ کبیر بہت آزاد ہو گیا تھا۔ اب تو اُسے بچوں کا احساس بھی نہ تھا۔ جیسے آج وہ چلا گیا تھا۔ طاہرہ کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے مگر رو کر بھی کیا کرتی۔

کبیر جن راستوں پر چل پڑا تھا وہاں سے پلٹنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ تانیہ خود ہٹ جاتی۔ مگر کبیر اور تانیہ کب تسلیم کریں گے؟

یا خدا میں کیا کروں؟

مجھے راہ دکھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ اُس نے ہونٹ بھینچ لیے مبادا چیخ نکل جائے۔

☆......☆......☆

بہت آسان ہے مرنا جب بھی چاہو
مگر جینے میں دشواری بہت ہے
محبت کرنے والوں یاد رکھنا!
یہ جیتی کم ہے ہاری بہت ہے!

رات کو تقریباً گیارہ بجے کبیر آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ لباس بدل کر وہ پلنگ پر آیا تو طاہرہ نے کہا۔

''کھانا لاؤں؟''

''نہیں۔ کھا کر آیا ہوں۔ تم نے کھا لیا۔''

''مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔''

''کیوں بھئی۔ کیا کھا لیا تھا جو بُھوک نہیں۔'' وہ ہنسا۔

اُس کا دل چاہا کہہ دے تمہاری محبت کا زہر پھانکا ہے مگر کچھ نہ بولی۔

''لائٹ آف کر دو، مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ لیٹ گیا۔

''مجھے ایک بات تو بتاؤ۔''

''یار! صبح پوچھ لینا۔''

''پلیز کبیر! ابھی بتاؤ۔'' طاہرہ نے کہا۔

''چلو پوچھو۔'' وہ اُٹھ بیٹھا۔

''مجھے بتاؤ۔ تم کس سے شادی کر رہے ہو؟''

''سچ بتا دوں۔''

''ہاں۔ ہمارے ساتھ کا تقاضا تو یہی ہے۔''

''یار! وہ بہت اکیلی ہے اور طاہرہ! یہ تو ثواب کا کام ہے نا کہ ایک بھٹکتی روح کو گھر مل جائے گا۔ یقین کرو تمھیں کوئی تکلیف نہ ہو گی طاہرہ۔ یہ میرا وعدہ ہے، یہ گھر۔ فیکٹری کا حصہ میں تمہارے نام کر دوں گا۔'' کبیر کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم یہ گھر اور فیکٹری کا حصہ میرے نام کر دو اور کلفٹن والا پلاٹ بھی۔'' طاہرہ نجانے کیا سوچ کر بولی۔

''یہ کام کل ہی ہو جائے گا تم فکر ہی نہ کرو۔ دیکھو نا کسی کی مدد کرنا تو بہت ثواب ہے۔'' اُس نے کہا۔

''ہاں ثواب تو ہے۔ اچھا کر رہے ہو۔ اگر تم جیسے دو چار اور ایسے ہمدرد لوگ ہوں تو دنیا سے برائیاں ختم ہو جائیں۔''

طاہرہ نے کہا اور لائٹ آف کر کے بلب جلایا پھر بیڈ پر لیٹ گئی۔

کبیر بھی سونے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ طاہرہ کو تو لگ رہا تھا جیسے وہ انتہائی بے چین ہو صبح ہونے کے انتظار میں۔

دوسرے روز کبیر کا موڈ بے حد اچھا تھا۔ اُس روز کبیر نے بہت مصروف دن گزرا۔ سارے کاغذات بنوائے اور پھر دوسرے روز وہ چھ سو گز کی کوٹھی، فیکٹری کا حصہ اور کلفٹن کا ایک ہزار گز کا پلاٹ کبیر اُس کے نام کر چکا تھا۔ اُس کا ذرا بھی موڈ خراب نہ تھا۔ اس نے یہ سب کچھ جلدی جلدی کر دیا۔ طاہرہ نے وہ کاغذات لاکر میں رکھ دیے۔ پتا نہیں اُس کے ذہن میں کیا تھا۔

دوسرے روز شام کو چائے پیتے ہوئے کبیر نے کہا تھا۔

''تو اب مجھے شادی کی اجازت ہے؟''

''کبیر! مجھے بتاؤ تو وہ کون ہے۔'' جاننے کے باوجود وہ خود شوہر کے منہ سے سُننا چاہتی تھی۔

شاید جو میں سمجھ رہی ہوں، وہ غلط ہو، تا مرُج تو دوست ہے مگر کبیر نے بھی کہہ ہی دیا۔

''وہ تانیہ ہے۔''

''اچھا'' اُسے واقعی حیرت نہ ہوئی تھی۔

''تمھیں حیرت نہیں ہوئی۔''

''حیرت کی کیا بات ہے۔ تم تو ثواب کمانا چاہتے ہو نا۔''

''ہاں طاہرہ! دیکھو نا۔ وہ تمہاری دوست بھی تو ہے

معجزے

☆ حضرت موسیٰؑ اپنے لعاب سے کوڑھیوں کو شفا دیتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے لعاب سے فرعون کی بیٹی کے برص کے داغ ٹھیک ہو گئے تھے۔

☆ حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت شعیبؑ نابینا تھے۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت شعیبؑ سے اللہ نے روزِ حشر اپنے دیدار کا وعدہ کیا ہے۔

☆ صبرِ جمیل حضرت ایوبؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مشہور ہے۔

☆ جیسے حضرت عیسیٰؑ نے اپنی والدہ کے لیے گواہی دی تھی اسی طرح پالنے میں پڑے بچے نے بھی حضرت یوسفؑ کے کردار کے بارے میں گواہی دی تھی۔

☆ حضرت ادریسؑ اور حضرت عیسیٰؑ دنیا سے زندہ گئے۔ حضرت الیاسؑ کے بارے میں بھی یہی شبہ ہے۔

(حسنِ انتخاب۔ رازِ عدن، بحرین)

ایڈجسٹ کرلے گی۔ اور پھر کسی کی مدد کرنا اچھی بات ہے اور۔''

''کبیر! تمہاری خالہ زاد نائلہ پچھلے چار سال سے بیوگی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اُس کے تین بچے ہیں۔ لوگوں کے برتن دھو کر وہ بچوں کو پال رہی ہے۔ اچھی بُری نظروں کی زد میں رہتی ہے وہ۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ثواب کمانا ہے تو نائلہ سے شادی کرلو۔''

''کیا؟'' کبیر کو لگا جیسے طاہرہ نے اُسے کھولتے کڑاہے میں ڈال دیا ہو۔

''ہاں کبیر! تم نائلہ سے شادی کرلو۔ میں اُسے اپنے ساتھ رکھ لوں گی مگر۔ مگر میں تانیہ کو اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی اور سُن لو کہ یہ میرا گھر ہے۔ یہ میرے بچوں کا حق ہے۔ میں تانیہ کو یہ حق نہیں چھیننے دوں گی۔ تم اُس سے شادی کرلو بے شک، مگر کبیر یاد رکھنا میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ تم کرلو تانیہ سے شادی۔ اُس دوست نما دشمن کو اپنا لو۔'' طاہرہ نے کہا اور وہ اندر چلی گئی۔

کبیر کچھ بھی نہ بولا اور پھر وہ تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

''طاہرہ۔'' رات کے پچھلے پہر جب وہ سوئی ہوئی تھی اور کبیر جاگ رہا تھا۔ کہ ایک دم ہی اُسے پکار بیٹھا۔

''جاگ رہی ہو ناں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں جاگ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''مجھے۔ معاف کردو گی تم۔'' کبیر اُداس تھا۔

''کیا خطا ہے تمہاری، یہ تو تمہارا حق ہے کبیر! کرلو شادی۔'' طاہرہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور لائٹ جلادی۔

''میں۔ میں شادی نہیں کررہا۔''

''کیوں؟'' طاہرہ حیران تھی۔

''مجھے تم جیسی وفا شعار بیوی نہیں مل سکتی۔ تم میری بیوی ہو، میرے بچوں کی ماں ہو میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تم مجھے چھوڑ کب رہے ہو۔ تم تو شادی کر رہے ہو۔'' طاہرہ نے حیرت سے کہا۔

''میں شادی کرنا چاہتا تھا مگر۔ مگر تانیہ کہتی ہے، میں تمہیں چھوڑ دوں۔'' کبیر نے بتایا۔

''اوہ۔'' طاہرہ کے لب سکڑ گئے۔

''تو پھر۔''

''میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تانیہ تمہاری محبت ہے۔ میں تو بیوی ہوں۔''

''محبتیں بہت مل جاتی ہیں مگر تم جیسی بیوی نہیں ملے گی۔ پلیز طاہرہ! میری خطا معاف کردو۔'' کبیر نے ہاتھ جوڑ دیے اور طاہرہ پگھل گئی۔

بس اتنا ہی کافی تھا، اُس نے کبیر کے بندھے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیے اور بولی۔

''کوئی بات نہیں کبیر، کبھی کبھی غلطی انسان سے ہو جاتی ہے، کہ انسان خطا کا پُتلا ہے۔ بس ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔''

اور کبیر نے سکون کا سانس لیا کہ اُس کا گھر سلامت رہا۔ اب وہ دونوں خوش ہیں اور کبیر نے کبھی بھی طاہرہ کو نہیں بتایا کہ تانیہ سے کیوں لڑائی ہوئی تھی۔

وہ تحفظ چاہتی تھی۔

وہ محبت کے سہارے زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کبیر گھر یا فیکٹری کا حصہ اُس کے نام کردے اور جب کبیر نے بتایا کہ اُس نے تو سب کچھ طاہرہ کو دے دیا ہے تو وہ پھٹ پڑی۔

''اب یہاں کیا لینے آئے ہو۔ جاؤ اپنی طاہرہ کے پاس، کنگلے، جیسے میں اتنی فالتو ہوں کہ پکے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آ گروں گی، ہونہہ۔''

اور پھر وہ ''فور سیزن'' سے اُٹھ کر چلی گئی تھی، کبیر کی آنکھوں سے سارے پردے یک دم ہی اُٹھتے چلے گئے تھے۔ اُسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل تھا۔ خواب بکھر گئے تھے۔ مگر وہ خوش تھا کہ جلد اس کہانی کا ڈراپ سین ہو گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ طاہرہ کا اعتماد پالے گا مگر ایسا نہ تھا۔ ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد طاہرہ سنبھل گئی تھی اور اب اس نے اپنی ساری دوستیاں ختم کردی تھیں۔ کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ اور طاہرہ دوبارہ اُس سانحے کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

ناسور

نسرین اختر نینا

اُس دوشیزہ کی عبرت انگیز کتھا جس کے غرور اور گھمنڈ
اُسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا مگر......

''سنو فردوس آپا تم آنکھیں بند کرکے عزیز بھائی کے ہاں اپنے بچوں کے رشتے طے کرلو۔ اس طرح تمہاری بیٹی بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی اور بیٹے کا بھی گھر آباد ہو جائے گا۔'' فردوس بی بی کی بڑی بہن ثمر



جہاں نے مشورہ دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے ثمر! مگر یہ دیکھو نا کہ میری بیٹی، نورین اس قدر حسین ہے، ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ لمبا قد، دبلی پتلی اسمارٹ ہے، پھر خیر سے ایف اے تک پڑھی ہے، اور دوسری طرف عزیز بھائی کا بیٹا موٹا بھدا، پستہ قامت، سیاہ کالا رنگ اور پڑھائی کا یہ حال ہے کہ پرائمری پاس کرنے سے پہلے ہی اسکول سے بھاگ نکلا تھا۔ نا کوئی ڈھنگ کا کام کرتا ہے۔ کریانے کی دوکان پہ نمک مرچ بیچنے والا پھر دوکان بھی اپنی نہیں ہے...... چند ہزار روپے پہ غلامی کرتا ہے۔ نا بہن نا! میری ایک ہی تو نازوں سے پلی بیٹی ہے وہ مجھ پر بوجھ نہیں ہے بہن، جو میں اسے یوں اٹھا کر پھینک دوں۔ میں اس بات کو پسند نہیں کر رہی تو میری بیٹی بھلا کیسے پسند کرے گی ایسے بے ڈھنگے شخص کو۔“ فردوس نے منہ بنا کر کہا۔

”دیکھو میں تو تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری بیٹی کا اور عزیز بھائی کے بیٹے انیس احمد کا کوئی جوڑ نہیں مگر سوچو کہ ہیں تو اپنے ہی نا۔ اپنے ماریں گے بھی تو چھاؤں میں پھینکیں گے۔ اور پھر باہر سے تمہیں کون سا شہزادہ مل جائے گا۔ یوں بھی معمولی سی مڈوائف کی بیٹی کو کوئی بہت پڑھا لکھا یا دولت مند گھرانہ تو بہو بنانے سے رہا۔ شادی تو تم نے اس کی خاندان میں ہی کرنی ہے اور عزیز بھائی کے بیٹے کے سوا اور کسی کا بیٹا تمہاری بیٹی کی عمر کے مطابق نہیں ہے تم نے پہلے ہی اسے پڑھوانے اور مختلف کورسز کروانے کے چکر میں اس کی عمر گزار دی ہے۔ خیر سے اب چوبیس سال کی ہو رہی ہے میری بشریٰ اس کی ہم عمر ہے اور آٹھ سال ہو گئے ہیں اس کی شادی کو۔ ماشاء اللہ چار بچوں کی ماں ہے وہ۔ جب اس کی شادی کی تھی تو سولہ سال کی تھی وہ اور فرحان بیس سال کا تھا تب وہ میٹرک کر کے بے روزگار پھر رہا تھا۔ بیوی کے قدم ایسے مبارک ثابت ہوئے کہ دبئی میں ملازمت مل گئی۔ اور اب وہ پیسوں میں کھیل رہا ہے۔ فرحان کی شکل وصورت بھی انیس کے ہی جیسی ہے جبکہ میری بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ لڑکے کی شکل وصورت کے بجائے اس کے خاندان کو دیکھنا چاہیے آگے لڑکی کی مقدر کی بات ہے۔“ ثمر جہاں نے بغیر لگی

بیٹی کے بہن کو تفصیل سے کہا۔

”مجھے عزیز بھائی کے گھر رشتہ کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے کیونکہ ان کی بیٹی سمیرا ماشاء اللہ پڑھی لکھی اور خوبصورت ہے۔ سلیقہ مند اور امور خانہ داری میں بھی ماہر ہے۔ دوسری طرف میرا بیٹا بھی لاکھوں میں ایک نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے، ماشاء اللہ ایف اے پاس ہے۔ اچھی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے۔ اس رشتے پر تو میں ہر طرح سے رضامند ہوں مگر بات نورین کی ہے۔ وہ کسی صورت بھی انیس احمد کے لیے نہیں مان رہی اور ایسی صورت میں عزیز بھائی، بیٹی کا بھی رشتہ نہیں دیں گے۔ ہاں ایک صورت ہے اگر عزیز بھائی رضامند ہو جائیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“ فردوس بی بی نے کچھ سوچ کر کہا۔

”وہ کیا......؟“ ثمر جہاں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اگر عزیز بھائی اپنے چھوٹے بیٹے اظہر علی کے لیے مان جائیں تو نورین کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

خدا کا خوف کرو آپا! کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ بیچارہ اظہر ابھی پندرہ سولہ سال کا بچہ ہے ابھی تو اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا ہے وہ۔ سارے خاندان میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین بچہ ہے۔ اس کے تو بڑے بڑے ارادے ہیں، وہ پڑھ لکھ کر افسر بننا چاہتا ہے۔ اور اس کے لیے اسے کم از کم آٹھ دس سال درکار ہیں تو تب تک تمہاری بیٹی کی عمر کہاں پہنچ جائے گی۔“ ثمر جہاں نے اپنی بڑی بہن کی انہونی خواہش پہ حیران ہو کر کہا۔

”بس، بس ثمر! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ تم جا کر عزیز بھائی سے بات کرو اگر وہ مان جاتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مجھے اپنی بیٹی بوجھ نہیں ہے۔ بھلے ہی شادی نہ ہو مگر جانتے بوجھتے میں اسے جہنم میں نہیں جھونک سکتی۔“ فردوس بی بی نے حتمی لہجے میں کہا۔

......☆☆☆......

پھر جب ثمر جہاں نے اپنے بھائی عزیز احمد کو فردوس بی بی کا پیغام دیا تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

دونوں بھائی بہن کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور انہوں نے آپس میں ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ مگر فردوس بی بی نے بھائی کی ناراضگی کی بھی پروا نہ کی، اور اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کے لیے رشتے تلاش کرنا شروع کر دیے۔ چونکہ باقی خاندان کی نسبت وہ خوشحال تھی۔ ایک تو سرکاری اسپتال میں مڈوائف تھی۔ وہاں تنخواہ کے علاوہ اوپر کی بھی اچھی خاصی آمدنی تھی۔ جس کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا وہ خوشی خوشی مٹھائی، فروٹ اور ہزاروں روپے اور سوٹ وغیرہ دیتا۔ اور اسپتالوں میں تو روز ہی لوگوں کے ہاں بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لیے فردوس بی بی کے وارے نیارے تھے۔ اکثر بخشش کی رقم تنخواہ سے زیادہ ہو جاتی تھی اس کے علاوہ بھی گائنی وارڈ میں داخل مریضوں سے چائے پانی کے نام پہ سو دو سو تو روز ہی اینٹھتی تھی۔

جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد فردوس بی بی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ بے سہارا ہو گئی تھی۔ شوہر ایک معمولی سا مزدور تھا جو کماتا تھا ساتھ ساتھ ہی خرچ ہو جاتا تھا۔ کوئی جمع پونجی بھی نہیں تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جس میں وہ ساس سسر کے ساتھ رہتی تھی۔

شوہر کے باقی بھائی بہن شادی شدہ تھے۔ اور اپنے اپنے گھر میں مقیم تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بوڑھے ساس سسر کا ساتھ تھا اور فردوس بی بی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بیوگی کے یہ پہاڑ سے دن کیسے بسر کرے گی؟ بچوں کو کہاں سے کھلائے گی......؟

اس نے گاؤں کے اسکول سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ سلائی کڑھائی کا کام بھی جانتی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس سے اس کو اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ اپنے لامحدود اخراجات پورے کر سکے۔ پھر اس کی ملاقات اپنی دور پار کی ایک رشتے دار رقیہ عالم سے ہوئی۔ رقیہ عالم شہر کے ایک گورنمنٹ ہاسپٹل میں مڈوائف تھی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں سے اپنے والدین سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ وہ پہلے گاؤں

میں رہتی تھی۔ یہیں پلی بڑھی تھی پھر جب عالم مغل سے اس کی شادی ہوئی تو وہ شہر چلی گئی۔ رقیہ نے گاؤں میں فردوس کے ساتھ ہی مڈل کلاس پڑھا تھا۔ پھر جب وہ شہر گئی تو اس کا شوہر جو کہ وہاں ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں کمپوڈر تھا۔ اس نے کسی طرح اپنے سینیئر سے کہہ کہلا کر تیس چالیس ہزار روپے رشوت دے کر رقیہ کو ہسپتال میں مڈوائف کے کورس میں بھرتی کروا دیا۔ جب تک ٹریننگ لیتی رہی تب تک صرف وظیفہ ہی ملتا تھا۔ جب ٹریننگ مکمل ہو گئی تو ہسپتال میں اسے مکمل ملازمت مل گئی اور ساتھ ساتھ تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ملنے لگی اور اوپر کی آمدنی کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ جب کوئی شخص رشوت اور سفارش کے بل بوتے پر نوکری حاصل کرے گا تو پھر ڈٹ کر خود بھی بے ایمانی کرے گا۔ اور اوپر کی آمدنی کے لیے اپنے فرائض سے زیادہ تگ و دو کرنے لگتا ہے۔ عالم مغل تو پہلے ہی اس کام میں ماہر تھا۔ مریضوں کو جعلی یا دو نمبر دوائیاں دینا اور اصلی دوائیاں بازار میں فروخت کر دینا تو عام بات تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بڑے بڑے ہاتھ مارتا تھا۔ اپنے جیسے کرپٹ افراد کے ساتھ مل کر خوب دولت اکٹھی کر رہا تھا۔

چند سالوں میں شہر میں اپنا مکان بنا لیا اور پھر جب بیوی کو بھی ملازمت مل گئی تو پھر اس کے اور بھی وارے نیارے ہو گئے۔ رقیہ کو اس بات میں بھی مہارت حاصل تھی کہ کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا اور کسی اور خاتون کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو وہ بڑے ماہرانہ طریقے سے لڑکے کے خواہش مند افراد سے بھاری رقم لے کر بچے تبدیل کر دیتی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی ہونے نہ دیتی۔

ایک مرتبہ اس کے کسی بے اولاد جوڑے کو کسی کا بچہ بھی چوری کر کے دیا تھا۔ مگر بہت بڑی مشکل میں پکڑے جاتے جاتے بچی تھی۔ اور عالم کو بھی اس بات پر بڑا برا بھلا کہا تھا۔ دوسروں کے بچے تبدیل کرنے اور بلاوجہ امیر وغریب کہا بلکہ زیادہ تر تو سرکاری ہسپتال میں غریب اور کم آمدنی والے ہی ہوتے ہیں مگر یہ سرکاری ہسپتال کا نچلا عملہ انہیں بھی نہیں بخشتا اور چائے پانی کے نام پر ہر وقت ان سے رقمیں بٹورنے

کے چکر میں لگا رہتا ہے۔ پھر جب ڈاکٹر چیک کرکے ان کے مرض کی نوعیت کے مطابق انہیں ہسپتال میں داخل کر دیتا ہے۔ تو پھر وارڈ میں بستر ہی نہیں ہوتے۔ لواحقین بے چارے ہسپتال کے برآمدوں اور باہر لان میں اپنے شب و روز گزارتے ہیں۔ مریضوں کی وارڈ میں چیکنگ کے لیے زیادہ تر ہاؤس جاب کرنے والے ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں اور اگر کوئی ہاسپٹل کسی میڈیکل کالج کے ساتھ اٹیچ ہوتا تو پھر میڈیکل اسٹوڈنٹس اپنی ٹریننگ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے گاہے بگاہے آکر مریضوں کو ڈسٹرب کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی احتجاج کرتا تو ڈیوٹی ڈاکٹر پکا سا منہ بنا کر کہتے ہیں کہ بھئی جب ہم نا رہیں گے تو پھر یہ لوگ ہی آپ لوگوں کا علاج کریں گے اور علاج کرنے کے قابل تب ہی ہوں گے جب انہیں دوران تعلیم عملی تربیت کا موقع ملے گا۔"

یہ ماہر ہو جائیں گے تو پھر ہسپتال میں مریضوں کو چیک کرنا ان کی شان کے خلاف ہوگا تب اپنے پرائیویٹ کلینک، پرائیویٹ ہاسپٹل یا پھر اپنے ہاسپٹلز میں دولت مندوں سے دولت اکٹھی کرنے کے چکر میں پڑ جائیں ہیں۔

......☆☆☆......

"رقیہ نے جب فردوس کو مڈ وائف بننے کے اصول و قواعد سے آگاہ کیا تو وہ فوراً اس کے لیے تیار ہو گئی۔ پھر ساس سسر کو رضا مند کرکے شہر چلی گئی۔ وہاں عالم نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ وہ اسی صورت میں مڈ وائف بننے کا خواب پورا کر سکتی ہیں جب وہ کم از کم پچاس ہزار روپے کی رقم لے کر آئے گی۔ تب فردوس مایوس ہو کر گاؤں لوٹ آئی تھی۔ اس کے سسر نے اپنی آبائی زمین فروخت کرکے اس کو پچاس ہزار روپے دے دیے تھے اور پھر چند سالوں میں ہی اس نے کئی ہزار روپے کما لیے۔

فردوس کی رہائش گاؤں میں تھی۔ اس لیے ہر روز وہ شہر جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے مستقل تانگہ لگوا لیا تھا۔ جو اس کا دیور چلاتا تھا۔ اس طرح اسے شہر آنے جانے میں آسانی ہونے لگی۔ ویسے بھی گاؤں شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے اپنے تینوں بچوں کو بھی شہر کے ایک اسکول میں داخل کروا لیا تھا۔ اس طرح بیٹی نے بھی ایف اے کر لیا۔

بڑے بیٹے نے بھی ایف اے کر لیا اور فردوس نے اپنے ایک سینئر ڈاکٹر سے کہہ کر اسے ایک دوائیوں کی کمپنی میں لگوا دیا تھا۔ جبکہ چھوٹا بیٹا ابھی میٹرک میں زیر تعلیم تھا۔

فردوس کسی کی دست نگر نہیں تھی۔ خود کماتی تھی۔ اس لیے وہ من مانی کرنے کی عادی تھی۔ چنانچہ اپنے بچوں خاص کر اپنی بیٹی کی تربیت بھی اسی طرح کی تھی۔ کہ وہ خود پسند اور خود سر ہو چکی تھی۔ اور اپنے علاوہ کسی کو کچھ گردانتی نہیں تھی۔ ایک تو خوبصورت تھی۔ پھر شہر کے اچھے اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود اچھے سے اچھا جدید فیشن کا لباس پہنتی تھی۔ اس کے گاؤں میں چند ایک خوشحال گھرانوں کی لڑکیوں کے علاوہ کسی نے بھی کالج کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ گھر بھی ماں نے خاصا اچھا اور ماڈرن طریقے کا بنوا لیا تھا۔ بھائی بھی کماتا تھا۔ اس لیے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بھائی کی تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی ملتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آمدنی بھی معقول تھی۔ اس لیے سارے گھرانے کو اپنی دولت اور حیثیت کا گھمنڈ تھا۔

فردوس کا گھرانہ سارے خاندان اور گاؤں میں خاصا معزز سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کے دماغ نہیں ملتے تھے۔ اب چونکہ گاؤں میں زیادہ تر رواج عزیز رشتے داروں اور خاندان ہی میں شادی کا ہوتا تھا بلکہ فردوس کے خاندان میں وٹے سٹے کا زیادہ رواج تھا لوگ سمجھتے تھے کہ اس سے رشتے ناتے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔ خواہ بعد میں اس کے نتائج کیسے ہی مضر کیوں نہ ہوں......؟

فردوس نے اگرچہ اپنے بچوں کو کسی قسم کی محرومی کا کوئی احساس تو نہیں ہونے دیا تھا اور بیوگی کے باوجود خود محنت مشقت کرکے پالا پوسا تھا۔ مگر چونکہ ایک تو اس نے پیسہ کماتے ہوئے حرام و حلال اور جائز ناجائز کا خیال بھی نہیں رکھا تھا، دوسرے بچوں کی تربیت اچھی نہیں کی تھی۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ خناس بھر دیا تھا کہ وہ خاندان بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت، لائق فائق پڑھے لکھے اور خوشحال ہیں اس لیے وہ خود پسند، خود غرض اور متکبر ہو گئے تھے اور اپنے علاوہ کسی اور کو نہیں گردانتے تھے۔ اسی لیے خاندان میں جہاں کہیں وہ ان کے رشتے کرنے کی کوشش کرتا کوئی نا کوئی عیب نکال کر انکار کر دیتے تھے۔ بالآخر رقیہ بیگم ہی ان کے کام آئی اور اس نے اپنی میٹرک پاس بیٹی عافیہ جو نرسنگ کی ٹریننگ کر رہی تھی، کا رشتہ فردوس نے اپنے بیٹے فائق علی سے طے کر دیا۔

شادی پانچ سال بعد عافیہ کی ٹریننگ کی تکمیل کے بعد طے پائی تھی۔ جبکہ نورین کا رشتہ رقیہ نے اپنے بیٹے ابرار احمد سے طے کر دیا۔ ابرار احمد گذشتہ ایک سال سے کینیڈا میں مقیم تھا اور وہ وہاں کمپیوٹر کا کوئی کورس بھی کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی پارٹ ٹائم جاب کر رہا تھا۔

فی الحال اس کا اگلے پانچ سال تک پاکستان واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فردوس کو بھی بیٹی کی شادی کی اتنی جلدی نہیں تھی ویسے بھی چونکہ وٹے سٹے کا رشتہ تھا، اس لیے دونوں کی شادی اکٹھی ہی کرنی تھی۔ رقیہ کے بچے بھی عادتوں، تعلیمی لحاظ اور شکل و صورت میں فردوس کے بچوں جیسے ہی تھے۔ فردوس کو اپنی بہن ثمر جہاں کے ہاں، بچوں کے رشتے نا ہونے کا اگرچہ دل میں رنج ضرور تھا کہ اس طرح بہن اس سے ناراض ہو گئی تھی اور دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ مگر بچوں کی مرضی کے سامنے بے بس تھی۔ کئی بار اس نے اپنی بہن کو کہلوایا تھا کہ وہ دل میلا نہ کرے۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی ہی سے کرے گی جو خوبصورت تھی اور پڑھ بھی رہی تھی۔

مگر جواب میں ثمر جہاں نے کہلا بھیجا تھا کہ اس کے بچوں کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ اب ایسا سوچے بھی نا بھی۔" اس پہ فردوس دکھی ہو گئی۔ ایک طرف اولاد تھی دوسری جانب ماں جائی۔ وہ دونوں کو ہی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اپنی ہی تربیت یافتہ خود سر اولاد نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔

ثمر جہاں نے چند ماہ کے اندر اندر ہی اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں اپنے دیور کے ہاں کر دیں۔ جبکہ فردوس کے بچوں کو ابھی پانچ سال تک انتظار کی سولی پہ لٹکنا تھا۔

......☆☆☆......

اور پھر پانچ سال بعد جب رقیہ کی بیٹی عافیہ نے بی ایس سی نرسنگ کی ڈگری مہینے کے بعد ایک سال کا تجربہ بھی حاصل کیا۔ تو اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ ایف اے پاس معمولی سی پرائیویٹ نوکری کرنے والا ابرار احمد اس کی نظروں سے گر گیا۔ اور اس نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف اس کے بھائی فائق نے بھی کینیڈا میں مقیم ایک انڈین فیملی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر لی۔ اور پاکستان واپس آنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح فردوس کے دونوں بچے انتظار کی سولی پہ لٹکنے کے باوجود اپنے پسندیدہ منگیتروں سے محروم ہو گئے تھے۔ نورین جو کہ دن رات کینیڈا جانے کے سپنے بنتی رہتی تھی، شدید مایوس ہو گئی۔ دکھ اور مایوسی سے نڈھال ہو کر کافی عرصے تک بیمار رہی تھی۔ دوسری طرف ابرار بھی کماؤ کا بھی یہی حال تھا۔

ایک مرتبہ پھر فردوس بھائی کے در پر گئی اور اس کے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کے لیے دامن پھیلا دیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ عزیز احمد کا چھوٹا بیٹا علی احمد ایک تو خوبصورت تھا اور پھر اس نے بی اے کیا تھا اور پی ٹی سی ایل میں اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی رہائش بھی شہر میں تھی۔ مگر وہ نورین سے پورے آٹھ سال چھوٹا تھا جبکہ نورین کی عمر تیس سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ یہی حال عزیز احمد کی بیٹی نازیہ کا تھا اس کی عمر بمشکل بیس سال تھی۔ اور اس نے ایف اے کرکے سلائی کڑھائی کا ڈپلومہ کیا تھا۔ اور سرکاری ٹیکنیکل کالج میں سلائی ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر رہی تھی۔ وہ ابرار احمد سے تقریباً بارہ تیرہ سال چھوٹی تھی۔ مگر عزیز احمد کی بہن کی منت سماجت اور التجاؤں پہ پسیج گیا۔ وہ پہلے بھی اتنے سالوں تک بہن سے ناراض رہنے اور نا ملنے کی وجہ سے پریشان رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو ان کے رشتوں کے لیے رضامند کر لیا۔ انہوں نے بھی سوچا کہ اگر اس طرح برسوں



سے روٹھے ہوئے دونوں بہن بھائی آپس میں مل بیٹھیں تو یہ مہنگا سودا نہیں۔

اور نورین بھی ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کے سپنے دیکھنے لگی۔ یوں بھی وہ اس کے بڑے بھائی کی نسبت علی کو زیادہ پسند کرتی تھی وہ ابرار احمد سے بھی زیادہ خوبصورت اور سلجھا ہوا تھا مگر علی احمد ابھی اتنی جلدی شادی نہیں کرنی چاہتا تھا۔ وہ پہلے کچھ عرصے باہر جا کر خوب ڈھیر سارا روپیہ کمانا چاہتا تھا۔ شہر میں اپنا شاندار مکان بنا کر اپنا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور وہ اتنی جلدی شادی کے جھمیلوں میں پڑنے کے حق میں نا تھا اس کے ایک دوست نے اس کے لیے سعودی عرب سے ویزا بھجوا دیا۔ اور وہ وہاں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس پر یہی فیصلہ ہوا کہ فی الحال فائق اور نازیہ کی شادی کر دی جائے جبکہ نورین اور علی احمد کا نکاح ہو جائے اور پھر جب وہ وہاں سیٹ ہو جائے تو نورین کی رخصتی کر کے اسے سعودی عرب بھیج دیا جائے۔"

علی احمد کے سعودی عرب جانے سے پہلے فائق اور نازیہ کی شادی تو ہو گئی مگر علی احمد نے فی الحال نکاح کروانے سے انکار کر دیا چونکہ پڑھا لکھا جوان بیٹا تھا۔ سمجھدار، اچھا اور فرماں بردار تھا۔ اس لیے عزیز احمد اسے زیادہ مجبور کرنا مناسب نا سمجھا۔ اور فردوس کو بھی سمجھا دیا کہ چند سالوں کی ہی تو بات ہے، جہاں اتنا عرصہ نورین بیٹی تمہارے پاس رہی کچھ عرصہ اور سہی۔ اب تو وہ تمہارے پاس علی احمد کی امانت کے۔"

اس پہ فردوس نے مجبوراً کہا "ٹھیک ہے عزیز بھائی! شاید میری بیٹی کے مقدر میں ہی انتظار کرنا لکھا ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں علی احمد بھی ابرار کی طرح باہر سے آ کر میری بیٹی کو اپنانے سے انکار نہ کر دے۔ اس لیے میں چاہتی تھی کہ کم از کم نکاح ہو جائے تا کہ دونوں ایک بندھن میں بندھ جائیں۔" فردوس نے قدرے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی تھا کیونکہ نورین مجھے اپنی نازیہ، فرح اور ناجید کی طرح ہی عزیز اور پیاری ہے مگر کیا کروں جوان اولاد پہ زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کی جا سکتی۔ اس کا تمہیں بھی بخوبی تجربہ ہے۔

البتہ میں ایک بات وثوق سے کہتا ہوں کہ علی احمد بہت نیک اور سعادت مند ہے۔ وہ ابرار احمد جیسا نہیں۔ وہ اپنے بڑوں کے قائم کردہ رشتے کی لاج رکھے گا۔ پھر اسے یہ بھی علم ہے کہ اس میں اس کی بہن کا بھی مسئلہ ہے۔ اگر وہ نورین بیٹی کو چھوڑے گا، فائق بیٹا نازیہ بیٹی کو چھوڑ دے گا۔ وٹے سٹے کے رشتے کا یہی تو فائدہ ہے کہ رشتے مضبوط ہوتے ہیں اور بچے شادی کے سلسلے میں من مانی نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ رقیہ بہن کے بچوں نے کیا۔ خود دونوں نے اپنا گھر بسا لیا اور تمہارے دونوں بچوں کو ٹھکرا کر پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ مگر انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا یہ تمہارے بھائی کا تم سے وعدہ ہے۔ آگے بچوں کی قسمت۔" عزیز احمد نے بہن کو تسلی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

اگرچہ فردوس بی بی مطمئن تو نہ تھی کہ دل میں عجیب سا دھڑکا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ کسی کو مجبور نہیں کر سکتی تھی اسے اپنی بیٹی کی بڑھتی ہوئی عمر خائف کر رہی تھی۔ آج وہ تیس سال کی تھی علی احمد کے واپس آنے تک چھتیس سال کی ہو جاتی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ علی احمد نے اس کی زیادہ عمر کا بہانہ کر کے اس کو ٹھکرایا تو نہیں تھا اور اس پر وہ اس کی دل ہی دل میں ممنون تھی۔

جہاں تک نورین کا تعلق تھا۔ اس کے مزاج تو اب بھی نہیں ملتے تھے۔ اور وہ تو خود کو ہر لحاظ سے علی احمد سے برتر سمجھتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس نے اپنے غریب ماموں کے بیٹے سے منگنی کر کے اس پہ احسان کیا ہے کہ اس جیسی حور پری اس کو کہاں مل سکتی تھی۔ ابرار احمد نے اگرچہ اس کو ٹھکرا کر اس کی انسلٹ کی تھی مگر وہ صاف کہتی تھی "وہ کم ظرف شخص میرے قابل ہی کب تھا۔ میں نے تو اماں کی خواہش پر اس رشتے پہ آمادگی ظاہر کی تھی۔ ورنہ تو ابرار احمد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

اس کی اس قسم کی باتیں سن کر ملنے جلنے والے دل ہی دل میں ہنسنے لگتے کہ رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ بلکہ اس کی منہ پھٹ قسم کی سہیلیاں تو اس کے منہ پر کہہ دیتی تھیں۔ "خیر نورین! اب تو ایسے مت کہو۔ تم کو بہت خوش تھیں اس رشتے پہ بلکہ کینیڈا جانے کے خواب

دیکھ رہی تھیں۔ ہاں چونکہ تمہاری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی، وہ کیا کہتے ہیں انگور کھٹے والی بات ہے نا۔ اس لیے اب ایسی باتیں کر رہی ہو۔"

......☆☆☆......

وقت کا کام گزرنا ہے سو گزر ہی جاتا ہے کبھی کسی کے لیے نہیں رُکتا۔ نورین کے انتظار میں چھ سال ہی پہلے لمحوں، پھر دنوں، مہینوں اور پھر سالوں میں گزر گئے۔ جب علی احمد ڈھیروں دولت کما کر سعودی عرب سے لوٹ آیا۔ پیسے کے ساتھ بہت ساز و سامان بھی لایا تھا۔

واپس آ کر اس نے پہلے گاؤں کی تنگ گلیوں میں موجود پرانے اور بوسیدہ مکان کو بیچ کر گاؤں کے نواح میں پکی سڑک پہ دس مرلے کا پلاٹ لے کر جدید طرز کا کوٹھی نما ڈبل اسٹوری مکان بنوایا۔ اس کا واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ پاکستان میں رہ کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے قریبی شہر میں ایک شاندار آفس بھی کرائے پہ لے لیا۔ اسی دوران اس کی اور نورین کی شادی کی تیاریاں بھی جاری تھیں۔ فردوس بی بی اپنی بیٹی کے تمام ارمان پورا کرنا چاہتی تھیں اسی لیے وہ اس کے لیے بے حد قیمتی جہیز بنوا رہی تھیں۔

دوسری طرف علی احمد کے گھر والے بھی نورین کی مرضی اور خواہش کے مطابق اس کے لیے بری تیار کروا رہے تھے۔ چونکہ علی احمد کافی پیسہ کما کر لایا تھا۔ اس لیے ہر چیز معیاری اور مہنگی خریدی جا رہی تھی۔ نورین کو تقریباً ہر روز ہی شہر کے چکر لگ رہے تھے۔ کبھی ماں اور بھائی کے ساتھ جہیز کی خریداری کے لیے تو کبھی ساس، نندوں کے ساتھ بری کی خریداری کے لیے۔ نورین بہت خوش تھی۔ طویل انتظار کے بعد بالآخر اس کی مرضی کے شخص سے اس کی شادی ہونے جا رہی تھی جو پڑھا لکھا تھا خوبصورت تھا، دولت مند نوجوان تھا۔ اگرچہ وہ چھتیس سال کی ہو چکی تھی۔ مگر اپنی عمر سے بہت کم نظر آتی تھی۔ خوشحال بے فکر اور آرام دہ زندگی بسر کرنے کی عادی گزرتے ماہ و سال نے اس پہ کوئی اثرات ثبت نہیں کیے تھے۔

اگر اس کی کوئی سہیلی دبے دبے لفظوں میں اس کی اور علی احمد کی عمروں کے فرق کے بارے میں کہتی تو وہ فوراً جواب دیتی۔

"اگر عورت اپنے سے بڑی عمر کے مرد سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے تو علی احمد بھی محض چند برس بڑی عمر کی لڑکی کے ہمراہ خوش رہے گا۔ پھر اس پہ کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے مجھے اپنا رہا ہے۔ تم کیا جانو وہ مجھے کس قدر چاہتا ہے۔ میری خاطر اس نے نیا مکان بنوایا ہے۔ میرے کہنے پر وہ باہر جانے کے بجائے یہیں رہ کر اپنا کاروبار کر رہا ہے کیونکہ میں ماں کے بغیر دیارِ غیر میں چند لمحے بھی نہیں رہ سکتی۔ اس سے زیادہ اور اس کی پسند اور چاہت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اتنے سال باہر رہ کر بھی وہ محض میری خاطر واپس آ گیا ہے ورنہ تو اس کی بہن میرے بھائی کے گھر میں ایک خوشحال زندگی گزار رہی تھی اور میں نے بھی بھائی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر علی احمد نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا تو وہ محض میری خاطر اپنا ہنستا بستا گھر نہ اجاڑے اور نہ ہی اپنے بیوی بچوں کو دربدر کرے۔ میری قسمت میں جو ہو گا وہ مجھے مل جائے گا۔"

اس کی یہ باتیں سن کر اس کی سہیلیاں اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جاتیں۔

مہندی والی رات ہی نورین کا جہیز کا سامان اس کے سسرال میں پہنچا دیا گیا تھا۔ نورین پیلے رنگ کے جوڑے اور گلاب اور موتیوں کے پھولوں کے زیورات میں سنوری بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے میک اپ نہیں کیا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ یہ اس کے اندر کی خوشی تھی جو چہرے سے جھلک رہی تھی اور اسے مزید دلکش بنا رہی تھی۔ فردوس بی بی نظر بھر کر بیٹی کو نہیں دیکھ رہی تھی کہ کہیں اس کی نظر نہ لگ جائے۔

وہ بیٹی کی دائمی خوشیوں کی دعائیں کر رہی تھی۔ نورین کی سہیلیاں اس کے کمرے کے فرش پر بچھی دری پہ بیٹھی ڈھولک پہ گیت گا رہی تھیں۔ کچھ دیر میں دولہا مہندی لانے والے تھے۔ مہندی کی تقریب کا اہتمام گاؤں سے باہر ایک بڑے سے میدان میں شامیانے لگا کر کیا گیا تھا چونکہ دونوں خاندان قریبی

رشتے دار تھے اس لیے مہندی کی تقریب مشترکہ کی جا رہی تھی۔

مہمان آنا شروع ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہی نورین اپنے گھر والوں کے ساتھ رسم کے لیے مخصوص جگہ پہنچ گئی۔

خوبصورتی سے سجے اسٹیج پہ دلہن اور دولہا کے لیے مہندی کی رسم کے لیے خصوصی زرتار کرسیاں تیار کی گئی تھیں۔ جو نورین اور علی احمد کے کزنز اور سہیلیوں کی مشترکہ کاوش تھی۔

دونوں خاندانوں کی یہ آخری شادی تھی اس لیے دونوں طرف سے دل کے ارمان دل کھول کر پورے کیے جا رہے تھے۔ مہندی کی تقریب کے لیے لگائے گئے شامیانے کے ساتھ ہی کھانے کی دیگیں پک رہی تھیں۔ گاؤں کے وہ لوگ جو مختلف قسم کے پیشوں سے وابستہ تھے۔ وہ بھی خوشی خوشی شادی کی اس تقریب میں شامل تھے کیونکہ اس موقع پہ انہیں خوب انعام و کرام ملتے تھے۔

علی احمد کے گھر والے اور دیگر رشتے دار مہندی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہو چکے تھے۔ ان کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا تو فاصلہ کچھ زیادہ تھا مگر پھر بھی پیدل ہی آ رہے تھے نوجوان لڑکیوں اور بچیوں نے مہندی کی سجی سجائی ٹوکریاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

علی احمد نے بھی پیلا کرتا اور سفید بوسکی شلوار پہن رکھی تھی اور سر پہ سرخ صافہ باندھا ہوا تھا۔ گلے میں پیلا دوپٹہ تھا۔ اور گلے میں پیلے اور سرخ گلاب کے ہار تھے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔

اس کی ماں بہنیں باپ بھائی، چچا، ماموں وغیرہ اس پہ نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ جب یہ قافلہ شامیانے کے قریب پہنچا تو پھر دولہا اپنے دوستوں کے ساتھ شامیانے میں مردوں کی سائیڈ پہ بیٹھ گیا۔

نورین کو اس کی سہیلیاں سرخ دوپٹے کے سائے میں اسٹیج پہ لائیں اور اس کو مہندی کی رسم کے لیے مخصوص زرتار سجی ہوئی کرسی پہ بٹھا دیا گیا۔ اور پھر لڑکیوں نے ڈھولک بجا کر گانے شروع کر دیے۔ اسٹیج کے ایک طرف لڑکے کی طرف کی خواتین ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں اور دوسری طرف گانوں کا مقابلہ شروع ہو گیا، جس میں کافی دیر کے بعد ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

علی احمد کے دو دوست پولیس میں تھے انہوں نے اچانک جوش میں آ کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی تو جوانوں نے اور بھی ناچنا شروع کر دیا۔ اب لڑکوں نے علی احمد کو بھی رقص کرنے کے لیے ساتھ ہی گھسیٹ لیا اور وہ بھی جوش سے ناچنے لگا۔

اور پھر پتا نہیں اس کے ایک دوست کی چلائی گئی گولی 'زن' سے آئی تو علی احمد کی کن پٹی میں پیوست ہو گئی یہ سب کچھ آنا فانا ہی ہو گیا دیکھتے ہی دیکھتے علی احمد نیچے گرا۔ خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ شاید علی احمد کی قضا آ گئی تھی جب ہی تو خوشی سے کی گئی ہوائی فائرنگ کی گولی نے اُسے اپنا نشانہ بنا لیا تھا۔

علی احمد کو فوری طور پر شہر میں ہاسپٹل لے جایا گیا مگر وہ تو گولی لگنے کے چند لمحوں بعد ہی راہی ملک عدم ہو چکا تھا۔ گولی اس کے دماغ کو چیرتی ہوئی دوسری طرف سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب دولہا کی سفید چادر سے ڈھکی لاش گھر میں پہنچی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ خوشی کے شادیانوں کے بجائے ماتم ہونے لگا۔

ماں باپ نے نوجوان بیٹے کو دولہا بنانے کے بجائے سفید کفن پہنا کر ہزاروں من مٹی کے نیچے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔

ماں بہنوں اور بھائی کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ پتا نہیں ان کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی تھی؟ احمد علی کے جس دوست کی چلائی ہوئی نا گہانی گولی نے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اسے وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ اس قدر جان لیوا صدمہ پہنچا تھا اسے کہ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔

دوسری طرف نورین کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی نہ بات چیت کر رہی تھی۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو روتے پیٹتے دیکھ رہی تھی۔ جب علی احمد کا جنازہ اٹھا تو تب بھی اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ماں اور دیگر رشتے

دار خواتین نے اسے رُلانے کے ان گنت جتن کیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اور پھر کئی روز تک اس کی یہی حالت رہی۔ کوئی کچھ زبردستی کھلا دیتا تو کھا لیتی، ماں بستر پر لیٹا دیتی تو لیٹ جاتی اور ویران آنکھوں سے دیواروں کو تکتی رہتی۔ ماں بیٹی کی حالت دیکھ کر خون کے آنسو روتی تھی۔ وہ تو جیسے زندہ درگور ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گی مگر جب علی احمد کے انتقال کے چھ ماہ بعد بھی نورین کی یہی حالت رہی تو پھر خاندان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ نورین کا نکاح علی احمد کے بڑے بھائی انیس احمد سے کر دیا جائے۔ یہ وہی انیس احمد تھا جسے برسوں پہلے نورین اور اس کی ماں فردوس بی بی نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ مگر اب کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی کہنا تھا کہ اگر اس کی شادی کر دی جائے اور وہ اپنے شوہر کے گھر میں چلی جائے تو شاید اس کی حالت سنبھل جائے گی مگر مسئلہ یہ تھا کہ فی الحال تو نورین کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اس کا نکاح کیسے ہو سکتا تھا۔ دوسرے انیس احمد کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی دو معصوم بچیاں تھیں اس کی بیوی ایک سیدھی سادی شریف عورت تھی۔ خاندان کے باہر کا کوئی بھی نوجوان، نورین سے کبھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ دوسرے وہ پورے خاندان اور گاؤں میں منحوس مشہور ہو چکی تھی لوگ کہتے تھے کہ لڑکی شادی سے پہلے ہی اپنے شوہر کو کھا گئی اور پتا نہیں کیا گل کھلائے گی؟

جب نورین کو اس کی ماں اور بھائی نے بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو وہ قدرے چونک سی پڑی اور بڑبڑائی "شادی۔" "میری شادی۔ ہاں ہاں میری شادی ہو رہی تھی نا۔ وہ میری مہندی ہوئی تھی نا رات کو۔ اچھا اچھا تو آج شادی ہے میری۔"

ہاں ...... ہاں میری جان! میری لاڈلی بیٹی۔ آج تیری شادی ہے اور آج تو دلہن بن کر سسرال جائے گی آج تیری بارات آئے گی۔" اس کی ماں نے کہا۔

"آ ...... اچھا ...... امی میرا شوہر تو آ گیا تھا نا ......

اور میرے زیور بھی تیار ہو گئے تھے نا ......؟ نورین نے رک رک کر کہا۔

اگلے دن جب ڈاکٹر نورین کو دیکھنے آیا۔ اور نورین کی اس پروگریس کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔

"گڈ یہ اچھی علامت ہے۔ اس کا مطلب مریضہ آہستہ آہستہ اپنے حواس میں واپس آ رہی ہے۔ بس اس بات کا خیال رکھیے گا۔ اسے یک دم سے نا کوئی خوشی کی خبر سنایئے گا نا کوئی ہی دکھ کی۔ دھیرے دھیرے وہ خود ہی ساری صورتحال کا ادراک کر لے گی۔"

نورین کی ماں فردوس بی بی، بھائی بھابی اور دیگر رشتے دار اس کی صحت یابی کو دیکھتے ہوئے بہت خوش تھے۔ سب اس کا کسی کانچ کی نازک گڑیا کی طرح خیال رکھ رہے تھے۔ اور ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کی جاتی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو، اور نہ ہی اسے تنہا چھوڑا جائے۔ نورین کی جو سہیلیاں اسی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو ساتھ لاتی تھیں تا کہ ان کی معصوم شرارتوں سے اس کا دل بہل سکے۔

انیس احمد کی بیوی تو تقریباً روزانہ ہی کچھ وقت نورین کے ساتھ گزارتی تھی۔ وہ ویسے بھی اس کی کزن اور بچپن کی سہیلی تھی اگرچہ انیس احمد کو اس کا نورین سے زیادہ میل جول پسند نہیں تھا مگر وہ صاف کہتی تھی' سنو انیس احمد! میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں، بس مہربانی کر کے مجھے نوری سے ملنے سے نہیں روکنا وہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ اس کے اور تمہارے درمیان جو ہوا وہ اس کا اور تمہارا معاملہ ہے مجھے اس میں مت گھسیٹو۔"

اور فطرتاً حلیم الطبع انیس احمد جواب میں بڑبڑا کر چپ ہو جاتا تھا۔ اور اب تو نورین کی صحت کی بحالی کے خاطر بڑوں نے نورین اور انیس کی شادی کا فیصلہ ان دونوں سے پوچھے بغیر ہی کر لیا۔ نورین کی تو حالت ایسی نہ تھی کہ اسے کچھ بتایا جاتا مگر فی الحال انیس احمد کو بھی اس فیصلے کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ کہ مبادا وہ انکار نہ کر دے۔ البتہ اس کی

بیوی زبیدہ کو اعتماد میں لیا گیا۔ اور اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ رفتہ رفتہ انیس احمد کو نورین سے شادی پر آمادہ کرے۔ وہ بڑے دل اور بڑے ذہن کی عورت اپنی سہیلی اور رشتے کی بہن کی خاطر، اپنے دل پہ پتھر رکھ کر اپنے ہی شوہر سے شراکت کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن نورین کے پاس انیس احمد کی بیوی زبیدہ اس کی ساس، جمیلہ خاتون اور ماں فردوس بی بی بیٹھی ہوئی تھیں اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ زبیدہ نے نورین سے کہا۔

''نوری تو نے اپنا شادی والا جوڑا دیکھا ہے کہ نہیں......؟ بڑا خوبصورت ہے۔ کام بھی، رنگ بھی اور سلائی بھی لاجواب ہے اسے پہن کر تو تم شہزادی لگو گی۔''

''ارے ہاں...... میرا شادی کا جوڑا، اماں کہاں ہے......؟ وہ میرا خیال ہے وہ ابھی تک درزی کے پاس ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بارات سے دو دن پہلے دے دے گا تو اماں بارات آنے میں کتنے دن ہیں۔ شاید ایک ہفتہ رہ گیا ہے......؟؟'' نورین نے کھوئے کھوئے لہجے میں ہم کلامی کرتے ہوئے ماں کی طرف رُخ پھیر کر پوچھا۔

''ہاں...... ہاں میری چندا۔ اگلے اتوار کو خیر سے تیری بارات آئے گی۔'' نورین کی ساس جمیلہ خاتون نے بھی خوش ہو کر کہا۔

''آ...... اچھا...... مگر...... ابھی تو میرے بہت سے کام رہتے ہیں۔ بہت سی خریداری کرنی ہے۔'' نورین نے بڑبڑا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں میری بچی! تم نے جتنی بھی خریداری کرنی ہے دل کھول کر کرو۔ زبیدہ اور اپنی بہنوں کو ساتھ لے کر چاہے روز ہی بازار چلی جایا کرو۔'' فردوس بی بی نے نورین کی چاندی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اماں...... تو کیا علی احمد کی ساری تیاری مکمل ہو گئی؟ اس کا سوٹ تیار ہو گیا نا؟'' نورین نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میری چندا! تمہاری شادی علی احمد سے نہیں انیس احمد سے ہو رہی ہے۔'' اچانک ہی جمیلہ خاتون کی زبان سے پھسل پڑا اور پھر وہ گھبرا کر نورین کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''علی احمد سے نہیں...... کیوں......؟ کیا اس نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا......؟ ایسا ہی ہوا ہوگا میری سہیلیاں تو پہلے ہی کہتی تھیں کہ میرا اور علی احمد کا کوئی جوڑ نہیں، وہ اتنا خوبصورت ہے۔ اتنا پڑھا لکھا اور پیسے والا ہے مجھ سے عمر میں بھی چھوٹا ہے۔ وہ محض گھر والوں کے مجبور کرنے پر مجھ سے شادی پر آمادہ ہوا ہے، ورنہ وہ مجھے...... مجھے...... بالکل بھی پسند نہیں کرتا۔''

نورین نے ہکلاتے ہوئے آنسوؤں سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''نن...... نہیں...... میری بچی ایسی بات نہیں وہ...... تو بہت خوش تھا۔ خوشی خوشی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا بس...... تقدیر کو اس کا اور تمہارا ساتھ منظور نہیں تھا۔'' جمیلہ خاتون نے نورین کو گلے سے لگا کر زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

''ک...... کیا بات ہے مامی جی...... آپ...... آپ رو کیوں رہی ہیں......؟ کیا ہوا علی احمد کو......؟ کیا کیا ہے اس نے ایسا کہ آپ اس طرح رو رہی ہیں......؟'' نورین نے اپنی گلابی انگلیوں کی پوروں سے ممانی کے آنسو صاف کرتے ہوئے متوحش لہجے میں استفسار کیا۔

''اس بدنصیب نے کیا کرنا تھا۔ کیا تو ہمارے ساتھ مقدر نے ہے...... میرا شہزادوں جیسا جوان بیٹا...... دیکھتے ہی دیکھتے جھٹ پٹ ہو گیا...... میرا چاند پتا نہیں کس کی نظر اسے کھا گئی......؟ جمیلہ خاتون نے نم نم لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا ہے۔ کوئی مجھے...... کچھ کیوں نہیں بتا رہا۔ کہاں گیا ہے علی احمد......؟'' نورین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدحواس ہو کر سب ہی کے دکھی چہروں کو دیکھ دیکھ کر پوچھ رہی تھی مگر کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کھل کر اسے حقیقت سے آگاہ کر دے۔ اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ ہوش و خرد سے بیگانہ نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ اسے اچانک کوئی بھی خوشی اور غم کی خبر نہ سنائی جائے۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نورین متجسس ہو چکی تھی۔ اور وہ حقیقت حال جاننے کے لیے بے تاب ہو گئی۔

بالآخر اس کی بھابی اور ہونے والی نند عفت آہستگی سے گویا ہوئی!

تمہارا احمد علی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ مر چکا ہے۔ مہندی کی رات اسے اپنے ایک دوست کی ہوائی فائرنگ سے کی گئی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔''

''کیا......؟'' نورین نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عفت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا بک رہی ہو تم۔ علی احمد کیسے مر سکتا ہے۔ وہ تو میرا دولہا بننے جا رہا تھا میں نے اتنے سالوں اس کا انتظار اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھے یوں چھوڑ کر چلا جائے گا''۔

نورین زور سے چلائی اور پھر اس کے ذہن میں مہندی کی رات والا منظر کسی فلم کی سین کی مانند ابھر آیا جب شامیانے سے واپس آ کر نورین اپنے کمرے میں رنگین پایوں والے پلنگ پہ بیٹھی ہوئی تھی' اس کی سہیلیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔

وہ ارد گرد کے ماحول سے بے خبر علی احمد کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ مہندی کے فنکشن کے مخصوص لباس میں وہ کس قدر بانکا اور سجیلا لگ رہا تھا۔ وہ جھکی جھکی نگاہوں سے اسے دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی نظر اتار رہی تھی۔ پتا نہیں وہ مجھے پسند بھی کرے گا یا نہیں میں بارات والے دن اپنے بناؤ سنگھار میں کوئی کمی نہیں۔ آنے دوں گی تاکہ وہ مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر ہمیشہ کے لیے فدا ہو جائے۔''

نورین یہی سوچ رہی تھی۔ رات تقریباً گزر چکی تھی۔ پو پھٹنے والی تھی اور کسی بھی لمحے مسجدوں سے فجر کی اذانوں کی آوازیں گونجنے والی تھیں۔

شور و غل میں گانے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کہ اچانک فردوس بی بی غم سے نڈھال بوجھل قدموں سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور چیخ کر بولی تھیں بند کرو گانا بجانا۔ محفلیں خوشیوں کے موقع پہ منعقد کی جاتی ہیں، ماتم والے گھروں میں تو صرف سوگ کیا جاتا ہے۔''

''یہ...... یہ...... کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم چاچی۔ کون سا ماتم! اب کیسا سوگ۔ ہم تو اپنی سہیلی' اپنی بہن کی شادی کی خوشی میں ناچ گا رہے ہیں۔ ایسی خوشی کے موقع پر اس طرح کی بدشگونی کی باتیں تو نا کرو۔'' نورین کی ایک سہیلی نے بھی چلا کر کہا۔

''بدشگونی تو ہو گئی ہے۔ میری بدقسمت بیٹی کے نصیب میں شاید خوشی لکھی ہی نہیں ہے۔'' فردوس بی بی نے نورین کا سر اپنے کاندھے سے ٹکا کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے کہا۔

''آخر ہوا کیا......؟ کچھ بتاؤ بھی...... پھوپو......؟''

عفت نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''عفت میری بچی تیرا بھائی مر گیا ہے۔ علی احمد میری چاندی بیٹی کا چاند سا دولہا مر چکا ہے۔'' فردوس بی بی نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا تو ہر طرف رونے پیٹنے اور آہ و بکا گونجنے لگی تھی۔ پل بھر میں خوشیوں جگہ سوگ دکھ اور ماتم نے لے لی۔

اسی لمحے غم و دکھ کی شدت نے نورین پر ہوش و حواس سے بیگانا کا کر دیا اور اس کے ذہن و دل پر ایک جمود سا طاری ہو گیا اور آج چھ ماہ بعد بھی علی احمد کی موت کی خبر سن کر یہ برف پگھلی تو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ نورین ایسے تڑپ تڑپ کر روئی جیسے ابھی ابھی علی احمد کا جنازہ اٹھا ہو۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ نورین کی بے چینی کو بھی قرار آ گیا اور اس نے یہ سوچ کر کہ مرنے والے تو واپس نہیں آ سکتے' نہ ہی ان کے ساتھ مرا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن کو سمجھا لیا۔ اور پھر زندگی کی دلچسپیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ البتہ وہ پہلے جیسی چلبلی اور ہنس مکھ نہیں رہی تھی۔ بس ایک معمول کی طرح زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔ جو سانسیں باقی تھیں ان کا قرض ادا کرنے کے لیے جی رہی تھی۔ اس کے دل کر ہر خوشی اور امنگ علی احمد اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا اس کی جدائی کا غم اس نے اپنے سینے کے اندر اتار لیا تھا۔ دل اشک خون بہاتا رہتا تھا مگر آنکھیں خشک

رہتی تھیں۔ اب اس نے عہد کرلیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے نا روئے گی۔ نا ہی اپنے غم کا اظہار کرے گی یہ غم اس کا ساتھی تھا۔ اس کی تنہائیوں میں اس کا دل بہلاتا تھا۔ اور وہ سمجھ بیٹھی تھی کہ علی احمد کا دکھ ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اور وہ اس کے ہمراہ جیون کی کٹھن راہیں باآسانی عبور کرلے گی۔

☆......☆......☆

ایک دن ماں نے انکشاف کیا۔ کہ اس کے سسرال والے انیس احمد سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ حیران ہو کر کہنے لگی۔

''مگر اماں...... انیس احمد تو شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی زبیدہ میری اتنی اچھی سہیلی ہے۔ اس کی دو پھول سی بچیاں ہیں۔ ایسا کیسے ہوسکتا......؟ زبیدہ کیا سوچے گی......؟'' نورین نے حیران ہو کر کہا۔

''زبیدہ کی بات چھوڑو، وہ اس بات پہ راضی ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم اپنی بات کرو۔ اصل بات تمہاری مرضی اور خوشی کی ہے۔ اگر تم اس رشتے پہ خوش ہو تو ہم بات آگے بڑھائیں گے۔ ورنہ یہ سلسلہ یہیں پہ روک دیا جائے گا۔ تم مجھ پر اور اپنے بھائی پہ بوجھ نہیں ہو بس ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ تا کہ تمہارا دل بہل جائے۔ تمہارے ساس سسر علی احمد کا سارا پیسہ بھی تمہارے نام کرنے کو تیار ہیں مگر شرط یہی ہے کہ تم خوشی سے اس بندھن میں بندھ جاؤ۔'' فردوس بی بی نے تفصیل سے کہا۔

''میں...... کیا؟ اور میری خوشی کیا۔ میری بساط ہی کیا ہے؟ تقدیر کے ہاتھوں میں انسان ایک کھلونا ہے۔ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مقدر کے لکھے کو مٹانا انسان کے بس میں نہیں جس انیس احمد کو میں نے کبھی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ آج وہی میرا جیون ساتھی بننے جارہا ہے سچ ہے کہ نصیب کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ میں نے بہت من مانی کر کے دیکھ لی۔ بزرگوں کے کیے ہوئے فیصلوں کو ٹھکرایا تب ہی تو ابرار احمد نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اور علی احمد کو موت نے چھین لیا۔ اب میں آپ لوگوں کی کسی بات اور کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کروں گی جو مرضی کریں۔ میری ساری خوشیاں اور آرزوئیں تو علی احمد کے ساتھ ہی دفن ہوگئی ہیں۔ میں تو محض سانس لینے والی ایک مشین ہوں میرا دل اور جسم تو مردہ ہو چکا ہے۔ اسے خواہ سفید کفن پہنا کر کسی کے آنگن میں ڈال دیں میں کوئی مزاحمت نہیں کروں گی۔'' نورین نے ایسے دلخراش لہجے میں کہا کہ فردوس بی بی بھی تڑپ اٹھی۔

''مت کرو ایسی دل دکھانے والی باتیں۔ میری بچی انیس احمد بھلے سے صورت زیادہ اچھا نہیں مگر دل کا بہت اچھا ہے۔ اس نے زبیدہ کو اس قدر خوش رکھا ہوا ہے۔ وہ تمہیں بھی اس قدر خوشیاں دے گا کہ تم اپنی تمام محرومیاں بھول جاؤ گی۔'' فردوس بی بی نے نورین سے دکھی لہجے میں کہا۔ اور پھر دونوں ماں بیٹیاں رونے لگیں۔

اپنے آنسو صاف کر کے مضبوط لہجے میں کہا نورین نے کچھ دیر بعد۔

مجھے انیس احمد سے شادی پہ کوئی اعتراض نہیں مگر میری ایک شرط ہے کہ وہ زبیدہ کو طلاق دے دے کیونکہ میں اپنی زندگی اور محبت میں شراکت نہیں برداشت کرسکتی۔''

''یہ...... یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟ نوری میری چندا! میری جان! زبیدہ بے چاری تو تمہیں اپنی سوتن بنانے کے لیے ہر طرح سے آمادہ ہے بلکہ انیس احمد کو بھی وہی تم سے شادی کے لیے تیار کرے گی۔ اور ایک تم ہو اپنی عزیز سہیلی کو طلاق دلوانا چاہتی ہو۔ نا...... نا میری بچی ایسی خود غرضی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں پہلے بھی اپنی خود غرضی اور خود پسندی کی بہت سزا مل چکی ہے۔ تم پہ منحوس کا لیبل لگ چکا ہے۔ کوئی بھی شخص تم سے شادی پہ آمادہ نہیں۔ یہ شکر کرو کہ عزیز بھائی محض میری محبت سے مجبور ہو کر اپنی ہی بھانجی پر سوتن لانے کا فیصلہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ ایسی شرطیں رکھ رہی ہو۔'' فردوس بی بی نے نورین کی بات پہ دل تھام کر کہا۔

''بس امی میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب مجھے مزید کسی بات کے لیے مجبور نہ کرنا۔'' نورین نے پتھریلے لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور بیچاری فردوس بی بی خود سر اور لاڈلی بیٹی کے نئے مطالبے پر اپنا

سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

☆......☆......☆

جب زبیدہ نے انیس احمد کو بزرگوں کے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم بھڑک اٹھا اور تیز لہجے میں بولا۔

یہ تم کیسی فضول باتیں کر رہی ہو زبیدہ؟ جس عورت نے برسوں پہلے مجھے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا مجھ پر ایک دوسرے شخص کو ترجیح دی۔ اسے اپنانے پہ تیار ہوگئی۔ وہ بے چارہ اس منحوس کی وجہ سے جان سے گزر گیا۔ تو اب اس بلا کو پھر سے میرے گلے میں باندھنے کی باتیں کی جارہی ہیں یہ ہمارے بڑے بھی نا بس۔ بغیر سوچے سمجھے الٹے سیدھے فیصلے کرلیتے ہیں۔''

''دیکھو انیس احمد تب کی بات اور تھی۔ اب نورین تو بدل چکی ہے۔ اور اس میں پہلے جیسا طنطنہ اور گھمنڈ نہیں رہا۔ علی احمد کی ناگہانی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے حواس بحال ہوئے ہیں، ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے کہ اسے اس دکھ اور غم کی کیفیت سے نکالنے کے لیے بہترین حل اس کی شادی ہے تاکہ وہ زندگی میں مصروف ہو کر پچھلی سوچوں سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔'' زبیدہ نے آہستگی سے کہا۔

''تو پھر میں ہی کیوں؟ کسی سے بھی اس کی شادی کر دیں۔ میری پُرسکون زندگی میں کیوں ہل چل مچانا چاہتے ہیں سب؟ میری بیوی ہے بچے ہیں میں تو ایک بیوی اور دو بچوں کا ہی خرچہ بمشکل اٹھا رہا ہوں اور یہ لوگ مجھ پر ایک اور ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی نورین جیسی خود پسند اور عیش پرست عورت کی' جو اپنی ذات کے علاوہ کسی اور کو کچھ نہیں گردانتی اور تم کیسی عورت ہو؟ جو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر اجاڑنے پر آمادہ ہو۔ تمہارا خیال ہے وہ خود غرض عورت تمہاری شراکت برداشت کرے گی۔ کبھی بھی نہیں...... وقتی غم اور بیماری کی وجہ سے اگر فی الحال کچھ بدلی بدلی محسوس ہو رہی ہے تو اس خوش فہمی میں نا رہنا کہ وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ انسان کی فطرت کبھی نہیں بدل

جیلی لچکدار کیوں ہوتی ہے؟

جیلی ایک لحمیاتی (پروٹینی) مادے جیلاٹین سے بنتی ہے۔ جیلاٹین کو اگر گرم پانی میں ڈالا جائے تو اس کے سالمے ڈھیلی اور لمبی ہیئت اختیار کرلیتے ہیں۔ جب یہ مرکب ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا جائے تو کئی سالمے مل کر زیادہ لمبے ہوجاتے ہیں۔ بعض کی لمبائی تو جیلی کے ایک سرے سے دوسرے تک بڑھ جاتی ہے' یوں جیلی لچکدار لگتی ہے۔ جب جیلی کو برتن سے نکالا جائے تو لچکیلے سالموں کی وجہ سے ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

حسنِ انتخاب۔ عبدالغفار عابد' چیچہ وطنی

سکتی۔ سانپ کا کام ڈسنا ہے اور وہ ڈس کر رہتا ہے۔ لاکھ اُسے دودھ پلا کر پالو پوسو۔ اس لیے بی بی مجھے اس آزمائش سے دور ہی رکھو، تم دو بچوں کی ماں ہو۔ وہ اس گھر میں آتے ہی پہلے تمہیں اور ان دو بچوں کو گھر سے نکالے گی، تمہارے تو ماں باپ بھی نہیں ہیں، بھائی اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ تمہیں کون پناہ دے گا۔''

انیس احمد نے بے حد تلخ لہجے میں زبیدہ کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میری فکر نہ کرو تم۔ نورین کو اس کی ماں الگ گھر میں رکھے گی۔ وہ میری سہیلی اور خالہ زاد ہے۔ اس قدر کٹھور نہیں ہوگی کہ مجھے میرے گھر سے نکالنے کی کوشش کرے۔ جبکہ وہ جانتی ہے کہ اسے میں ہی اس گھر میں لانے کی تگ و دو کر رہی ہوں۔ کسی اور سے شادی کرنے کی بات تو اس عمر اور حالت میں کون اسے اپنائے گا مشکل کی گھڑی میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ عزیز ماموں کے علاوہ فردوس خالہ کا کون ہے۔ جوان کی اکلوتی بیٹی کو سہارا دے گا۔ یوں بھی ہماری دو ہی بچیاں ہیں۔ ہوسکتا ہے نورین سے اللہ تعالیٰ ہمیں بیٹے کی نعمت سے بھی سرفراز فرمادے۔''

ہمیشہ تصویر کا روشن رُخ دیکھنے والی زبیدہ نے پر امید لہجے میں کہا۔

''ہوں......خوش فہمی ہے تمہاری اور خوش فہمی کا علاج کسی کے پاس نہیں ہوتا۔'' انیس احمد نے زہر خند لہجے میں کہا اور پھر غصے سے جلتا بھنتا گھر سے باہر چلا گیا۔ زبیدہ انیس احمد کو قائل کرنے کے لیے مزید ترکیبیں سوچنے لگی۔ اب دونوں گھروں میں عجیب سی کش مکش تھی۔ ایک طرف انیس احمد نہیں مان کر دے رہا تھا۔ دوسری طرف نورین دوبارہ اپنی اصلیت میں آ چکی تھی۔ وہ اپنی پچھلی ساری کوتاہیاں اور محرومیاں فراموش کر کے پھر سے پہلے جیسی خود سر بن چکی تھی۔ وہ انیس احمد کو اپنانے پہ ہر طرح سے آمادہ تھی مگر اسے زبیدہ اور اس کی بچیوں کا وجود گوارہ نہیں تھا۔ وہ بلا شرکت غیرے تن تنہا انیس احمد کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی۔

فردوس بی بی اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں دوسری طرف زبیدہ جمیلہ خاتون اور بہنیں انیس احمد کو سمجھا رہی تھیں۔ بالآخر انیس احمد نورین سے شادی پہ رضا مند ہو گیا۔ مگر جب اس کی نورین کی شرط کی خبر پہنچی کہ وہ زبیدہ اور بچیوں کو گھر سے نکال دے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ یوں بھی انیس احمد کی بہن زبیدہ کے بھائی سے بیاہی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسے طلاق دے کر گھر واپس بھیج دیتا۔ عجیب سا تناؤ والا ماحول تھا۔ اس وجہ سے انیس احمد نے نورین سے شادی پہ انکار کر دیا۔ پھر نورین نے ایک اور پینترا بدلا اور اپنی یہ شرط تو واپس لے لی کہ وہ زبیدہ کو طلاق دے دے لیکن اس نے نئی شرط لگا دی کہ وہ گاؤں کے بجائے اسے شہر میں مکان لے کر رکھے۔ اور انیس احمد محض ماں باپ اور بیوی کے دباؤ پہ اس شادی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اس بات پہ باپ نے غصے میں آ کر انیس احمد کو عاق کر دیا۔ اور خود اپنی بیوی اور دو بچوں کو لے کر شہر میں آ گیا۔ خود ایک دوکان پہ سیلز مین بن گیا۔ جہاں صبح نو بجے سے رات کے دس بجے تک مصروف رہتا۔ ایک کچی آبادی میں ایک گھر میں پانچ ہزار پر ایک کمرا لے لیا اس بارہ ہزار کی تنخواہ پہ کرایہ نکال کر بہ مشکل اتنے پیسے بچ سکتے تھے کہ ایک وقت کی روکھی سوکھی کا بندوبست ہو سکے۔

بچوں کی پڑھائی، کپڑے لتے اور تکلیف میں دوا دارو کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچتی تھی۔ زبیدہ نے ہمت باندھی اور گھر پہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے لگی۔ وہ قدرے خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی بھی خوشحال گھر میں ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنے بچوں کو دوسروں کا دست نگر بنانے کے حق نہیں تھی۔ اس لیے اس نے خود محنت کرنے کا فیصلہ کیا۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی کہ کسی اسکول وغیرہ میں پڑھا سکتی۔ سلائی کڑھائی کر لیتی تھی۔ مگر اس غریبوں کے علاقے میں کون اس سے اجرت پہ کپڑے سلواتا۔ جن بچوں کو وہ قرآن پاک پڑھاتی تھی، ان کے وہ لوگ بھی بہت کم پیسے دیتے تھے۔ دراصل اس مفلوک الحال علاقے میں زیادہ تر لوگ اسی کی طرح نادار اور بے وسیلہ تھے۔ اس پہ زبیدہ نے قریبی خوشحال علاقے کی کوٹھیوں میں بچیوں اور خواتین کو درس قرآن دینا شروع کر دیا۔ اور اس سے اسے کم از کم کتنی آمدنی ضرور ہونے لگی کہ جس سے وہ نا صرف اپنی بچیوں کو تعلیم دلانے کے قابل ہو گئی۔ بلکہ گھر کا چولہا بھی جلنے لگا۔ اور بچوں کے لیے مناسب جوتے کپڑے بھی موقع محل کے مطابق بنا لیتی۔ کوٹھیوں کی کچھ متخیر خواتین ویسے بھی اس کی مدد کر دیا کرتیں اور یوں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی عورت محض ایک خود غرض عورت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہوئی اور دوسروں کے صدقے خیرات پہ اپنے بچوں کو پالنے پہ مجبور ہو گئی۔

☆......☆......☆

نورین کا غرور آج بھی ویسا ہی ہے۔ اب تو اس کی عمر چالیس برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ شادی کی کوئی اُمید بھی نہیں رہی۔ مگر وہ کسی پرستان کے شہزادے کی منتظر ہے۔

انسان کو زندگی میں بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اگر انسان اپنی انا، ضد اور خود غرضی کی وجہ سے تقدیر کے فیصلوں کو بھلا کر من مانی کرنے کی کوشش کرے تو پھر تقدیر بھی انتقام لیتی ہے۔ اور خدا ایسے شخص کو ٹھوکروں کی زد میں رکھتا ہے۔ انسان میں اگر لچک اور نرمی نہ ہو تو پھر کہیں کا نہیں رہتا ہے۔

☆☆☆

چوتھی سچ بیانی

فاطمہ گل



اعجاز احمد فکرال

کشمیر کی اس گمنام مجاہدہ کی کہانی جس نے اپنی بہادری کا لوہا منوالیا

فاطمہ گل کا گاؤں مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی سرحد کے قریب واقع تھا۔ بھارتی فوجیوں کی مجرمانہ کارروائیوں کی وجہ سے غریب دیہاتیوں کے گھروں میں سلامتی نہیں رہی تھی اور نہ ہی ان کی کوئی چیز محفوظ تھی۔ وہ لوٹ مار تو کرتے ہی تھے جس کی بھارتی حکومت نے انھیں کھلی چھٹی دے رکھی تھی مگر وہ اپنی عیاشی کیلئے عورتوں اور لڑکیوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ عورتوں کیلئے لٹیرے فوجیوں کی ہوس انگیز نظروں سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔



فاطمہ گل کی ماں صبح سویرے گاگر (گھڑا) اُٹھائے اپنے گاؤں کی چند عورتوں کے ساتھ پگڈنڈی پر دریا سے پانی بھر کر گھر واپس آرہی تھی کہ ایک عورت نے اس کو بتایا کہ۔

"میرے خاوند کو خفیہ اطلاع ملی ہے کہ کسی بھی رات کو بھارتی فوجی ہمارے گاؤں پر حملہ کر سکتے ہیں اور جو لڑکیاں باقی بچی ہیں، بھارتی فوجیوں کی نظریں ان نوجوان لڑکیوں پر ہیں اور وہ انھیں اغوا بھی کر سکتے ہیں۔"

ان چند عورتوں میں سے فاطمہ گل کی ماں اور دو عورتیں ایک درخت کے پاس پتھریلی جگہ پر بیٹھ کر کشمیری عورتوں کی بے بسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔

فاطمہ گل کی ماں نے کہا، "انتقام تو کمزور انسانوں کو لہولہان کرتا ہے جیسے طوفان میں منہ زور ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں۔ جیسے دریاؤں کے پانی میں طغیانی پیدا ہوتی ہے، جیسے بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج کا پانی جوش میں ہر چیز کو روند دیتا ہے۔ ہم مجبور اور نہتی کشمیری عورتیں بھلا اسلحہ سے لیس فوجیوں کے ساتھ کیسے لڑ سکتی ہیں۔ دشمن کی قہر آلود نظریں ہر چیز ملیامیٹ کرنے کے بعد عورتوں کا تعاقب جاری رکھتی ہیں اور دشمن کی طاقت کوئی صابن کی جھاگ کی طرح نہیں ہوتی جو آسانی سے بیٹھ جائے۔ دشمن اسلحہ سے لیس ہو کر آتا ہے اور طاقت کے نشے میں اپنا انتقام پورا کر کے جاتا ہے۔"

دوسری عورت نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو، اس زمین پر بسنے والے انسان ہیں یا حیوان۔ بظاہر طاقت انسانوں کے پاس ہے۔ لیکن دوسروں کے سکون کو جانور بھی اتنی بری طرح تباہ نہیں کرتا، جتنی بری طرح انسان انتقام میں اندھا ہو کر مجروح کرتا ہے۔ جانوروں کی ایک بھی عدالت نہیں تمام عدالتیں انسانوں کی ہیں۔"

تیسری عورت جو پاس کھڑی تھی دونوں کی باتیں غور سے سن رہی تھی، اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "تم دونوں ٹھیک کہتی ہو، کمزوروں کا اس دنیا کے انصاف پرور لوگوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ حالانکہ عالمی عدالتیں موجود ہیں، جیسے اپنے ملک میں غریب کو انصاف نہیں ملتا، ویسے ہی عالمی عدالت میں غریب ملکوں کو انصاف نہیں ملتا۔ کمزور لوگ طاقت کے ظلم کے آگے خاموشی پر اکتفا کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ انسانوں کا عجیب مزاج ہوتا ہے، لوگوں کی غیرت سو جاتی ہے، مرتی کبھی نہیں، بیدار اس وقت ہوتی ہے، جب بے غیرتی ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ ویسے ہی دنیا میں انصاف اس وقت حرکت میں آتا ہے جب ظلم برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔"

پھر فاطمہ گل کی ماں نے کہا، "یہ بڑی عجیب بات ہے۔ دشمن قوم کا انتقام ہمیشہ عورتوں کی آبرو ریزی پر ہی آ کر کیوں رکتا ہے۔ عورتوں کو اُٹھانے کے بعد ظلم کی ابتداء پھر نئے سرے سے کیوں شروع ہوتی ہے۔ جس میں عورتوں کو اجتماعی طور پر جنسی تشدد کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے اور عورت کا قصور صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان کا تعلق مخالف ملک سے ہوتا ہے۔ عجیب ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ حکومتیں عالمی میڈیا ظلم کے خلاف آواز بھی اس وقت بلند کرتا ہے، جب ان کو مفاد نظر آتا ہے اور مظالم کا لاکھ مداوا کیا جائے، پھر بھی مظلوموں کے غم تحریر میں نہیں آسکتے۔ لوگ انسانی حقوق کے دعوے تو بڑے کرتے ہیں لیکن مظلومیت کا مداوا کبھی کسی نے نہیں کیا۔ خدا بچائے مظلوموں کو طاقتور لوگوں کے ظلم سے۔ ان اسلحہ والوں نے تو دنیا کا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ انھوں نے ہر جگہ اسلحہ کے انبار لگا کر کوئی خطہ پرامن نہیں چھوڑا۔ ہر جگہ اسلحہ کے زور پر بے دردی سے انسانوں کی چیر پھاڑ جاری ہے۔ آنے والے وقتوں میں پتا نہیں یہ دنیا کیسی ہوگی، ہو سکتا ہے انسانوں کا انسان لینا بھی دوبھر ہو جائے۔"

ان عورتوں کی باتیں سن کر ایک کمزور دل عورت کے چہرے پر دہشت طاری ہو گئی۔ اس نے خوف کے عالم میں سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا تو مرد ہی گھر پر نہیں اور میری بیٹیاں بھی گھر میں اکیلی ہیں۔ ان کی حفاظت کون کرے گا۔" اتنا کہہ کر وہ پھڑ پھڑاتے پرندے کی طرح حواس باختہ ہو کر تیزی سے گھر کی طرف بھاگی۔ باقی عورتیں بھی کفِ افسوس ملتی ہوئی کھڑی ہو گئیں اور اس کے پیچھے چل دیں کہ۔ "پتا نہیں اب کیا ہوگا، خدا خیر کرے۔"

☆......☆......☆

فاطمہ گل کی ماں نے اپنے گھر پہنچ کر خاوند اور بیٹوں کو اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھا کر آگاہ کرتے ہوئے کہا، "مجھے خاص ذرائع سے پتا چلا ہے کہ اس گاؤں پر کسی وقت بھی بھارتی فوجیوں کا حملہ ہو سکتا ہے اور انھوں نے خصوصی طور پر لڑکیوں کو اٹھانا ہے۔ اس وقت ہم گاؤں نہیں چھوڑ سکتے۔ آنے والے زیادہ ہیں اور ہم دفاع کرنے والے کم، بھارتی فوجی کسی بھی وقت گاؤں پر حملہ کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس گھر کی کچھ چیزوں کو توڑ پھوڑ دو۔ تاکہ آنے والوں کو شک نہ گزرے اور وہ یہی سمجھیں، یہاں چند روز پہلے چوری کی واردات ہو چکی ہے۔ وہ نقدی اور لڑکیاں اٹھائیں گے، میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس وقت اس کو ان درندوں سے بچا کر کہاں لے جاؤں۔ ان سے کون بچائے۔ ان سے تو بے زبان پرندے بھی پناہ مانگتے ہیں، ان کے آگے ہم نہتوں کی آہ و بقا ہمیشہ بے اثر رہی ہے۔"

خبر کے پھیلتے ہی گاؤں پر پژمردگی چھا جاتی۔ شام ہوتے ہی بد روحوں کے خوف جیسا سناٹا پھیل جاتا۔ گاؤں کی عورتیں کانپتی اور سہمی ہوئی اپنے بچوں کو سینوں سے لگا کر چھپ کر بیٹھ جاتیں۔ سانسوں پر پہرے لگ جاتے۔ مردوں کے سانس اٹک جاتے۔ ذرا سی آہٹ پر مردہ روحیں چونک اٹھتیں۔ خوفناک جگراتوں سے نیند کے بچھوٹے بھاری، پلکیں بوجھل اور اجسام تھک جاتے۔ لوگ تھکی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے کہ کہیں سے مجاہدین کی مدد پہنچ جائے۔ آخر مدد کی آس بھی دم توڑ گئی اور عبرتناک اندیشے غالب آگئے۔

ایک اندھیری رات کو کچھ سرکاری گاڑیاں کھراش کھراش کرتی ہوئی گاؤں کی چوپال میں آکر رکیں۔ چند فوجی بھاری اسلحہ سے لیس سرکاری گاڑیوں سے نیچے اترے اور فوجی بوٹوں کی ٹھک ٹھک شروع ہو گئی۔ ان کو کسی عورت کے نہ بیوہ ہونے سے سروکار تھا نہ بچوں کے یتیم ہونے کا احساس۔ چند بندوقوں کی بارود کی آواز نے گاؤں کی خاموشی توڑ دی اور نہتے لوگوں کے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔

ایک بھارتی فوجی افسر نے ساتھیوں کو اشارے سے کہا، "تم اِدھر جاؤ، تم اُدھر جاؤ۔" خود فاطمہ گل کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر دروازے پر دستک دینے کی بجائے کھڑاس سے پاؤں مارا اور کچھ فوجی دروازہ توڑ کر گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

فاطمہ گل کے ماں باپ اور بھائی سہم کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے، جیسے مظلوم جانور سامنے موت نظر آنے پر شکاری کو رحم طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔

فوجی افسر نے دھکا مارتے ہوئے کہا، "تمھارے گھر میں ایک لڑکی ہے، بتاؤ، وہ کہاں ہے، نہیں تو سب پر فائر کھول دوں گا۔"

کچھ فوجی نقدی اور زیورات مانگنے لگے۔ فاطمہ گل کا باپ سہما ہوا آگے بڑھا اور کمزور آواز میں التجائی انداز میں کہا، "اس گھر کی حالت دیکھ لو، یہاں کیا رہ گیا ہے، چند روز پہلے کچھ فوجی یہاں لوٹ مار کر کے جا چکے ہیں۔ اب یہاں ویرانوں کے سوا کچھ نہیں۔"

فوجی افسر نے کمینے لہجے میں کہا، "میں نے تم سے تفصیل نہیں پوچھی۔ لڑکی کے بارے میں بتاؤ۔ لڑکی کے بارے میں، نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔؟"

فاطمہ گل کی ماں نے التجائی انداز میں کہا، "یہاں ہمارے سواء کوئی نہیں۔ میری کوئی بیٹی نہیں، بیٹا، تمھیں کسی نے غلط بتایا ہے۔"

فوجی افسر نے کچھ ماتحت فوجیوں کو ذلت آمیز طریقے سے کمروں کی تلاشی لینے کا اشارہ کیا۔ رات کے اندھیرے میں کواڑوں کے ٹھک ٹھک بجنے کی آوازیں سناٹے میں گونجنے لگیں اور وہ کمروں کی چیزوں کو تہس نہس کرنے لگے۔

آخر ایک کمرے سے فاطمہ گل کی دلدوز چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ فوجی اس کو گھسیٹ کر اور روندتے ہوئے باہر لا رہے تھے۔

"ماں مجھے بچالو، بابا مجھے بچالو، بھیا، ماں ان سے کوئی نہیں بچا، انھوں نے گاؤں کی کسی لڑکی کو نہیں چھوڑا۔" فاطمہ گل چیختے ہوئے فریادیں کر رہی تھی۔ لیکن سب بے بسی کی تصویر بنے کان نہیں دھر رہے تھے۔

ماں باپ فطری محبت کے تحت اپنی بیٹی کو ظالموں کے ہاتھوں میں مجروح ہوتے دیکھ کر آگے بڑھے تو فوجیوں نے بندوقوں کے بٹ مار کر ان کو گرا دیا۔ تینوں بھائی بھی آگے بڑھے تو فوجیوں نے تینوں نہتے بھائیوں کی طرف بندوقیں تان کر ان کو زمین پر الٹا لٹا کر مشکیں کس دیں۔ ماں باپ اور فوجیوں میں فاطمہ گل کو چھڑانے کے لیے ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ کوئی منت وسماجت اور آہ و بقا کارگر ثابت نہ ہوئی اور بھارتی فوجیوں نے فاطمہ گل کو گدھوں اور کوؤں کی طرح کھینچتے ہوئے گھر کے باہر طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

فاطمہ گل کی آوازیں گاؤں کے سناٹے میں گونجتی رہیں، "ماں مجھے مت چھوڑو، بابا مجھے ان درندوں سے بچالو۔ میں لٹ جاؤں گی۔"

مگر سسکتی آہوں اور کمزوریوں کا طاقت پر کب زور چلتا ہے۔ ماں باپ زخمی حالت میں گر گئے اور فاطمہ گل کی ماں نے فوجی افسر سے گڑگڑا کر کہا۔

"بیٹا رحم کرو ہم پر۔ جن انسانوں کا خون تم بہاتے ہو وہ خون بھی تمھارے جیسا ہے۔ ہمیں دکھ دے کر تمھیں کیا ملے گا۔ ہمیں معاف کر دو۔"

مگر مشکی رنگ کے فوجی افسر کے بے ضمیر کانوں پر ایک بے بس ماں کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔

فوجی افسر فاطمہ گل کو بازو سے کھینچ کر گھر سے باہر لے آیا۔ فاطمہ گل آنکھوں میں خوف کے آنسو لئے ہچکیاں لے کر روتی رہی اور اپنے آپ کو چھڑانے کیلئے بدستور مزاحمت کرتی رہی کہ کیوں کوئی غیر اس کی مرضی کے بغیر اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرے۔ کچھ دوسرے فوجی گاؤں سے مال واسباب اور لڑکیاں اٹھا کر لے آئے۔ کھینچا تانی میں لڑکیوں کے جسموں کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ تمام لڑکیوں کو ایک جگہ اکٹھے کھڑا کر دیا گیا۔ وہ شرم وحیا سے اپنے بدنوں کو سمیٹتے ہوئے سسکیاں لے کر رو رہی تھیں اور خود کو قیدی پرندے کی طرح آزاد کرانے کے لیے مسلسل بیتابی سے جدوجہد کر رہی تھیں۔ ہر لڑکی اپنی عزت بچانے کے لیے چیخیں مارتے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ ماحول کا سناٹے دار پہرہ ٹوٹ چکا تھا۔ چوپال میں لڑکیوں کی چیخوں کی آہ وبکا کا غدر مچا ہوا تھا۔ ہر طرف سنگینوں بھرے ظلم کا پہرہ تھا۔ فاطمہ گل اپنے حسن و جوانی اور کشمیری سیبوں جیسے گالوں کی بناء پر لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور تیز طرار تھی۔ اس ہتک آمیز رویے پر غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو کر رنگ بدل رہا تھا اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ ان درندوں کے ہاتھوں اپنی اور دوسری مظلوم لڑکیوں کی عزت پامال ہونے سے بچانے کے لیے خونخوار ہوتی جا رہی تھی۔ ایک فوجی افسر فوراً اپنی شہوانی پیاس بجھانے کے لیے فاطمہ گل کو ایک جھاڑیوں کے پیچھے صاف راستے کی طرف لے کر بڑھنے لگا۔

فاطمہ گل جوانی اور طاقت میں بھرپور تھی۔ اچانک اس نے اپنے آپ کو آبروریزی سے بچانے کیلئے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمت کر کے فوجی افسر سے ضدی بچے کی طرح گن چھین لی اور اپنی عزت بچانے کے جذبے کے تحت اس پر فائرنگ شروع کر دی اور فوجی افسر کو دیکھتے ہی دیکھتے مردار خور جانور کی طرح ڈھیر کر دیا۔ دوسرے فوجی اس اچانک فائرنگ پر ابھی اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائے تھے کہ بغیر کسی انسانی آواز کے گولیوں کی تڑاخ تڑاخ کی آوازیں گاؤں میں گونجنے لگیں۔ فاطمہ گل نے جھاڑیوں میں سے سامنے آ کر فائرنگ شروع کر دی۔ آمنے سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک افراتفری مچ گئی اور فاطمہ گل نے سب یرغمال لڑکیوں کو ہوس کے پجاریوں سے چھڑا کر آزاد کرا لیا۔ بھارتی فوجیوں کی آوازیں اشاروں کنایوں میں تبدیل ہو گئیں۔

ایک فوجی نے اپنے ماتحتوں سے دانت پیس کر کہا۔ "مجاہدہ ہے، ایک ہی ہے ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ بہادر ہے اور موت بہادروں سے ڈرتی ہے، بچ کر نہ جانے پائے۔"

فاطمہ گل روحانی جذبے کی قوت کے ساتھ اپنی اور دوسری نہتی لڑکیوں کی ناموس بچانے کیلئے مجاہدہ کے روپ میں بے جگری سے ٹھیک نشانے لگاتی رہی اور بے لگام بھارتی فوجیوں کو جہنم واصل کرتی رہی اور رات بھر وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی رہی۔ صبح ہونے تک اس نے بہت سے بھارتی فوجیوں کے خون سے کئی جگہوں کو سرخ کر دیا تھا۔ آخر ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کے نرم و نازک جسم پر بھی لگی، جس نے اس کی دائیں ٹانگ کے پرخچے اڑا کر اسے معذور کر دیا۔ چند بھارتی فوجی صبح ہونے سے پہلے مارے گئے، باقی سورج کی روشنی میں چہرے چھپا کر اور پیٹھیں دکھا کر ایک مجاہدہ کے جوابی اقدام سے بے بس ہو کر بھاگ گئے۔

فائرنگ رکی تو فاطمہ گل کے ماں باپ اور بھائی خون میں لت پت فاطمہ گل کے پاس بھاگتے ہوئے آئے۔ جو کہ غازی نہ بن سکی اور سسکتے سسکتے زخمی حالت میں ان کے ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول کر جام شہادت نوش کر گئی۔

فاطمہ گل کی ماں نے اپنے خاوند اور بیٹوں سے روتے ہوئے کہا۔

"ہماری بوڑھی ہڈیاں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں نہ ہی میری اس شہید بیٹی کیلئے گاؤں میں زمین کا کوئی ٹکڑا ہے۔ ابھی بھارتی فوجی مزید کمک لے کر یہاں انکوائری کیلئے آئیں گے اور ہر چیز کو راکھ میں تبدیل کر دیں گے۔ وہ اس شہید کے جسدِ خاکی کے ساتھ عبرتناک بدسلوکی اور توہین آمیز رویہ اختیار کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ اس کو بانس پر لٹکا دیں یا جلا دیں یا کوئی اور توہین آمیز سلوک کریں۔ کیونکہ اس نے ان کے عزائم خاک میں ملائے ہیں۔ لہٰذا اس کو ایک تابوت میں ڈال کر دریا میں بہا دو۔"

فاطمہ گل کے بھائیوں نے فوراً لکڑیوں کے تختوں کا ایک تابوت تیار کیا اور فاطمہ گل کو آخری بار احترام کے

ساتھ اس میں لٹا کر ساتھ ایک رقعہ لکھ کر تابوت میں رکھ دیا اور ساتھ ہی گاؤں کو چھوڑنے کی تیاری شروع کر دی۔

☆......☆......☆

آج دریا میں بلا کی طغیانی تھی۔ طغیانی شورش برپا کر کے پانی کو بار بار اچھال رہی تھی۔ آسمان کالی گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ بادلوں کے ٹکراؤ بجلی کو جنم دے رہے تھے۔ گن گرج نے عجیب ماحول بنایا ہوا تھا۔ جس سے گاؤں کی زمین کانپ رہی تھی۔ فضا چنگھاڑ رہی تھی۔ دریا میں غضبناک لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ پانی ایسے برس رہا تھا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو اور اپنی طاقت سے دریا کنارے توڑے گرا رہا تھا۔ دریا غصے میں پہاڑوں اور جھرنوں سے گرتا، بل کھاتا ہوا سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہوا کے شور نے الگ اودھم مچایا ہوا تھا۔ شاید تند و تیز ہوائیں فاطمہ گل کی موت پر درختوں کے ساتھ نوحہ پڑھ رہی تھیں۔

تابوت دریا میں بہتا ہوا جا رہا تھا اور موجیں اس کو بہاؤ کی طرف لے جا رہی تھیں۔ کہیں کہیں دریا میں درختوں کے تنے، تنکے، پتے اور ٹہنیاں بھی بہتے ہوئے جا رہے تھے، کہیں چھوٹے پتھر تھے۔ پانی ہوا کے جھکڑوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہا تھا۔ تابوت تھپیڑوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ لہروں اور موجوں کے سہارے پر چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی موجیں اس کو اچھال بھی دیتیں۔ تند و تیز ہوا اس کو پانی میں گھسیٹ بھی رہی تھی۔ کئی بار تیز موجوں نے اس پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ موسلادھار بارش کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ بارش نے تابوت کو شرابور کیا ہوا تھا۔ حالانکہ چند روز سے کشتیاں طغیانی میں ڈوب رہی تھیں۔ کیونکہ سرکش موجیں اور بپھری لہریں برق رفتاری سے اپنا راستہ بناتی ہوئی راستے میں آنے والی ہر چیز کو روند رہی تھیں۔ رات کو فضا کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں تابوت صرف بجلی کی چمک میں ہی نظر آتا۔ دن کو تابوت کو پانی میں جاتے دیکھ کر لوگوں کے اعصاب پر خوف سوار ہو جاتا۔ تابوت دریا میں کسی کھلونے کی مانند ہچکولے کھاتا بہتا ہوا جا رہا تھا۔ کبھی کبھار پانی پر ایسے چلتا جیسے رینگ رہا ہو۔ دریا کا پانی کبھی مٹیالا کبھی سفید ہو جاتا۔ لیکن میدانی علاقوں میں پانی مٹیالی چادر کی طرح ہی لگتا۔ دریا کے آس پاس درختوں پر فضا میں کوے تابوت کو دیکھ کر کائیں کائیں کر رہے تھے۔ اس دریا نے لاکھوں لاشیں اگلی تھیں اور حادثے جذب کیئے تھے۔ حالانکہ دریا کے مگرمچھ اور مچھلیاں لاشوں کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ مگر تابوت کو کسی سے خراش تک نہ آئی اور وہ تیز دھارے میں تمام رکاوٹیں عبور کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

کئی دن بعد ذرا آندھی تھمی، ہوا کے جھکڑ چلنا بند ہوئے۔ موجوں کے تیور بدلے، تابوت رک رک کر چلنے لگا اور پانی کے تھپیڑے اس کو دریا کنارے آباد گاؤں چھنی گوندل کی طرف دھکیلنے لگے۔ چھنی گوندل گاؤں سرحد پر واقع تھا۔ جہاں گاؤں کے دو مکین اس کو آنکھیں ملتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ دونوں رانگلیں پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آس پاس کے سنسان ماحول نے ان کو اور بھی پریشان کر دیا۔ وہ جانتے تھے ہر بار کنڈی میں مچھلی نہیں لگتی۔ پتا نہیں اس تابوت میں کیا ہے اور یہ بھی پتا نہیں اس میں لاش ہے بھی کہ نہیں اور ہوسکتا ہے اس میں کوئی قیمتی چیز ہو اور نہیں تو لکڑی ہی ہاتھ لگ جائے گی۔ یہ سوچ کر دونوں نے تابوت کو کنارے پر لا کر کھولا تو ہر طرف فرشتوں کی موجودگی کی خوشبو میں پھیل گئیں۔

گاؤں میں ہر طرف فوراً خبر پھیل گئی کہ دریا سے ایک تابوت ملا ہے۔ جس میں ایک عورت کی لاش ہے۔ گاؤں کی عورتیں اور مرد مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کی طرح اکٹھے ہو کر لاش دیکھنے کیلئے آنے لگے۔ فاطمہ گل کی لاش کے چہرے پر نور کا ہالہ تھا اور بند مٹھی میں ایک پرچہ تھا۔

فاطمہ گل کی ماں، اس کا خاندان اور بیٹے اپنا گاؤں چھوڑ کر اتفاقاً اسی گاؤں میں ٹھہرے تھے۔ وہ بھی لاش دیکھنے پہنچ گئے۔

گاؤں کے ایک معتبر شخص نے فاطمہ گل کے ہاتھ سے پرچہ کھول کر پڑھا۔

"آگ کے شعلوں سے کھیل کر اس شہید لڑکی نے کشمیری لڑکیوں کی بھارتی فوجیوں سے عزتیں بچائی ہیں۔ آخر کب تک اور کمال ذہانت سے دشمن کو جہنم واصل بھی کیا اور پیچھے بھی دھکیلا ہے۔ خوف وہراس کی اس فضا میں ہم گاؤں والوں کو کچھ نہیں سوجھ رہا۔ ہمیں افسوس رہے گا کہ ہم اس شہیدہ کو اپنے گاؤں میں دفن نہ کر سکے۔ ہم آخری بار اس لاش کو تابوت میں بہتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔ آخر یہ تابوت ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ جس کسی صاحبِ ایمان کو یہ تابوت ملے وہ اس شہیدہ کی لاش کو احترام سے دفن کر دے۔ بے شک شہادت قابلِ رشک زندگی کا نام ہے۔

☆☆......☆☆

پانچویں سچ بیانی

قسمت کے کھیل نرالے ہیں

نازیہ بتول رضا

ایک دوشیزہ کی زندگی سے جڑا وہ سچ جو قسمت کی خوش نصیبی بن گیا

میں کافی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ عاصم کچھ چپ چپ سے ہیں زیادہ بات چیت سے گریز کر رہے ہیں۔ اکثر مجھ سے نظریں چراتے میں کوئی بات کر رہی ہوتی وہ کہیں اور گم ہوتے یا پھر موبائل میں گم!

آفس سے آنے کے بعد دو دو گھنٹے چھت پر اکیلے گزار دیتے یا پھر آفس سے لیٹ آتے یہ ساری باتیں مجھے اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھیں۔ عاصم کی خاموشی مجھے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی شروع میں مجھے لگا کہ شاید آفس کا کوئی مسئلہ ہے۔ لیکن پوچھا تو ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر آخر مسئلہ کیا تھا؟ عاصم ایسے تو ہرگز نہیں تھے عاصم اور سنجیدگی دو الگ الگ باتیں تھیں اور اب صورت حال ہی الگ تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں بے چین روح کی طرح بھٹک رہی تھی کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگ رہا تھا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا آخر بات کیا ہے؟

☆......☆......☆

عاصم میرے خالہ زاد ہیں بچپن ساتھ کھیلتے گزرا کزن ہونے کے ناطے ہم ایک دوسرے کے گھر آزادی سے آتے جاتے تھے۔ گھومنا پھرنا، ہنسی مذاق، بلہ گلہ کرنا بس یہی ہمارے مشاغل تھے ہم نے کب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا پتا ہی نہ چلا۔

عاصم کے تین بھائی ہیں۔ بہن کوئی نہیں ہے اور ہم پانچ بہنیں ہیں بھائی کوئی نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے گھل مل کر رہتے تھے ایک بار عاصم کی امی یعنی خالہ جان شدید بیمار ہو گئیں۔ بیٹی ہوتی تو گھر کی بھی دیکھ بھال کر لیتی اور ماں کی تیمارداری بھی کر لیتی۔ ہم سب انھیں دیکھنے گئے خالہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نقاہت کے باعث اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ گھر بھی پھیلا ہوا تھا اور کچن بھی!

میں نے جلدی جلدی صفائی کی کچن سمیٹا خالہ کے لیے دلیہ اور سب کے لیے کھانا تیار کیا خالہ جان نے مجھے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں رات ہو رہی تھی سارے مرد حضرات بھی آ چکے تھے میں نے جلدی جلدی کھانا ٹیبل پر لگا دیا۔ کھانا سب کو بے حد پسند آیا اس دن میں نے پہلی بار عاصم کی نظروں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی۔ میں جھینپ گئی سب نے کھانے کی اتنی تعریف کی کہ میری محنت وصول ہو گئی، اور پھر رات کو جاتے وقت امی مجھے خالہ جان کے پاس ان کی تیمارداری کے لیے چھوڑ گئیں۔ میں واپس جانا چاہ رہی تھی لیکن زیادہ انکار کرنا اچھا نہیں لگا، اور پھر میں تین دن خالہ جان کے گھر رہی ان تین دنوں میں، میں نے خالہ کی بہت خدمت کی انھیں اٹھنے نہیں دیا اور گھر کا بھی خیال رکھا

خالہ جان تو مجھ پر فدا ہو گئیں۔ میرے صدقے واری جاتیں اور عاصم مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتے میں جھینپ جاتی۔ عاصم کی نظریں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور میں سمجھ کر بھی انجان بن رہی تھی کیونکہ میں ایک عام سی شکل وصورت والی لڑکی ہوں۔ میں بے کار کے خوابوں میں الجھ کر خود کو دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے جب تیسرے دن ابو مجھے واپس لینے آئے تو میں کھل اٹھی۔ کچن میں چائے بنانے گئی تو عاصم پیچھے پیچھے چلے آئے۔

''حمیرا'' انھوں نے مجھے بڑے پیار سے پکارا میں چونک گئی۔ ''جی!''

''دیکھو حمیرا میں بہت جلد تمہارے گھر آؤں گا امی کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگنے...... منع تو نہیں کرو گی ناں؟'' وہ بڑے آرام سے کہہ گئے۔ اور میں ہکا بکا رہ گئی۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کیونکہ عاصم بہرحال بہت اسمارٹ تھے ہینڈسم تھے۔ کم از کم مجھ سے بہت زیادہ۔ انھیں ایک سے ایک لڑکی مل سکتی تھی اور کہاں میں سانولی سی عام شکل وصورت والی لڑکی۔ میرا حیران ہونا بجا تھا میں کچھ بھی نہیں بول پائی۔ عاصم میری خاموشی کو رضامندی سمجھے اور وہاں سے چلے گئے۔

میں اسے وقتی ابال سمجھ رہی تھی اسی لیے میں نے ذہن جھٹک دیا اور مطمئن ہو کر گھر آ گئی۔ میرے گھر آنے کے تقریباً ایک ہفتے بعد ہی خالہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ ہمارے گھر موجود تھیں۔ لیکن وہ پوری تیاری سے آئیں تھیں مٹھائی، میرے لیے بہترین سوٹ، چوڑیاں، ہار پھول۔ امی اور ہم سب حیران تھے میں کچھ کچھ سمجھ رہی تھی لیکن خالہ کو یقین کیسے تھا کہ ہماری طرف سے انکار نہیں ہوگا۔

''آپا یہ سب!'' امی حیرانگی کے باعث بات مکمل نہ کر سکیں کیونکہ میری عام سی شکل وصورت کے باعث امی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ خالہ جان مجھے عاصم کے لیے چنیں گی اور خود عاصم کے بارے میں بھی ہماری یہی سوچ تھی کہ ان کی پسند بہت اعلیٰ وارفع ہو گی اس



لیے ہماری حیرانگی بجا تھی۔
''کچھ نہیں بس میں یہ سب اپنی بیٹی حمیرا کے لیے لائی ہوں۔'' خالہ نے مجھے خود سے لگا کر میری پیشانی چوم لی۔ ''حمیرا آج سے عاصم کی امانت ہے کیوں تمھیں کوئی اعتراض تو نہین ہے؟'' خالہ امی سے پوچھ رہی تھیں ابو بھی چھٹی کے باعث گھر میں ہی تھے۔ امی ابو ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے اتنا تو میں جانتی تھی کہ وہ دونوں ہی اس رشتے سے بہت خوش ہوئے تھے۔ کیونکہ جو رشتہ آتا وہ مجھ سے چھوٹی بہن کو پسند کر جاتا چوں کہ میں بڑی تھی اس لیے امی ابو پہلے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میری عام سی صورت اور اس پہ سانولی رنگت میری شادی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی امی ابو کی پریشانی فطری تھی اور اب یہ رشتہ اللہ کی رحمت ہی تھا امی سنبھل کر بولیں۔ ''نہیں آپا میرے لیے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی کہ حمیرا آپ کے گھر کی بہو بنے عاصم میرے سامنے کا بچہ ہے آپ اپنے بھائی صاحب سے پوچھیں جوان کی مرضی!'' امی نے گویا فیصلے کا اختیار ابو کو دیا میں وہاں سے اُٹھ کر جانا چاہتی تھی لیکن خالہ مجھے تھامے بیٹھی تھیں۔
''ٹھیک ہے آپا جیسے آپ کی مرضی میں اسے حمیرا کی خوش قسمتی سمجھوں گا کہ وہ آپ کے گھر کی بہو بنے۔'' رشتہ منظور کرلیا گیا خالہ نے جھٹ مجھے انگوٹھی پہنادی۔ (انگوٹھی بھی وہ ساتھ لائی تھیں) سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔ میری نظر غیر ارادی طور پر عاصم کی سمت اُٹھی وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے میں نے فوراً نظریں جھکالیں اور وہاں سے تیزی سے اُٹھ گئی اور اپنے کمرے میں ہی آ کر دم لیا۔
اُف! کیا خواب ایسے بھی پورے ہوتے ہیں؟ من ہی من میں نجانے کب میں عاصم کو پسند کرنے لگی تھی لیکن جانتی تھی کہ عاصم کی نگاہِ التفات مجھ پر کبھی نہیں ٹھہرے گی۔ آخر میں عام سی لڑکی تھی اور میرے بھی کچھ خواب تھے کچھ خواہشات تھیں کچھ جذبات تھے۔ جب کبھی یہ خواب، یہ خواہشات اور یہ جذبات مجھے دیوانہ بنائے تو میں بے دردی سے انھیں سرزنش کر کے سلا دیتی تھی۔ ''حمیرا تم ایک عام سی لڑکی ہو اتنے اونچے خواب مت دیکھو کہ تم بلندیوں سے گر کر بستیوں میں جا بسو تم عام سی لڑکی ہو تمہارے لیے کوئی شہزادہ نہیں آئے گا بلکہ کوئی عام سا آدمی تمہارا شریکِ سفر بنے گا۔ خدارا پلٹ آؤ۔''
لیکن اب میرے خواب سچ ہونے جا رہے تھے۔ میرے سرکش جذبے پھر سے سر اٹھا رہے تھے۔ عاصم کی محبت کا ننھا پودا میرے دل میں تناور درخت ہو رہا تھا اور یہ سب پل بھر میں ہوا تھا میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئی اور پھر جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا اور تین مہینے بعد ہی میں عاصم کے گھر دلہن بن کر آ گئی۔ عاصم میرے دیوانے تھے نجانے انھیں میری کون سی ادا بھا گئی تھی۔ شاید میری خدمت جو کہ میں ہر ایک کی کرتی تھی خالہ خالو جواب میرے ساس سسر تھے ان کی ہر ذمہ داری میں اپنے سر لے لی تھی خالہ کو تو میں اٹھنے نہ دیتی تھی ہر کام میں اپنے ہاتھوں سے ہی کرتی۔ کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی خالہ کبھی کبھی ساس بن جاتی تھیں میں خاموشی سے ان کی ہر بات سن لیتی کبھی اُف تک نہ کرتی۔ یونہی چار سال بیت گئے اور میری گود میں تین ننھی منی پریاں آ گئیں پہلی اور دوسری بیٹی کی پیدائش پر تو سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن جب تیسری بیٹی ہوئی تو مجھے خالہ کا چہرہ بجھا بجھا لگا وہ شاید بیٹے کی آس لگائے بیٹھی تھیں میں کیا کر سکتی تھی یہ سب تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس میں بندے کا کیا دخل!
بہرحال کسی کے دل میں کچھ بھی ہو میری بیٹیاں میری جان ہیں اور میں جی جان سے ان کی پرورش کر رہی تھی۔ عاصم بھی بیٹیوں کو بہت چاہتے تھے۔ لیکن ابھی نجانے کیا بات تھی میں محسوس کر رہی تھی کہ عاصم مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں۔ آفس سے لیٹ آنا، آتے ہی پھر کمرے میں بند ہو جانا یا پھر چھت پر چلے جانا شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ لیکن ہچکچا رہے تھے اور یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو عاصم کہنے میں ہچکچا رہے تھے۔
میں بہت پریشان رہنے لگی تھی ہر کام الٹا ہو رہا تھا۔ خالہ کی باتیں سننی پڑ رہی تھیں لیکن میں مجبور تھی کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ عاصم سے کئی بار پوچھا تو وہ ٹال گئے۔

☆......☆......☆

اس دن سردی اپنے عروج پر تھی ہوائیں منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑ رہی تھیں۔ میری تینوں بیٹیاں دبکی ہوئی سو رہی تھیں اور میں بھی بچیوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ جبھی میری آنکھ کھلی عاصم شاید فون پر بات کر رہے تھے۔ لیکن وہ کمرے میں نہیں تھے میں اُٹھ بیٹھی آواز کمرے کے باہر لاؤنج سے آ رہی تھی۔ عاصم اتنی رات گئے کس سے بات کر رہے ہیں میں بڑبڑائی بستر سے نکل آئی۔ خالہ خالو اور دیور نیچے کے پورشن میں تھے۔ جبکہ میرا پورشن اوپری منزل پر تھا شاید اسی لیے عاصم بےفکری سے لاؤنج میں ٹہل ٹہل کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے شال اپنے گرد لپیٹی اور باہر نکل آئی عاصم کی پشت میری طرف تھی اور میں بے آواز باہر نکلی تھی اس لیے عاصم کو خبر نہ ہو سکی۔ عاصم کہہ رہے تھے۔ ''میں نے کہا ناں کہ میں جلد ہی تمہارے بارے میں سب کو بتا دوں گا بس کچھ دن اور صبر کرلو ابھی حمیرا امید سے ہے میں اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا اور پھر ہمارا نکاح تو ہو چکا ہے ناں پھر......!'' عاصم کہتے کہتے پلٹے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ''تم......تم یہاں!'' عاصم کے منہ سے گھبراہٹ میں بے ربط الفاظ نکلے اور میں نے جو نا جانے کب سے ضبط کیے کھڑی تھی ڈھے گئی عاصم نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا میں ایک دم پیچھے ہٹی۔ ''عاصم کیا ہے یہ سب...... آپ نے نکاح کرلیا ہے۔ مجھے دھوکا دیا میرے پیار کے ساتھ مذاق کیا کیوں کیا یہ سب عاصم کیوں کیا؟''
میں عاصم کا گریبان پکڑے روئے جا رہی تھی اور عاصم مجھے چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مجھے صوفے تک لے آئے پانی پلایا میں نے ایک گھونٹ پانی پیا۔ ''نہیں عاصم آپ پہلے میرے سوالوں کے جواب دیں آپ نے ایسا کیوں کیا۔ مانا میں خوب صورت نہیں ہوں لیکن آپ نے خود ہی مجھے پسند کیا تھا اب میں آپ کی بیوی ہوں میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ تو مجھے جان سے مار ڈالیے لیکن مجھ پہ سوتن نہ لایئے پلیز میں...... میں نہیں جی پاؤں گی عاصم پلیز۔''
میں بے تحاشا ہاتھ جوڑے رو رہی تھی عاصم سر پکڑے بیٹھے تھے۔ جو راز وہ نجانے کب سے چھپائے بیٹھے تھے وہ اچانک فاش ہو چکا تھا اب مجھے اصلیت بتانے کے سوا عاصم کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

''دیکھو حمیرا میں کافی دن سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن تمہاری حالت کے پیشِ نظر خاموش تھا۔ لیکن اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔'' عاصم لمحے بھر کو ٹھہرے شاید لفظوں کو جوڑ رہے تھے اور میں عاصم کے منہ سے اعتراف سن کر اور شدت سے رونے لگی عاصم گھبرا کر بولے۔

''حمیرا پلیز تم رونا تو بند کرو میری بات تو سنو۔ اس کا نام ندا ہے۔ میرے آفس میں ہی کام کرتی ہے نجانے کب میں اسے پسند کرنے لگا اور وہ بھی مجھے چاہنے لگی۔ پھر جب مجھے تمہارا اور بچیوں کا خیال آیا تو میں کھینچنے لگا وہ تڑپ اٹھی بولی۔ ''عاصم آپ مجھ سے کھنچے کھنچے کیوں رہنے لگے ہیں۔''

''میں شادی شدہ ہوں اور تین بیٹیوں کا باپ ہوں۔'' میں نے اُسی سچائی بتائی وہ اطمینان سے بولی۔ ''تو اس میں نیا کیا ہے میں جانتی ہوں سب۔''

''لیکن میں تم سے شادی نہیں کرسکتا میں حمیرا کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

''کیوں اس میں دھوکہ کیسا؟ جب میں ایک ہی گھر میں حمیرا کے ساتھ رہنے پر راضی ہوں تو وہ بھی مان جائے گی لیکن اب میں آپ کی محبت میں اتنا آگے نکل آئی ہوں کہ اب واپسی ناممکن ہے۔ میں گھر میں امی کو اپنے بارے میں بتا چکی ہوں پلیز اگر آپ کو شادی نہیں کرنی تھی تو میری جانب قدم کیوں بڑھائے تھے۔ میری آنکھوں میں اپنے خواب کیوں سجائے تھے اب جب میں اتنا دور نکل آئی ہوں تو آپ مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کی بات کررہے ہیں میں نے کہا ناں کہ میں سب سہہ لوں گی۔ حمیرا کے طعنے بھی سہہ لوں گی لیکن آپ کی دوری نہیں سہہ سکتی میں مرجاؤں گی۔'' وہ رو پڑی تھی اور تب میں مجبور ہوگیا تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اس طرف پیش قدمی بھی میں نے ہی کی تھی وہ بے چاری تو ضرورت کے تحت نوکری کررہی تھی۔ کیونکہ ابو کے انتقال کے بعد ساری ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آپڑی اس کے گھر میں ایک چھوٹی بہن اور ماں کے سوا کوئی نہ تھا چھوٹی بہن کی شادی کر کے اب وہ مجھ سے شادی کی خواہش مند تھی۔ اس کی ماں بھی راضی ہوگئی تھی لیکن اب میرا پیچھے ہٹنا غلط تھا۔ اس لیے دو ماہ پہلے ہم نے نکاح کرلیا اور اب ندا بضد ہی کہ میں اسے یہاں لے آؤں اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟'' عاصم خاموش ہوئے اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں کیا فیصلہ کرتی سارے فیصلے تو عاصم خود ہی کرچکے تھے اب تو بس ندا کو گھر میں لانے کی دیر تھی اور میں اس کے لیے خود کو تیار نہیں کر پارہی تھی بہت مشکل تھا سوتن کے عذاب کو سہنا۔ میں اس وقت کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی میں توڑ پھوڑ کا شکار تھی میرے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے میں خاموشی سے اٹھی اور کمرے میں آ کر دروازہ لاک کرلیا اور اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگی۔

صبح عاصم آفس کے لیے تیار ہورہے تھے بولے۔ ''تو پھر کیا سوچا تم نے؟''

''میرے لیے سوچنے کو آپ نے چھوڑا ہی کیا ہے۔'' میں جل کر بولی۔

''حمیرا پلیز۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو جو ہونا تھا وہ ہوچکا اب اس سب کا کوئی فائدہ نہیں اپنا دل بڑا کرو اور پھر میں اسی گھر میں رہوں گا اور......''

''اور ندا بھی ہوگی۔'' میں نے بات اچک لی۔ ''ہاں'' عاصم اطمینان سے بولے۔

''آپ مجھے امی کے گھر چھوڑ سکتے ہیں یا میں خود چلی جاؤں۔'' میں تیزی سے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں چھوڑ دیتا ہوں شاید وہاں جا کر تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔'' عاصم تھک کر بولے۔

میں بیگ تیار کرچکی تھی بچیاں بھی تیار تھیں اور صبح صبح نانو کے گھر جانے پر خوش بھی تھیں انھیں کیا پتہ کہ ان کی ماں پر قیامت گزر گئی ہے۔

بہرحال عاصم نے ہمیں چھوڑ دیا اتنی صبح امی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ لیکن میں نے کہا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے آ گئی۔ لیکن وہ ماں تھیں سمجھ گئیں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ رات کو بچیوں کی سونے کے بعد وہ میرے کمرے میں چلی آئیں میں لیٹی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ امی نے ایک دم آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا میں اٹھ بیٹھی۔ ''امی آپ......! بیٹھیں۔'' میں نے انھیں جگہ دی۔

''حمیرا کیا بات ہے عاصم سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟

میں دیکھ رہی ہوں تم جب سے آئی ہو اداس ہو کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا آ کر کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے بچے؟ اب مجھ سے کچھ مت چھپاؤ بتادو بیٹا۔'' امی آبدیدہ ہوگئیں اور میرا ضبط ٹوٹ گیا میں امی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اپنی قسمت پر اپنی ناقدری پر اپنی حق تلفی پر اور...... اور اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر......

امی نے مجھے رونے دیا اور پھر میں سسکیوں کے درمیان امی کو سب بتاتی چلی گئی امی نے میری بات سنی ان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے پھر وہ سنبھل کر بولیں۔ ''بیٹا میں تمہارا کچھ دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ عورت سب برداشت کرسکتی ہے لیکن سوتن نہیں بیٹا میری مانو تو اس کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلو اور پھر عاصم تمہارے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ تم دل بڑا کرلو تو اس کے دل میں تمہاری قدر بڑھ جائے گی۔ نکاح تو وہ کرچکا ہے اگر تم لوٹ کر گھر نہ گئیں تو کہیں اپنے شوہر کو ہی نہ کھو دو۔ کیونکہ ندا تمہارے ساتھ رہنے کو تیار ہے بیٹا سمجھداری سے کام لو اور عقل مندی سے شوہر کے دل میں اپنی جگہ برقرار رکھو۔ یاد رکھو دل میں وہی ہوتا ہے جو نظر کے سامنے ہو اگر تم دور رہیں تو عاصم کے دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے دل سے اور گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ گی اور پھر یاد رکھو کہ تمہاری تین بیٹیاں ہیں۔ کیا تم اکیلے ان کی بہتر پرورش کر پاؤ گی بیٹا تم اپنی انا کے لیے ان معصوموں پر ظلم مت کرو یہ کچھ نہیں جانتیں یہ تمہیں ہی قصوروار ٹھہرائیں گی اور دنیا والے بھی تم کس کس کے آگے اپنی صفائی پیش کروگی۔'' امی مجھے دھیمے لہجے میں سمجھا رہی تھیں اور میں جو طلاق پر بضد تھی اب خاموش بیٹھی تھی میرے ارادے مٹی کے تودے ثابت ہوئے پل بھر میں ڈھے گئے۔ میں کتنی مجبور تھی اپنی بے بسی پر رو پڑی۔

''لیکن امی میں کیسے...... کیسے رہوں گی اس عورت کے ساتھ...... میں کیسے عاصم کو اس عورت کے ساتھ برداشت کر پاؤں گی کیسے۔'' میں امی سے پوچھ رہی تھی۔

''بیٹا زندگی کے بہت سے کام ہمیں پسند نہیں ہوتے لیکن ہمیں کرنا پڑتے ہیں۔ ہر شخص قسمت کے آگے مجبور ہے اور عورت تو نام ہی قربانی کا ہے۔ تم ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو میں اپنا کوئی بھی فیصلہ یا حکم تم پر مسلط نہیں کروں گی تم اپنی زندگی کے فیصلوں کی خود مختار ہو میں بحیثیت ایک ماں تمہیں بوجھ نہیں سمجھوں گی۔ ہاں تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے جو تمہارے اور تمہاری اولاد کے حق میں بہتر تھا وہ میں نے سمجھا دیا اب ماننا نہ ماننا تمہارے ہاتھ میں ہے تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔'' امی نے میری پیشانی چومی اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں اور میری پوری رات سوچوں میں گزری امی سچ ہی کہہ رہی تھیں۔ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا پہلے باپ کا گھر پھر شوہر کا گھر اور پھر اولاد کا گھر۔

عورت اپنی ساری زندگی قربانی و ایثار اور خدمت میں گزارتی ہے اس کے باوجود اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا آخر کیوں عورت اتنی بے بس ہوتی ہے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے زہر کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ رات بھر سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا پھر بالآخر اولاد کی خاطر میں نے یہ زہر کا گھونٹ پینے کا فیصلہ کرلیا۔ میں صبح اٹھی فجر کا وقت تھا میں رب کے حضور سجدہ ریز ہوگئی یہ میرے رب کا کرم ہی تھا کہ عاصم نے مجھے طلاق نہیں دی تھی اور نہ ہی ندا نے زور دیا تھا۔ ورنہ میری معصوم بچیوں کا کیا ہوتا میں نے عاصم کو فون کردیا کہ مجھے لینے آجائیں عاصم میرے فیصلے سے بہت خوش ہوئے اور اسی دن میں اپنے گھر چلی آئی۔ میں بہت پرسکون تھی ایک ہفتے بعد ہی میں نے ایک اور بیٹی کو جنم دیا اب میری چار بیٹیاں ہیں۔ عاصم ہمیشہ کی طرح خوش تھے۔ میں دل ہی دل میں ان کی بڑائی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکی اسی ہفتے ندا بھی گھر میں آ گئی۔ سمجھوتہ تو میں پہلے ہی کرچکی تھی اب دل سے ندا کو قبول کرلیا۔ عاصم نے ندا کے لیے اوپر کا پورشن تیار کروالیا تھا۔

ندا وہاں شفٹ ہوگئی ہم مل جل کر رہنے لگیں۔ عاصم انصاف اور برابری کا دامن تھامے رہے ایک سال بعد ندا کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو میں نے عاصم کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی ایسی جھلک دیکھی کہ اس سے پہلے نہ دیکھی تھی خالہ بھی بہت خوش تھیں اور میں...... میں بھی خوش تھی عاصم کا بیٹا میرا بھی تو بیٹا تھا۔

☆☆☆

کوئی خوشیاں لا دے

منعم اصغر

ڈی جی خان سے ایک اپنی چاچی کی خوشیاں مانگتے ایک بھتیجے کی سچ بیانی

میرا گاؤں سندر والا۔ ”چاہ سندر والا“ جس میں میں نے بچپن کے بارہ سال گزارے ہیں۔ سندر والا گاؤں جہاں کے رہنے والے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے محبت کا سمندر ٹھاٹیں مارتا ہے۔ میں اسی گاؤں میں 2001 میں پیدا ہوا۔ میرے ابو کے تین بھائی ہیں۔ یعنی ایک میرے ابو جن کا نام اصغر دوسرے میرے چاچو جن کا م راشد اور تیسرے سب سے چھوٹے اور میرے پیارے پیارے چاچو ظفر۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ یعنی کمرے تو ہر چاچو کے الگ الگ تھے جیسے پہلے دو کمرے بڑے چاچو کے جن کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ پھر دو کمرے میرے ابو کے جن کے ہم چار بچے ہیں۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ پھر میرے چھوٹے چاچو ظفر جن کے صرف دو ہی بچے ہیں۔ ایک بیٹی ذونیرہ اور ایک بیٹا عمار معاویہ۔ اس طرح گھر تو سب کے الگ مگر صحن ایک ہی تھا اور گاؤں تھا اس لیے صحن بہت بڑا تھا جس میں میں اپنی کزنز کے ساتھ کرکٹ بھی کھیل لیا کرتا تھا۔

......☆☆☆......

میری یہ کہانی میرے چھوٹے چاچو کی کہانی ہے۔ اور یہ کہانی میں نے ان کا دکھ محسوس کر کے لکھی ہے۔

میں دو سال پہلے چھٹی کلاس میں تھا کہ میرے ابو جو کہ سعودی عرب میں بسلسلہ روزگار مقیم ہیں۔ گھر تشریف لائے اور میں نے انہیں امی سے کہتے سنا۔ ”گاؤں میں تو ویسے بھی اتنی پڑھائی نہیں ہے جبکہ میں منعم کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں اس لئے اب ہمیں شہر شفٹ ہو جانا چاہیے۔“ میں بھی خوش ہو گیا۔ البتہ میرے کزنز اداس ہو گئے۔ میرے بڑے چاچو کے بیٹے سعودیہ میں ہوتے ہیں اور اب میرے چھوٹے چاچو بھی۔ میری چھوٹی چاچی زینب ہم سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں۔ ان کی بیٹی ذونیزہ جسے میں پیار سے (سمیرا) کہتا ہوں اور بیٹا عمار جسے ہم پیار سے (راجہ) کہتے ہیں اور مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ذونیزہ سات سال اور عمار چھ سال کا تھا اور ہم شہر شفٹ ہو گئے۔

......☆☆☆......

اس طرح میں اپنی گاؤں کو چھوڑ کر شہر آ گیا۔ میں ساتویں جماعت میں تھا جب گاؤں گیا۔ زینب چاچی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں میں خود بھی بہت خوش ہوا سب سے مل کر۔ شام کو میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ ذونیزہ اور عمار کو فیڈر میں دودھ پلا رہی تھیں۔

”آؤ منم (منعم) چاچی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے یہ ابھی تک فیڈر میں دودھ پیتے ہیں کیا؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا اور چاچی کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ کر ذونیرہ کا سر اپنی گود میں رکھا۔

”ہاں یہ کہتے ہیں کہ گلاس میں دودھ اچھا نہیں لگتا۔“ چاچی ہنسنے لگی۔ ”تم سناؤ کہاں تھے۔ کھانا کھایا کہ نہیں؟

”ہاں کھا لیا تھا۔“ میں نے جواب دیا تو وہ بولیں۔ کہاں کھایا ہوگا۔ ٹھہرو میں لاتی ہوں آج تو



میں نے کچھ نہیں بنایا کل تمہاری پسند کا کھانا بناؤں گی۔“ چاچی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آیا نہیں چاچی اپنا ہی گھر ہے۔ ابھی کھانا نہیں کھانا' میں رات کو دس بجے کھانا کھانے کا عادی ہوں تب کھاؤں گا۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا تو وہ بیٹھ گئیں۔

”اور سناؤ پڑھائی اچھی جا رہی ہے۔“ چاچی نے پوچھا۔

جی اچھی جا رہی ہے۔ ذونیرہ اور راجہ سکول جاتے ہیں؟

”ذونیرہ تو جاتی ہے پر ابھی راجہ نہیں۔“

”اچھا چاچی آپ ذونیرہ کا رشتہ نا میرے چھوٹے بھائی کو ہی دینا۔“ میں نے کہا تھا میرا بھائی بھی سات سال کا ہے۔

”ہاں چاچی نے بس ہاں کہا ظاہر ہے اب بچے رشتہ طے تھوڑی کرتے ہیں پھر چاچی بولیں۔

”تمہیں راجہ بہت یاد کرتا ہے۔“ وہ کچھ اداس ہوئیں۔

”اچھا راجہ راجہ۔“ شرمانے لگا۔

”منم (منعم) تم شودیہ (سعودیہ) گئے تھے نا؟“

وہ میرے شہر جانے کو سعودیہ کہہ رہا تھا مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر چاچی بولیں۔

”میں کل ڈاکٹر کے پاس گئی تھی......یہی جو اپنے گاؤں کا ڈاکٹر میں ابھی بیٹھی تھی کہ دو عورتیں آ گئیں۔ کالے برقعے، نئے کپڑے، اونچی کھیڑی (ہیل) والے جوتے اور ٹانگ پے ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئیں۔“

”اچھا پھر۔“ میں نے سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

میں نے سوچا کہ دیکھو کتنی پڑھی لکھی لگ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر ڈاکٹر نے انہیں تھرمامیٹر دیا کہ زبان کے نیچے رکھو۔ عورت نے نیچے رکھا اور تھوڑی دیر بعد جب ڈاکٹر تھرمامیٹر لینے آیا تو پتا ہے کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' میں سیدھا ہو بیٹھا۔

''ہونا کیا تھا عورت نے منہ سے تھرمامیٹر نکالا تو وہ دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر چیخا کہ یہ کیا کیا؟ تو وہ عورت بولی کہ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ منہ میں رکھو میں نے رکھا تو دانت کے نیچے آ کر ٹوٹ گیا۔''

چاچی نے بات ختم کی تو میرے ساتھ ساتھ راجو اور ذونیرہ نے بھی قہقہہ لگایا اور پھر ہم دیر تک ہنستے رہے۔ اور پھر ہر دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی میں چاچی کے کمرے میں ہی سویا تھا۔

......☆☆☆......

اگلے دن میرے منع کرنے کے باوجود چاچی نے چاول، گوشت، کولڈ ڈرنک وغیرہ منگوالی تھی۔

جب وہ لینے آئیں تو کھانا کھا چکا تھا اس لیے میں نے منع کر دیا تو وہ ناراض ہونے لگیں۔ مجبوراً مجھے بھرے پیٹ کو اور بھرنا پڑا۔

اس دن میری شہر واپسی تھی۔ میں نے ذونیرہ اور عمار کو پیار کیا اور سب کو خدا حافظ کہنے لگا۔ حسب عادت چاچی نے میرے ناںا کرنے کے باوجود جیب میں پیسے ڈال دیے۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے پیسے دینے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے۔ خیر میں شہر آ گیا۔

......☆☆☆......

یہاں گھر بھی وہ ہر تیسرے دن فون کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا تھا کہ اتنے پیار کرنے والے لوگ ملے ہیں مجھے مگر......

وہ 2013 کا ایک بدترین دن تھا۔ رمضان مبارک کو ابھی کچھ دن رہتے تھے کہ اس دن میں دوپہر کو سو کر اٹھا۔ یہ ابھی پچھلے سال جب میں ساتویں جماعت میں تھا کہ میرے نمبر پر بڑی چاچی کا فون آیا۔

''منعم راجو کی سخت حالت خراب ہے۔ اسے ایمرجنسی لے گئے ہیں۔ تم فوراً وہاں جاؤ اور ہمیں صورت حال سے آگاہ کرو۔''

میں چکرا کر رہ گیا مجھے اتنی محبت اپنے چھوٹے بھائی سے نہیں تھی۔ جتنی ذونیرہ عمار سے تھی۔ اب تو امی نے باتوں باتوں میں چاچی پر یہ بھی جتا دیا تھا کہ ذونیرہ کو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے لیں گی۔ میں اور چاچی نہال ہو گئے۔

خیر میں نے ابو کو بتایا اور ہم ایمرجنسی روانہ ہو گئے مگر وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

میرا راجہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ مجھے دھچکا لگا تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا' کان سائیں سائیں کرنے لگے غرض کسی غیر کی وفات پر عورتوں کی طرح رونے والا منعم اس وقت خاموش بیٹھا تھا۔ آنسو تھے کہ نکلنے کا نام نہ لے رہے تھے شاید مجھے ابھی تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

......☆☆☆......

ہم گاؤں پہنچے تو سندروالا غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے صحن میں قدم رکھا تو دل کے ہزار ٹکڑے ہو گئے۔ چاچی میلے کپڑے پہنے بال کھولے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں جا کے ان کے گلے سے لپٹ گیا جب چاچی بولیں۔

''دیکھ منعم آج راجہ ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ دیکھو آج تم آئے ہو تو ہمیشہ کی طرح اس بار راجہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس نہیں لایا نہ یہ پوچھ رہا ہے کہ تم سعودیہ کیوں گئے۔ میرا عمار جا رہا ہے مجھے چھوڑ کر۔ کاش تم شہر نہ جاتے نہ راجہ مجھے چھوڑ کر جاتا۔

وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور میں ٹکٹکی باندھے راجہ کو دیکھ رہا تھا۔ جو واقعی اس وقت راجہ لگ رہا تھا مگر اب وہ ہم سے دور جا چکا تھا۔

......☆☆☆......

مجھے بتایا گیا کہ دادا جان شام کے وقت راجہ کو لے کر بھینس چرانے جاتے اور وہیں بہتے سمندری نالے میں بھینس کو نہلاتے۔ اس دن راجہ اکیلے وہاں گیا تھا اور خود ہی نہانے لگا۔ سمندری نالہ اتنا گہرا نہیں ہے ہم لڑکے وہاں نہاتے ہیں مگر راجہ چھوٹا بچہ تھا وہ ڈوب گیا۔ چاچی کو پتا چلا تو وہ اندر کود گئی اور سب ڈھونڈنے لگے مگر جب تک وہ ملا تب تک دیر ہو چکی تھی۔

راجہ کو دادا سے بہت محبت تھی چاچی بتاتی ہیں کہ راجو کی آنکھیں اس وقت تک آدھی کھلی رہیں جب تک دادا نہیں آئے۔ جب دادا آئے تب راجہ کی آنکھیں بند ہو گئیں ہمیشہ کے لیے۔

......☆☆☆......

دو دن میں چاچو بھی آ گئے تھے۔ وہ بھی خوب روئے۔ کیونکہ چاچی کو شاید بلڈ کی کوئی تکلیف تھی' بچے پیدا کرنے سے ان کی جان کو خطرہ تھا۔ ذونیرہ کے بعد راجہ کی ولادت قریب تھی تو چاچی کی طبیعت خراب ہو گئی اور راجہ سات ماہ میں پیدا ہوا مگر خدا کی قدرت کہ وہ بالکل ٹھیک اور نارمل تھا۔ ڈاکٹر نے چاچی کو مزید اولاد سے سخت منع کیا تھا۔ اور راجہ کو پا کر چاچی خوش ہو گئی تھیں کہ اب انہیں مزید بچہ نہیں چاہئے انکی فیملی مکمل ہے مگر اب ایک بار پھر فیملی ادھوری ہو چکی تھی۔

......☆☆☆......

اور اب جب میری پہلی کہانی چھپی تو میں گاؤں گیا۔ چاچی کو بتایا تو وہ خوش ضرور ہوئی مگر ہنسی نہیں۔ وہ بولیں منعم آج 2015 میں تم 14 سال اور راجہ 7 سال کا ہو جاتا۔ وہ بہت اداس تھی۔

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ مجھے میری وہی پہلے والی چاچی چاہیے تھی جو میرے ساتھ بالکل بچی بن جایا کرتی تھیں۔ مجھے میری وہ چاچی چاہیے تھی جو ہنس ہنس کر قہقہہ لگا کر بات کرتی تھیں وہ چاچی پتا نہیں کہاں کھو گئی ہیں۔ ذونیرہ کو بلاتا ہوں تو وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی تھی۔ ایک دن میں نے پوچھا۔ ذونیرہ راجہ یاد آتا ہے؟ تو وہ بولی۔

''وہ تو ابو کے پاس سعودیہ گیا ہے۔'' میں بے اختیار رونے لگا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کہیں سے ساری خوشیاں لا کر چاچی کی جھولی میں ڈال دوں۔

چاچی نے مزید اولاد کے لیے دوبارہ سے علاج شروع کر دیا ہے اب وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی ہیں۔

مجھے یہ سن کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ سات سال کی ذونیرہ دوبارہ قرآن ختم کر چکی ہے اور اب

قرآن حفظ کر رہی ہے۔ اب چاچی پہلے کی طرح تو نہیں البتہ پہلے سے بہتر ہو گئی ہیں۔ اب میں انہیں ہنسانے پر مجبور کر ہی دیتا ہوں اور وہ بھی اب ہنسی پر پہرے نہیں بٹھاتیں۔

میں تو کبھی کبھی گاؤں جاتا ہوں مگر چاچی اب بہتر ہیں۔ چاچی کہہ رہی تھیں کہ چاچو ذونیرہ اور چاچی کو سعودیہ بلا رہے ہیں۔ شاید وہ وہاں راجہ کو بھول جائے اور اللہ انہیں بیٹا عطا کر دے۔

......☆☆☆......

کہانی لکھتے ہوئے کتنے بار میرے ہاتھ کانپے ہیں اور آنسو گرے ہیں سارا منظر پھر سے آنکھوں کے سامنے ہے۔ آخر عرصہ ہی کتنا ہوا۔ اس واقعہ کو صرف سال ہی تو گزرا ہے کتنا گہرا زخم لگا ہے دل کو۔

میری قارئین آپ سے التجا ہے کہ پلیز پلیز میری چاچی کے لیے دعا کیجیے کہ اللہ انہیں بیٹے سے نوازیں۔ آپ کی ایک دعا سے میری چاچی کی خوشیاں لوٹ سکتی ہیں۔ کیا پتہ کس کی دعا میں طاقت ہو کہ چاچی کو ان کا عمار' مجھے اور ذونیرہ کو میرا راجہ مل جائے۔

☆☆☆

روایات کی دلدل

ثمینہ فیاض

روایات کی بھینٹ چڑھتے رشتوں کی داستان عبرت ایک دوشیزہ کی زبانی

میرا نام پلوشہ ہے۔ ہماری برادری کے رواج کے مطابق خاندان کے بچوں کی شادی خاندان میں ہی ہوتی تھی اور اگر کسی گھر میں لڑکا اور لڑکی یعنی بھائی بہن دونوں ہوں تو وہاں وٹے سٹے کی رسم بھی شامل ہوجاتی تھی۔ اس سلسلے میں بچے کی پیدائش کے بعد ہی اور کبھی بھی پیدائش سے قبل ہی رشتہ مانگ لیا جاتا کہ اگر لڑکا ہوا تو ہمارا داماد بنے گا اور لڑکی ہوئی تو فلاں بچے سے منسوب ہوگی۔

خاندان سے باہر شادی کرنے کا مطلب ساری برادری سے ٹکر لینا، بغاوت کرنا اور ان سے علیحدہ ہو جانا تھا۔ جب کہ مردوں کے لیے خاندان سے باہر دوسری شادی کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہاں یہ بات واضح کردوں کہ ان کے بقول اسلام میں مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو وہ چار بھی کرسکتا ہے اس پر کسی کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی رواج کے مطابق میری شادی بھی وٹے سٹے کے تحت ایک کزن سے طے کردی گئی۔ نسل درنسل چلنے والے اس رواج کی بھینٹ چڑھنے والے اکثر چھوٹے شہر میں رہنے والے اکثر جاہل اور ان پڑھ لوگ تھے۔

بھائی اور بھابی کی شادی کے ساتھ ہی میرا نکاح بھابھی کے بھائی سے کردیا گیا۔

ان لوگوں کی کافی زمینیں تھیں۔ دولت اور جائداد کی کوئی کمی نہ تھی، ہاں اگر کمی تھی تو تعلیم کی...... پورا گھرانا ان پڑھ تھا۔ مگر اس کے باوجود بزرگوں کے فیصلے کے آگے ہمیں سر تسلیم خم کرنا ہی تھا۔ رخصتی کے لیے چار پانچ سال کا وقت لیا گیا۔ دوسری جانب میری نند سے میرے بڑے بھائی کی شادی کرواکر رخصتی کروالی گئی۔ ہم سب اس رواج میں اتنی سختی سے جکڑے ہوئے تھے کہ کوئی بڑے بزرگوں کے فیصلوں کو نا ماننے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ بھائی اور بھابھی بھی خوش تھے۔ بھابھی نے امید سے ہونے کی خوش خبری سنائی تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خاندان میں ہل چل مچ گئی۔ رشتہ مانگنے والے خوشامدوں میں جت گئے۔ بھابھی کے خوب ناز اٹھائے جارہے تھے۔ ہر کوئی اسی آس میں تھا کہ ان کے بچوں کا رشتہ طے ہوجائے۔

نو مہینے کیسے گزرے معلوم ہی نہیں ہوا۔ بھابھی نے میرے بھتیجے کو جنم دیا۔ وہ بہت خوب صورت اور صحت مند تھا اس کی ہم عمر اس وقت کوئی نہ تھی اس لیے



اس کا رشتہ روک لیا گیا۔ چند مہینے بعد ہمارے خاندان میں دور رشتے داروں شہزونا اور گل بکئی کے یہاں دو بچیوں نے جنم لیا اور دونوں ہی چاہتی تھیں کہ میرے بھتیجے کا رشتہ ان کے گھر ہو، بڑے بزرگوں نے شہزونا کی بچی کے حق میں فیصلہ سنا دیا کیونکہ شہزونا چند دن پہلے بیوہ ہوگئی تھی اور اس کی خوشی اس کی بچی سے ہی وابستہ تھی تو گل بکئی اور اس کے گھر والے جل بھن کر کباب ہوگئے۔ ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی تو نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ اب کوئی بچہ گل بکئی کی بچی سے بڑا یا چھوٹا نہیں تھا۔ جانے کب کسی اور کے یہاں بچہ ہوگا تو کیا حالات ہوں گے۔ ان اندیشوں سے گھری گل بکئی نے اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنا شروع کردی۔

اپنے مقصد کے لیے انہوں نے ایک چال چلی، خاندان میں جب بھی کوئی تقریب ہوتی وہ کسی نہ کسی بہانے میرے بھائی کو شہزونا کے پاس بھیج دیتی۔ کبھی کھانے کا پوچھنے کہ تمہاری سمدھن بھوکی ہے اخلاقاً پوچھ تو لو۔''

تو کبھی شہزونا کی بچی رو رہی ہے تم زرا باہر گھما لاؤ۔ آخر تمھاری ہونے والی بہو ہے۔'' بھائی اپنی سادگی میں اس کی بات مان لیتے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہیں تھا یہی حال شہزونا کا بھی تھا۔ بھائی چلے جاتے ادھر گل بکئی، بھابھی کے سامنے ساری صورت حال کو ایسے پیش کرتی کہ بھئی زرا سنبھال کے رکھو اپنے شوہر کو۔ ویسے ہی ہمارے یہاں مرد دوسری شادی کرنا بری بات نہیں سمجھتے۔''

وہ مثالیں دیتی اور ان مثالوں میں بہت کچھ چھپا ہوتا ان کی ایک سہیلی ہے جس کے ساتھ بہت برا ہوا اس کی ایک سہیلی بیوہ ہوگئی۔ وہ اور اس کا شوہر اکثر

اس سے ملنے جاتے تھے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے ایسا جادو کیا کہ اس کا شوہر ہاتھ سے نکل گیا اور وہ بیوہ شادی کر کے مزے سے جی رہی ہے۔ اب وہ کڑھتی رہتی ہے۔ ویسے تمھارے شوہر بھی مزاج کے بہت نرم ہیں۔ شہزوتا پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہے ہیں۔ ذرا خیال رکھنا۔''

پھر انہیں بھائی اور شہزوتا کو پاس کھڑے بات کرتے دکھاتی اور اشارہ کرتی۔ بھابی بھی گل بکی کی باتوں کا شکار ہونے لگیں۔ انہیں اپنی دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں پر یقین ہونے لگتا۔ ان کے دل میں شک کی چنگاری دہکنے لگی۔

اپنے خیالات کو جھٹک کر وہ کہتیں کہ یہ کیسے ممکن ہے ہم تو رشتہ طے کر چکے ہیں اپنے بچوں کا۔ اب وہ اس سے شادی نہیں کر سکتے۔''

جس پر گل بکی انہیں کہتی کہ ابھی شادی ہوئی نہیں ہے، بچوں کی صرف بات ہوئی ہے، رشتہ تو ختم بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ دونوں اپنا رشتہ بنا لیں تم یہ رشتہ ختم کر دو اور شہزوتا سے ہر تعلق ختم کر لو۔''

میرے بھائی پر شہزوتا کے عشق کا جھوٹا الزام لگا دیا گیا تھا جس پر بھابی کو یقین ہو گیا تھا۔ گل بکی نے اس ترکیب سے بھابی کے دل میں شک ڈالا کہ دھیرے دھیرے یہ شک ان کے اندر لاوے کی طرح پکنے لگا۔

☆......☆......☆

بھابی ہر وقت چڑچڑی رہنے لگیں ہم سمجھتے رہے کہ شاید کمزوری اور بچے کی رات بھر جگانے کی وجہ سے مگر ان کے دل و دماغ میں شک پوری طرح جگہ بنا چکا تھا۔ میں سولہ سال کی ہو چکی تھی مگر ان حالات کو سلجھانے سے قاصر تھی۔

گھر کے اس خراب ماحول اور روز روز کے لڑائی جھگڑوں کے باعث بھائی کے کاروبار پر بھی برا اثر پڑ رہا تھا۔ گھر کے معاشی حالات بھی خراب ہونے لگے۔ بھابی کے شک کے ناگ نے ایک بار پھر سر اٹھایا اور وہ سمجھنے لگیں کہ بھائی سارے پیسے شہزوتا کو دے آتے ہیں۔''

بھائی نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانیں۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھیں کہ شہزوتا کی بچی کی جگہ گل بکی کی بیٹی سے ہمارے بچے کا رشتہ ہونا چاہیے اور اب آپ شہزوتا سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ کہیں ملیں گے بھی تو بات نہیں کریں گے۔''

بھائی بھی کاروباری گھاٹے کی وجہ سے پریشان تھے۔ بھابی کے بار بار کے شک نے انہیں غصے سے پاگل کر دیا اور اسی غصے میں ان کا ہاتھ اٹھ گیا۔ بات بڑھتی ہی چلی گئی۔

بھابی میکے جا کر بیٹھ گئیں اور ایک دن بھابی نے میرے بھتیجے کو دودھ میں زہر پلا کر خود بھی پی لیا۔

ان کی موت کی اطلاع آئی کہ بھابی نے خودکشی کر لی تھی۔ ساتھ میں میرے بھائی کے لیے اک خط میں پیغام چھوڑا تھا کہ میں آپ کی اب ساری مشکلات ختم کر رہی ہوں۔ آپ شہزوتا سے آسانی سے شادی کر سکتے ہیں نہ اب ہمارا بچہ ہے اور نہ ہی میں، آپ بھی آزاد ہیں اور شہزوتا بھی۔ اس کی بیٹی کو ہی باپ کا پیار دینا لیکن میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

فرسٹریشن اور غصہ ان کی جان لے گیا تھا۔

☆......☆......☆

کئی مہینے اسی پریشانی میں گزر گئے بھائی کا غم سب کو دکھ رہا تھا لیکن ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ بھائی میری وجہ سے پریشان رہنے لگے تھے اب وہ بس یہی سوچتے کہ میرا کیا ہو گا کیا ان کا سالا یعنی میرا شوہر اسلم خان مجھے اپنائے گا؟ کیا میرے سسرال والے مجھے قبول کریں گے؟

بھائی نے فیصلہ بزرگوں کے سپرد کر دیا۔ بزرگوں نے اسلم خان کے گھر والوں سے بات کی تو وہ اس شادی پر رضامند نہیں تھے مگر اسلم خان مجھے ہر صورت پانا چاہتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے میری چاہت کا اقرار کیا اور یہاں تک کہا کہ مجھے ضرورت پڑنے پر علیحدہ گھر میں رکھے گا۔

میرے میکے والوں نے اس کی بات کو سچ مانتے ہوئے میری رخصتی کر دی۔ میں بھی اللہ کا نام لے کر اس گھر میں آ گئی۔ جانتی تھی کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

پہلے دن ہی اسلم خان نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی جب مجھے ایک اسٹور میں پھینک دیا گیا کہ اب تم ساری زندگی ہماری غلامی کرو گی اور میں دوسری شادی کر کے چین کی زندگی گزاروں گا، تب ہی میرا انتقام پورا ہو گا۔ تمہیں کبھی بھی بیوی کا کوئی حق نہیں ملے گا۔ میں تمھارے بھائی کو ایسے ہی تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں جیسے تم لوگوں نے میری بہن کو تڑپایا تھا۔ جب جب تم روؤ گی مجھے سکون ملے گا۔''

اور میں سوچتی رہ گئی کہ اس سارے قصے میں میں کہاں قصوروار تھی؟ کیا عورت ہونا ہی میرا سب سے بڑا جرم ہے۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ سارا دن ان کی خدمت میں جتی رہتی کہ شاید ان کے دل میں میری ہمدردی اور محبت سے جگہ بن جائے اور وہ لوگ مجھے دل سے قبول کر لیں...... مگر عزت نام کی کوئی چیز تو دور کی بات، کوئی مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتا۔ میری حیثیت اس گھر میں اک قید بامشقت کاٹنے والے مجرم کی سی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا بھی کم ہی ملتا جبکہ اکثر بھوکے پیٹ سونا پڑتا۔ کسی چھوٹی سی غلطی کی سزا اکثر مار پیٹ ہوتی۔ پٹ پٹ کر میرا جسم بھی عادی ہو چلا تھا اس لیے نیل پڑتے اور چوٹیں دکھنے کے باوجود بخار نہ ہوتا۔ میں اپنے گھر والوں کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ جانتی تھی سوائے دکھی ہونے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

میرے گھر والوں کو میرے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی جب کہ مجھے ان سے ملنے کے لیے جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک دن اچانک بھائی میرے گھر آئے تو میرے پھٹے ہوئے ہونٹ۔ جگہ جگہ سے سوجا ہوا چہرا اور اس پر پڑے نیل اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بکھرے ہوئے بال میلے کپڑے، انہیں میرے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا گئے۔ میری حالت دیکھ کر وہ افسردہ ہو گئے جب کہ مجھے ان کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی، وہ بیمار لگ رہے تھے۔

وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ بھائی نے پنچایت کے سامنے اک بار پھر ساری بات رکھ دی اور مجھے گھر واپس لے آئے۔ میں انہیں اور وہ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔

ان سارے حالات کے سبب بابا کا ٹینشن سے برین ہیمبرج ہو گیا اور وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے اس رسم و رواج کی دلدل میں دھنسے رہنے کے لیے چھوڑ گئے جب کہ اماں دل کی مریضہ بن گئیں۔

کئی سال یوں ہی گزر گئے اماں بھی ہمیں اس الجھن سے نکالے بغیر ملکِ عدم سدھار گئیں۔ بھائی کو کراچی شہر میں اچھی نوکری مل گئی، میں بھی ان کے ساتھ کراچی آ گئی۔ اب ہم دونوں بھائی بہن ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں ساری برادری تو ہے مگر ہم تنہا ہیں۔ وہی برادری جس کی جاہلانہ رسم کی وجہ سے ہماری زندگیاں جہنم بن گئی ہیں۔ جانے کب تک رسم روایات کے نام پر حوا کی بیٹیاں اِس اذیت کی دلدل میں زندگیاں برباد کرتی رہیں گی۔

☆☆......☆☆

زندگی

زندگی جب تری تلاش میں
اونچے اونچے پہاڑ پر تھا چڑھا
پاؤں پھسلا وفا کے پتھر سے
پیاس بھی ریگ کے چلی تھی پھر
نیچے گہرا تھا سمندر کوئی
میں نے بس آدھی آنکھ سے دیکھا
اِک نظر ڈالی جب سمندر پر
خون بہنے لگا تھا سینے میں
پانی بھی بوڑھا تھا سمندر کا
زندگی تُو نظر نہ آئی کہیں
دل میرا خرچ ہو رہا تھا بس
ایسا لگتا تھا سارے رشتے مرے
مجھ سے بس ایک بار لپٹیں گے
اور پھر ناؤ بن کے ڈوبیں گے
زندگی بس مری تلاش ختم
تُو ملی تھی مجھے تو قطرے سے
آج غرقاب ہو رہی ہے یوں
جیسے قطرہ تھا اُس سمندر کا
جسم بہہ جائے گا سمندر میں

شاعر: محمد اسامہ۔ کراچی

آٹھویں سچ بیانی

آپ اپنے دام میں



محمد قاسم خان بلوچ

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اُس شخص کا قصہ دل گرفتہ

جسے ایک بددعا نے انہونی مشکل میں ڈال دیا

پیشے کے لحاظ سے میں ایک ڈرائیور ہوں اور ڈرائیور حضرات کو اپنے ملک میں ہر جگہ آنا جانا پڑتا ہے۔ اور طرح طرح کے لوگوں سے ملنا بھی پڑتا ہے اور ڈرائیوروں کی زندگی میں کبھی کبھی کچھ عجیب طرح کے واقعات وحالات بھی پیدا ہوجاتے ہیں اور کچھ ایسے ناقابل فراموش واقعات بھی آجاتے ہیں کہ جن کو بھلانا مشکل ہوجاتا ہے۔

وہ شاید گرمیوں کی ایک رات تھی جب میں ملتان شہر کی غلّہ منڈی میں اپنی گاڑی کے اندر سکون کی نیند سو رہا تھا۔

تقریباً رات کے دو بجے گاڑی کے دروازے پہ مجھے دستک سنائی دی لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی کیوں کہ اس وقت میں مکمل نیند کی آغوش میں تھا اور ایسی حالت میں اُٹھنا میرے لیے کسی بڑی مصیبت سے کم نہیں تھا۔

دستک مسلسل ہورہی تھی مجبوراً مجھے اُٹھنا پڑا۔ جب میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو سامنے ایک حسین وجمیل لڑکی کو سامنے پایا۔ وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔ حیرانی اس بات پہ ہوئی کہ اکثر ٹرکوں اور بسوں کے اڈوں پر دو نمبر لڑکیاں آتی رہتی ہیں جو صرف چند روپے کی خاطر اپنی عزت نیلام کرجاتی ہیں۔

اور یہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ اگر میں اس کی تفصیل میں چلا جاؤں تو کہانی لمبی ہوجائے گی۔ لوگ موجود ہیں۔ اچھے اور بُرے۔

لڑکی بے حد حسین تھی اور اُس نے بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ پہلے تو میں نے بغور اس کو دیکھا اور پھر میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اتنی رات گئے۔ جی بتاؤ کیا کام ہے آپ کو؟"

وہ کچھ نہ بولی اس کی نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کو دوبارہ مخاطب کیا۔

بتاؤ آپ کو کیا کام ہے۔ جو اتنی رات کو تم نے مجھے جگایا ہے اور تم اکیلی یہاں کس لیے آئی ہو۔ تم جانتی ہو کہ زمانہ کتنا خراب ہے۔ جو کام ہے بتاؤ اور جہاں سے آئی ہو واپس چلی جاؤ۔"

بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

میں ایک مجبور عورت ہوں اور آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں اتنی رات کو لڑکیاں کسی اجنبی کے پاس کیوں آتی ہیں۔"

اس کی یہ بات درست تھی میں نے کہا۔



ہاں میں جانتا ہوں۔ شاید تم سے زیادہ، لیکن تم اپنا مقصد بتاؤ کہ تم اب کیا چاہتی ہو۔"

"مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ تم مجھے کچھ پیسے دے دو تو اس کے بدلے میں جو چاہو کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کو کیا ایسی مجبوری ہے کہ جس مجبوری کو مٹانے کے لیے تم یہ گناہ خوشی سے کرنا چاہتی ہو۔ کیسی عورت ہو تم کیا تم کو ذرا بھی خیال نہیں اپنی عزت کا۔"

میری یہ بات سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور کہنے لگی کہ عزت تو ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے اور عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ اس دنیا میں لیکن زندگی میں کبھی کبھی انسان اتنا مجبور ہوجاتا ہے کہ انسان گناہ کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔"

میں اس کی اس بات پر حیران ہوکر رہ گیا اور میں یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ یہ کام مجبوری میں کررہی تھی۔

"اپنی مجبوری بتاؤ تاکہ میں بھی آپ کی مجبوری جان سکوں اور ہوسکتا ہے میں آپ کی مدد بھی کروں۔ بنا کسی گناہ کے۔" یہ بات سن کر اس نے پُر امید نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"آج دوسرا دن ہے۔ میرے بچے بھوک سے نڈھال ہوچکے ہیں اور میں بھی بھوک سے مر رہی ہوں۔ گھر میں کھانے کو ایک دانا بھی نہیں ہے۔ میں تو ماں ہوں خود تو بھوک برداشت کرسکتی ہوں لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کو بھوک سے روتے بلکتے نہیں دیکھ سکتی۔ میرے بچوں کو مرنے سے بچالو۔"

"کیا تم شادی شدہ ہو اور کتنے بچے ہیں تمہارے اور تمہارا کا خاوند کیا کرتا ہے؟

"ہاں بد قسمتی سے میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ خاوند نشہ کے سوا کوئی کام نہیں کرتا۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بہت دُکھ اور افسوس ہوا تمہاری ایسی حالت پہ۔ یہ کہہ کر میں نے اس کو ایک ہزار روپے دیے اور اس کو سمجھایا کہ اپنے خاوند کو سمجھاؤ کہ وہ تمہارا اور اپنے بچوں کا خیال کرے اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ تم آئندہ ایسی جگہ کبھی مت آنا، کہیں محنت مزدوری کرلو۔ لیکن ایسی بے عزتی کی حرام روزی سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ مت بھرو

۔'' وہ دعائیں اور شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی اور میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی دوبارہ آنکھ لگی ہی تھی کہ میں نے کسی عورت کی چیخ کی آواز سنی جو مجھے تھوڑے ہی فاصلے پہ سنائی دے رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ چیخ کہیں اُسی لڑکی کی ہی نہ ہو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے پیسے لے کر گئی تھی۔ یہ سوچ کر میں جلدی جلدی گاڑی سے اُترا اور اس طرف کو بھاگنے لگا۔ جہاں سے لڑکی کی چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ غلہ منڈی میں روشنی بہت ہی کم تھی جس سے دور سے کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں جیسے جیسے قریب ہوتا جا رہا تھا چیخوں اور رونے کی آواز مجھے قریب سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ آخر میں وہاں پہنچ ہی گیا اور میں نے اس لڑکی کو بھی پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو میں نے پیسے دیے تھے۔

دو آدمی اس کو گھسیٹ کر ایک قریب کھڑی کار کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان دونوں کے ہاتھوں میں پسٹل بھی تھے۔ وہ لڑکی بار بار مدد کے لیے پکار رہی تھی لیکن ان ظالموں کو ذرا بھی اس بے بس اور مجبور عورت پہ ترس نہیں آ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے۔ اگر میں ان دونوں سے جھگڑا کرتا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ میری جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کسی اور کو بھی ساتھ بلا لیتا ہوں۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن مجھے کوئی بھی آس پاس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکی بار بار پکار رہی کہ کوئی ہے تو میری مدد کرو۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور مجھے دیکھ کر پکارنے لگی۔

بھائی اللہ کے نام پر میری مدد کرو یہ ظالم میری عزت لوٹنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان ظالموں سے بچالو۔''

عزت کا لفظ سن کر ایک بار پھر مجھے حیرانگی ہوئی کہ یہ وہ ہی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے چند پیسوں کی خاطر اپنی عزت کو نیلام کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس وقت بہت مجبور تھی اور وہ بھی اپنی اولاد کے لیے اسے اپنی پروا نہیں تھی۔ مگر اپنے بچوں کی خاطر وہ ایک عظیم گناہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اتنی رات کو کیوں ان بھیڑیوں کے جنگل میں آ پھنسی تھی۔ عزت اس کو پیاری تھی صرف مجبوری کی خاطر۔

وہ دونوں اس کو گھسیٹ کر گاڑی کے قریب لا چکے تھے بس ایک بار پھر اس نے میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور پکارتے ہوئے کہنے لگی۔

'' بھائی اللہ کا واسطہ ہے مجھے بچالو۔''

پھر جب کوئی مصیبت زدہ عورت کسی بھی مسلمان انسان کو بھائی کہہ کر مدد کے لیے بلاتی ہے تو خواہ وہ کتنا بھی کمزور دل یا کمزور جسامت کا کیوں ہو فوراً اس کی مدد کو چلا آتا ہے۔

میرے اندر بھی ایک جذبہ آ گیا تھا۔ اس وقت اس کو بچانے کے لیے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ مجھے کوئی اینٹ یا ڈنڈا ملے تو میں ان پر حملہ کروں۔ لیکن کچھ نہ ملا تو میں اللہ کو یاد کیا اور ان کو کہا۔

'' بھائیوں چھوڑ دو اس عورت کو ورنہ میں تم دونوں کو مار دوں گا۔'' ان میں سے ایک بولا۔

'' اوئے چل چڑی مار کی اولاد! بھاگ یہاں سے ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میں نے کہا۔ '' تم نے اس کو چھوڑنا ہے کہ نہیں۔''

وہ بولا۔ '' نہیں چھوڑنا۔ ہم اس کو لے جا رہے ہیں۔ جو کرنا ہے کرو۔''

میں نے ان کو گالی دی اور ان پر حملہ کرنے کے لیے جیسے ہی آگے بڑھا اس نے میری طرف پستول کرتے ہوئے کہا۔

'' آگے مت آنا ورنہ بیچ میں گولی مار دوں گا۔''

میں رک گیا۔ لیکن اس بے بس عورت کی حالت کو دیکھ کر ایک بار پھر ہمت کی اور آگے بڑھنے لگا۔ اس شخص نے پھر مجھے روکا کہ۔

'' حرام کی اولاد رُک جا! ورنہ میں حقیقت میں گولی مار دوں گا۔'' میں سمجھ رہا تھا کہ یونہی مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں آگے بڑھتا رہا پھر بیچ میں اس آدمی نے میری ٹانگوں کی طرف فائر کر دیا۔ میں گھبراتا ہوا زمین پہ جا گرا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ مجھے واقعی گولی لگ گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ اب اگر میں یہاں سے نہ گیا تو یہ مجھے مار دے گا۔ مجھے اپنی جان اپنی زندگی خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہمت کی اُٹھا اور بھاگنے لگا اس عورت کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ اب مجھے بد دعا دے رہی تھی۔

'' کہاں بھاگ رہے ہو بزدل انسان! تم ایک عورت کی عزت نہیں بچا سکے۔ تم زندگی میں کیا کرو گے۔ جس طرح آج میں تیری آنکھوں کے سامنے بے بس اور مجبور ہوں، کبھی خدا بھی بے بس اور مجبور کرے گا۔ اور تُو کسی بڑی مصیبت میں پھنسے گا۔''

وہ مسلسل بد دعا دے رہی تھی اور میں ان لفظوں کی پروا کیے بغیر اپنی گاڑی میں چلا آیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ اس کو گاڑی میں ڈال کر میرے قریب سے گزر گئے تھے۔

رات گزر گئی۔ لیکن وہ عورت اور اس کی بے بسی، وہ بد دعائیں کسی ہتھوڑے کی طرح میرے دل و دماغ پہ برس رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس کو کیوں نہ بچا سکا۔ وہ اس وقت کہاں ہوگی۔

رات ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا ہوگا۔ کیا وہ زندہ ہوگی یا زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی ہوگی۔

میں اپنی زندگی کو بچا کر وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ جو شاید بزدلی کی ٹھوس نشانی تھی۔ میں مرد ہو کر ایک عورت کی عزت نہیں بچا سکا تھا۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی میں نے گاڑی لوڈ کی اور بہاولپور کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارے راستے یہی سوچیں مجھے پریشان کرتی رہیں۔ اس طرح تین ماہ گزر گیا کثر منظر یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میرے سامنے دوبارہ رونما ہو رہا ہے۔

وقت گزرتا رہا اور سردیوں کا موسم آ گیا۔ یہ سردیوں کے ابتدائی دن تھے اور بہت ہی اچھا موسم تھا۔ اس وقت میں اور میرا استاد کراچی پورٹ قاسم گاڑی سے مال اتروا رہے تھے کہ وہاڑی سے گاڑی کے مالک کا فون آیا کہ جتنی جلدی ہو کراچی سے وہاڑی شوگر ملز پہنچو۔ وہاں سے چینی لوڈ کر کے تم نے سرگودھا کی طرف جانا ہے۔''

وہ ہمیں بار بار تقلید کرنے لگا تھا کہ جلدی یہاں پہنچو۔ سرگودھا سے آرڈر آیا ہے کہ جلدی چینی لوڈ کی جائے اور وہاں پہنچا دی جائے۔ ہم نے مالک کو تسلی دی کہ ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے، آپ بے فکر رہیں۔

ہم نے جلدی جلدی گاڑی خالی کروائی اور وہاں سے بغیر لوڈ کیے ہم میاں چنوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیوں کہ میاں چنوں کے ایک اڈے سے ہمیں بلٹی لینی تھی۔ تقریباً ہم دوسرے دن بھوکے پیاسے میاں چنوں آن پہنچے۔ وہاں سے بلٹی لی اور پھر چینی لوڈ کرنے کے لیے وہاں سے شوگر ملز کی طرف چلے گئے۔ ظہر کے بعد گاڑی لوڈ ہوئی تو ہم سرگودھا کے طرف روانہ ہو گئے اور عشاء کے بعد ہم سرگودھا شہر کی اس گودام کے پاس پہنچ گئے جہاں چینی اتارنی تھی۔ میں نے استاد کو کہا کہ استاد جی! ایک بار فون کر کے گودام کے مالک سے تسلی کر لو کہ یہ وہی گودام ہے نا جہاں چینی اتارنی ہے۔ لیکن استاد نے لاپروائی کرتے ہوئے کہا۔

'' مجھے تسلی ہے ہم ٹھیک جگہ آئے ہیں۔'' پھر اس کے بعد میں نے استاد کو کہا کہ استاد جی اب ان پلے داروں کو فون کرو کہ جلدی سے گاڑی خالی کریں تا کہ ہم صبح ہونے سے پہلے شہر سے نکل جائیں۔ کیوں کہ دن کو بڑی گاڑی میں اندرونِ شہر پابندی ہوتی ہے اگر گاڑی شہر میں چلی جائے تو جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے تھے کہ جلدی یہاں سے نکل جائیں۔

استاد نے فون کیا تو پلے داروں کا استاد ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا۔

'' استاد جی! بات یہ ہے کہ ایک پلے کی ماں فوت ہو گئی ہے۔ اس لیے دوسرے پلے دار بھی وہاں گئے ہوئے ہیں۔ تم ایسا کرو اب یہاں ہی سو جاؤ صبح ہم فجر کی اذان کے فوراً بعد آ جائیں گے اور چینی اتار لیں گے۔''

ہم نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور ہم بھی سو گئے۔ اب انھوں نے رات کو کیا پلان کیا کہ جب صبح ہوئی میں نے ان پلے داروں کو فون کیا اور وہ وعدے کے مطابق فجر کی اذان کے بعد آ گئے۔ لیکن وہ صرف دو آدمی تھے۔ ایک جو رات کو ہمارے پاس آیا تھا اور دوسرا نیا آدمی تھا۔ اس پلے دار نے کہا۔

استاد جی! جہاں یہ چینی اتارنی ہے وہ گودام شہر سے باہر ہے۔ یہ گودام کسی اور کا ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر مجھے حیرانگی ہوئی۔ کیوں ہم کو جو پتا بتایا گیا تھا وہ اسی جگہ کا تھا جہاں اب ہم پہنچ چکے تھے۔ ایک بار پھر میں نے استاد کو کہا کہ استاد جی! ایک بار فون کر کے چینی کے گودام کے مالک سے پوچھ تو لو کہ کون سا گودام ہے۔ لیکن استاد نے پھر لاپروائی کر دی۔ تبھی وہ بڑا پلے دار یہ کہہ کر چلا گیا کہ تم گاڑی کا تیل پانی چیک کرو۔ تب تک میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں اور دوسرے پلے داروں کو بھی بلاتا ہوں۔''

یوں میں گاڑی کا تیل پانی چیک کرنے لگ گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ پلے دار ہمارے لیے چائے لے کر آیا ٹرے میں تین کپ اور دو بسکٹوں کے پیکٹ تھے۔ اس نے تینوں کپوں میں چائے ڈالی۔ جب ہم نے یعنی میں نے اور میرے استاد نے کپ اٹھا لیے تو وہ شخص یہ کہہ کر کہیں چلا گیا کہ آپ چائے پیو میں ساتھ والے حمام سے ہو کر آتا ہوں۔ جب ہم نے دو دو گھونٹ پیے تو ہمیں یوں لگا کہ چائے کڑوی ہے۔ استاد نے کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ جبکہ میں نے پہلے اپنا کپ پیا پھر بعد میں استاد والا کپ بھی پی لیا پھر یونہی ہم نے چائے ختم کی تو فوراً وہ پلے دار ہمارے پاس چلا آیا اور ہمیں کہنے لگا کہ۔

''استاد جی! جلدی کرو گاڑی اسٹارٹ کرو شہر سے باہر والے گودام میں چلو باقی پلے دار وہاں جا چکے ہیں۔''

ہم نے سگریٹ سلگائی اور گاڑی میں بیٹھے لیکن اس کے بعد ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں اس وقت ایک مسجد کی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا تھا اور پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اُٹھ سکا۔ جسم میں شدید درد ہو رہا تھا اور آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ تبھی ایک نمازی میرے قریب آیا اور مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور پوچھنے لگا۔

''بیٹا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

لیکن میں کچھ نہ بول سکا۔ آنکھوں میں درد کی وجہ سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ شخص مجھے بتانے لگا کہ

بیٹا تم اس مسجد میں کل رات کے پڑے ہوئے ہو۔ ہم تو آپ کو پاگل سمجھ رہے تھے۔ اس لیے آپ کو نہ اٹھایا۔''

لیکن میں کچھ نہ بولا اور مسجد سے نکل کر ساتھ والی سڑک پہ چلنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میں روڈ کے ساتھ لگے بورڈ پر لکھا تھا۔ گجرات صفر کلو میٹر میں یہ پڑھ کر حیران ہونے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ میں تو گاڑی کے ساتھ تھا اور ہم سرگودھا میں تھے۔ یہاں کیسے آ گیا۔ میری جیب میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گجرات کے ٹرکوں والے اڈے میں چلا آیا۔ وہاں ایک لڑکا اپنے اڈے میں موجود تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا سلام کے بعد میں نے اس کو کہا۔

''بھائی آپ کی مہربانی ہوگی، مجھے ایک فون کرنے دو۔'' اس نے کہا۔

''جی بھائی نمبر بتاؤ۔'' میں نے اس کو نمبر بتایا تو اس نے نمبر ملا کر ریسیور مجھے دے دیا۔ آگے فون ہمارے مالک نے اٹھایا جب میں نے ہیلو کہا تو اس نے حیرانگی سے کہا۔

''ناظم تم زندہ ہو۔'' میں نے کہا ہاں جی بھائی میں ہوں تو زندہ لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں یہاں گجرات میں کس طرح آیا ہوں اور گاڑی بھی موجود نہیں۔ میں تو گاڑی کے ساتھ سرگودھا میں......'' یہ سن کر الطاف نے کہا۔

''ناظم بیٹا تم اب کیا جانو کہ تم کس طرح یہاں پہنچے ہو اور تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تمھیں ان لوگوں نے مار دیا ہوگا۔ لیکن شکر ہے تم زندہ ہو۔ تمہارے استاد رحمت کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ کو اور گاڑی کو اغوا کیا گیا تھا۔'' میں یہ سن کر حیران اور پریشان رہ گیا پھر الطاف نے مجھے کہا کہ اس لڑکے سے میری بات کراؤ۔ میں نے اس سے الطاف کی بات کرائی۔ اس نے اس اڈے والے کو تاکید کی کہ اس لڑکے کو کھانا بھی کھلاؤ اور کچھ پیسے بھی دو۔ ان کے ساتھ اس طرح کا حادثہ ہوا ہے۔ اس نے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' یوں اس نے مجھے کھانا کھلایا اور ایک ہزار روپے بھی دیے۔ پھر الطاف نے مجھے بتایا کہ گاڑی گجرات کے صدر تھانے میں کھڑی ہے تم جلدی وہاں جاؤ۔ ہم بھی آج رات کو آ جائیں گے۔ آپ کے استاد کو لے کر۔''

یوں میں تھانے میں چلا گیا۔ تھانے کے باہر ہماری گاڑی موجود تھی۔ میں نے تھانے میں جا کر پولیس والوں کو بتایا کہ میں اس گاڑی کا سیکنڈ ڈرائیور ہوں۔ مجھے اس گاڑی کے مالک نے بتایا ہے کہ ہماری گاڑی اس تھانے میں ہے۔'' یہ سن کر ایک پولیس والا مجھے تھانے دار کے پاس لے گیا اور اس کو بتانے لگا کہ۔

''سر جی! جو گاڑی گجرات شہر کچہری روڈ پہ کھڑی ملی تھی یہ اس گاڑی کا سیکنڈ ڈرائیور ہے۔'' تبھی اس تھانے دار نے غور سے میری طرف دیکھا اور پوچھنے لگا کہ۔

''تم کہاں تھے؟''

میں نے اس کو ساری تفصیل بھی بتائی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے مالک آنے والے ہیں۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ اس گاڑی کی اطلاع آپ کے مالک کو ہم نے ہی دی تھی۔ یہ گاڑی کچہری روڈ پہ اسٹارٹ کھڑی تھی۔ ہمیں کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ ایک گاڑی کچہری روڈ پر کھڑی ہے رات سے ابھی تک اس گاڑی کا ڈرائیور نہیں آیا اور نہ ہی گاڑی کا کچھ پتا ہے۔ صبح جب وہ لوگ اپنی دکانیں کھولنے لگے تھے تو وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ گاڑی یہاں کوئی مال وغیرہ لوڈ کرنے آئی ہے۔ لیکن جب کوئی بھی نہ آیا اور بہت دیر ہو گئی تو وہ لوگ یہ سمجھ کر وہاں سے ہمارے پاس تھانے میں اس کی اطلاع دینے چلے آئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے اس گاڑی میں بم ہو۔ یوں ہم نے بم ڈسپوزل کو بھی بلایا۔ انھوں نے یہ گاڑی چیک کی لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم گاڑی کو ایک ڈرائیور کی مدد سے تھانے میں لے کر آ گئے۔ ہم بھی پریشان تھے کہ اب گاڑی والوں سے کس طرح رابطہ کیا جائے۔ لیکن قسمت سے گاڑی کے فرنٹ والے بمپر پہ آپ کے اڈے کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ اس طرح ہم نے ان کو اطلاع دی۔ یوں یہ سارا کیس سرگودھا کے ایک تھانے میں چل پڑا۔ گودام کے مالک نے سب سے پہلے میرے استاد اور مجھ پر شک کیا کہ چینی ان دونوں ڈرائیوروں نے کہیں غائب کی ہے۔ لیکن ہمارے مالک نے اس بات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جناب یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ ہمارے تو یہ دونوں بندے خود مصیبت میں ہیں۔ اگر اغوا کاران دونوں کو مار دیتے تو کون ذمے دار ہوتا۔ لہٰذا یہ سب جھوٹ ہے۔ ہمیں اصل مجرموں کو تلاش کرنا ہوگا۔'' ساتھ میں تھانے دار کہنے لگا۔

''جناب معذرت کہ میں سب سے پہلے آپ کے دونوں بندوں سے پوچھ تاچھ کروں گا۔ ہو سکتا ہے یہ ہی ان لوگوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں اور اب یہ ایک ڈرامہ بنا رہے ہوں کہ ہمیں کچھ پتا نہیں۔'' ہمارے مالک نے گودام کے مالک اور تھانے دار کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ یوں قسمت ہم استاد شاگرد کا ساتھ چھوڑ گئی اور سب سے پہلے ہم دونوں سے اس ساری واردات کی تفتیش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

سب سے پہلے ہمارے بیان ہوئے تو ہم نے پوری تفصیل سے سب کچھ بتایا جو کچھ ہوا تھا۔ تھانے دار ہمارے بیان پر بھی مطمئن نہ تھا۔ سو رات کو باری باری ہم دونوں کی مار کٹائی بھی کی گئی، ہر طرح کے اس نے حربے استعمال کر لیے۔ لیکن ہم نے جو حقیقی بیان دیا تھا اس پر ڈٹ گئے۔ آخر تھانے دار ہم سے مطمئن ہو گیا کہ ہم مجرم نہیں، اصل مجرم وہ پلے دار ہی

تھے یہ کیس کوئی معمولی نہیں تھا۔ پورے گیارہ لاکھ کی چینی تھی۔

ایک صبح تھانے دار نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں نے آپ کو مار کر آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ لہٰذا تم مجرم نہیں ہو۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اصل اغوا کاروں کو تلاش کیا جائے۔“

ہم واپس وہاڑی کی طرف آ گئے تو مالک بہت پریشان تھا۔ اس نے ہم دونوں کو کہا کہ۔ اب میں آپ کے دونوں کے سہارے ہوں۔ اگر تم نے ساتھ چھوڑ دیا تو گیارہ لاکھ میرے ذمے پڑ جائیں گے۔ کیوں اصل مجرم کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ ہی تھانے والے۔“

ہم نے کیس کے دوران ان پلے داروں کو ہر جگہ تلاش کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ چینی کے گودام کے مالک نے ہم کو بہت پریشان کر دیا۔ وہ بار بار ہمیں دھمکیاں دیتا کہ اگر اصل مجرم نہ پکڑے گئے تو چینی کی پوری قیمت ہمارے مالکوں کو ادا کرنی ہوگی۔ مجرموں کی تلاش جاری رہی، اس کیس نے ہمارے مالکوں کی نیندیں تک حرام کر دی تھیں۔ کیوں کہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ اگر اصل مجرم نہ پکڑے گئے تو سارا نقصان انھیں ہی دینا پڑے گا۔ آخر یہ گیارہ لاکھ کی بات تھی کوئی عام کیس تو نہ تھا۔ یوں دن گزرتے رہے ہم مجرموں کی تلاش میں لگے رہے۔ لیکن ان کی کچھ خبر نہ ملی۔

پھر ایک دن چینی کے گودام کے مالک نے ہمارے مالک کو دھمکی دی کہ آپ کو ایک ماہ کی مہلت دیتا ہوں۔ بہتر ہے کہ اس کیس کو حل کرو ورنہ میں اصل مجرم آپ کو ہی ٹھہراؤں گا۔“

اِدھر ایک دن سرگودھا سے ہمارے تفتیشی افسر نے ہمیں ایک بار پھر تھانے میں طلب کر لیا اور ہمیں بتانے لگا کہ گودام کا مالک ہم پہ اب رُعب ڈال رہا ہے کہ میرا نقصان ہر حال میں پورا کیا جائے۔ تبھی ہمارے مالک نے تنگ ہو کر تھانے دار کو کہا کہ سر اب مجرموں کی تلاش کرنا آپ کا بھی کام ہے۔ ہم خود ان کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب ہم کیا کریں۔“

یوں ہم لڑتے جھگڑتے واپس چلے آئے ہم ان حالات میں اس کیس کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ہم نے اللہ کو خوب نرم دلی سے پکارا منتیں مانگی۔ شاید ہم سب کسی گناہ کی وجہ سے پھنس گئے تھے۔ ہر اس گناہ کی اللہ سے معافی مانگی جو جان بوجھ کر کیے تھے اور جو نہیں بھی کیے تھے یا انجان حالت میں سرزد ہو گئے تھے۔

آخر کار اللہ نے ہماری سن لی اور ہم سب کو اس مشکل سے نجات دلا دی۔

☆......☆......☆

میں ان دنوں میں اپنے گھر ٹوبہ ٹیک سنگھ 184 گ ب میں آیا ہوا تھا۔ جب رات کو گیارہ بجے الطاف کی کال آئی۔

”ناظم بیٹا تم اس وقت کہاں ہو۔“ میں نے ان کو بتایا کہ میں گھر میں ہوں اور کل آپ کے یہاں آ جاؤں گا۔“ لیکن الطاف نے کہا۔

”ناظم بیٹا مبارک ہو ہمارا کیس حل ہو گیا ہے۔ وہ مجرم اسلام آباد میں پکڑے گئے ہیں۔ اب ہم نے سرگودھا پہنچنا ہے۔ صبح ملزم اسلام آباد سے سرگودھا تھانے میں لائے جائیں گے۔ تمھیں ان کی پہچان کرنی ہے۔ تم اس طرح کرو کہ کسی طرح رجانہ چوک میں پہنچ جاؤ، ہم وہاڑی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں سے آپ کو ساتھ لے لیں گے۔“

اچھی خبر سن کر میں نے بھی اپنے مالک الطاف کو مبارک باد دی اور وعدہ کیا کہ آدھا گھنٹے تک میں بھی گھر سے نکل رہا ہوں۔“ پھر ہمارا رابطہ کٹ گیا۔

پھر رجانہ چوک میں پہنچ کر میں نے ان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ سلامتی سے میرے پاس پہنچ گئے۔ الطاف گاڑی سے اتر کر بڑی گرم جوشی اور خوشی سے ملا اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا تھا۔ کیونکہ اس کیس میں سب سے زیادہ مضبوط بیان میرا ہی تھا اور میں نے ہر تکلیف تو برداشت کر لی تھی لیکن اپنا حقیقی بیان نہیں بدلا تھا۔

ہم صبح جلد ہی سرگودھا تھانے میں موجود تھے۔ اب یہاں پکڑے ہوئے ملزموں کی پہچان کرنی باقی

تھی تو سارا کیس حل ہو چکا تھا۔ تھانے دار نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور ملزموں والی حوالات کے پاس لے گیا۔ میں نے فوراً ہی اس پلے دار کو پہچان لیا کہ یہی وہ شخص ہے جو ہمیں سب سے پہلے وہاں ملا تھا اور اسی نے ہی ہمیں چائے پلائی تھی۔“

پھر تھانے دار نے ہمیں وہ ساری تفصیل سنائی کہ یہ خطرناک گینگ کس طرح پکڑا گیا تھا اور ہمیں انھوں نے کس طرح اغوا کیا اور اغوا شدہ چینی کہاں غائب کی تھی۔ جب اس پلے دار نے دیکھا کہ ہم نے چائے پی لی ہے تو اس نے فوراً ہمیں کہا کہ اب جلدی کرو شہر سے باہر والے گودام میں ٹرک لے چلو تاکہ چینی اتاری جا سکے لیکن وہاں کوئی گودام نہیں تھا۔ لیکن ہمیں تو گاڑی میں بیٹھتے ہی بے ہوشی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انھوں نے ہمیں گاڑی کی سیٹوں کے پچھلی جانب پھینک دیا اور ان ہی پلے داروں میں شامل ایک پلے دار ڈرائیور بھی تھا۔ یوں وہ گاڑی وہاں سے لے کر گجرات کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرگودھا شہر سے نکل کر انھوں نے میرے استاد کو ایک ٹاؤن میں پھینک دیا اور مجھے گجرات شہر کی ایک مسجد میں۔ وہ اس قدر بوکھلائے ہوئے تھے کہ ایک جگہ گاڑی ایک ریڑھی والے سے ٹکرائی تو اس نے جب شور مچایا تو اس کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے اس کو چینی کی چھ بوریاں دے دیں تاکہ وہ کوئی مشکل نہ پیدا کر دے۔ یوں گجرات شہر میں پہنچ کر انھوں نے گاڑی روکی اور ایک ٹرک لے آئے۔ اس میں رات کو ہی چینی لوڈ کی اور اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ یوں یہ واردات ان کی کامیاب ہو گئی۔ اس طرح اس واقعے کے بعد اسلام آباد میں انھوں نے ایک اور بھی گاڑی اغوا کر لی اور یہ واردات بھی کامیاب رہی۔ پھر آخر وہ وقت بھی آ گیا جب ان ظالموں کو سارے حساب دینے تھے۔

ان دو وارداتوں کے بعد گینگ کے بڑے سردار جو پلے دار کے نام سے مشہور تھا۔ اس کو کوئی تحفے کے طور پر ایک موٹر سائیکل دیا گیا کہ جب تک تم چاہو اس موٹر سائیکل کو استعمال کر سکتے ہو۔ لیکن وہ موٹر سائیکل چوری کی تھی پھر کچھ دن بعد اس پلے دار جس کا نام منیر تھا اس کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ اب اس کے پاس سوائے اس چوری کی موٹر سائیکل کے کچھ نہیں تھا۔

وہ ایک دن موٹر سائیکل کو فروخت کرنے شوروم گیا۔ شوروم والے نے جب اس کی کاپی اور کاغذ وغیرہ مانگے تو اس نے اس کو بتایا کہ یہ سب کاغذ اس کے پاس نہیں اور یہ موٹر سائیکل اس کی ذاتی ہے۔ شوروم والے نے اس کو کہا کہ آپ بیٹھو میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔ تم چائے پی لو پھر بات کرتے ہیں۔ جب منیر پلے دار مطمئن ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے پولیس کو فون کر دیا۔ یوں وہاں سے منیر کو پولیس گرفتار کر کے تھانے لے آئی، اور جب پولیس نے اس کی تفتیش کی تو اس نے اپنی زندگی میں موجود کئی گناہوں کا اعتراف کیا، جس میں اس نے سرگودھا والی اس واردات کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے ہمارے ساتھ کی تھی اور پھر وہاں کے تھانے سے سرگودھا کے تھانے میں رابطہ کیا گیا اور یوں یہ تمام ملزم یہاں سرگودھا کے تھانے میں لائے گئے اور پھر حیرت انگیز بات یہ بھی سامنے آئی کہ ان تمام وارداتوں میں چینی کے گودام کے مالک کا بیٹا بھی شامل تھا۔ یوں چینی کی پوری قیمت گودام کے مالک نے اپنے ذمے کر لی اور ہم سب آزاد کر دیے گئے۔

ایک دن میں ان سب حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ مشکل حالات کیوں میری زندگی میں آئے تو اچانک مجھے وہ عورت یاد آ گئی جو اس وقت مشکل میں تھی اور اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا تھا۔ لیکن میں اس کی مدد نہیں کر سکا تھا پھر اس نے مجھے بددعا بھی دی تھی جو حقیقت میں سچ بن کر میری زندگی میں آئی اور مجھے احساس دلا گئی کہ مشکل میں کسی کو نہ چھوڑا جائے اور اس کو ہر مصیبت ہر پریشانی سے نکالا جائے۔ کیونکہ انسان ہی انسان کی مدد کو پیدا ہوا ہے۔ اب جب بھی وہ عورت مجھے یاد آتی ہے تو میں اس کے لیے ہزاروں دعائیں کرتا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ سب کو مشکلوں سے مصیبتوں سے امن میں رکھے۔ آمین۔

☆......☆......☆



میرا ساجن!

ضرغام محمود

کہتے ہیں ڈاکو سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں
مگر اس دوشیزہ کو لٹ کر ہی سب کچھ ملا تھا

جس نے سنا، اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہوگئے۔ بہت سے لوگوں نے تو اپنے آپ کو چٹکی کاٹ کر دیکھا کہ وہ جاگ رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں۔خبر ہی کچھ ایسی تھی۔زیتون بانو نے اپنے اکلوتے لاڈلے سپوت تنویر حسین عرف تانی کا رشتہ طے کر دیا تھا۔تانی کے ساتھ کے تمام دوستوں کی شادی کو اتنا عرصہ گزر چکا تھا کہ ان کے بچے بھی دوڑنے بھاگنے لگے تھے مگر زیتون بانو کی نظر میں ان کا لاڈلا ابھی بچہ تھا۔حالانکہ لکتا قد اور مضبوط ہاتھ پیروں کے ساتھ تنویر حسین بچپن ہی میں بھرپور جوان دکھتا تھا۔پھر اللہ نے ہاتھ میں ہنر بھی ایسا دیا تھا کہ روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ تھی۔زیتون بانو کی زندگی کافی تکلیف میں گزری تھی۔تین سال کی ازدواجی زندگی کے بعد زیتون بانو کے شوہر ننھے تانی کو ان کی گود میں دے کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔تب سے زیتون بانو نے اکیلے ہی ننھے تانی کو پالا۔اکیلی عورت کو دیکھ کر ہمارے معاشرے کے مرد کافی بے باک ہو جاتے ہیں مگر زیتون بانو کی زبان!! اللہ بچائے ہر شخص زیتون بانو سے پناہ مانگتا تھا۔

تنویر حسین عرف تانی فطرتاً شریف آدمی تھا اس کا سارا دماغ صرف کاروبار میں خرچ ہوتا تھا۔تنویر حسین بہترین بڑھئی تھا۔اس کے ہاتھ میں اللہ نے خاص ہنر رکھا تھا۔تانی کے بنائے لکڑی کے فرنیچر علاقے بھر میں مشہور تھے۔زیتون بانو نے اپنی جوانی تو ہر نعمت کو ترستے گزاری مگر بڑھاپے میں انہیں ہر قسم کی آسائش میسر آئی۔تانی نے گھر بھی پکا بنالیا اور گھر میں آسائش کی تمام چیزیں بھی مہیا کر دیں لہذا زیتون بانو کا بڑھاپا نہایت آرام سے کٹ رہا تھا۔

زیتون بانو شائد تنویر حسین عرف تانی کی شادی کے لئے راضی نہ ہوتی مگر جب ان کے کان میں یہ طعنہ پڑنے لگا کہ وہ بیٹے کی کمائی کھانے کے لئے اپنے بیٹے کو ساری عمر کنوارا رکھے گی تو انہیں تھوڑا احساس ہوا۔ویسے زیتون بانو ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو محلے والوں کی باتوں کا اثر لے۔اصل مسئلہ محلے کے ایک گھر میں ہونے والے واقعے سے ہوا جہاں گھر کے واحد کفیل نے اپنی مرضی سے شادی کرلی اور بیوی کو گھر لے آیا۔

اس واقعے کو سن کر زیتون بانو کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے بھی بادل نخواستہ بہو کی تلاش شروع کر دی۔زیتون بانو ایک جہاندیدہ عورت تھی اس نے زمانے کے سرد و گرم دیکھ رکھے تھے اسے احساس تھا کہ تانی بے شک شریف ہے سر جھکا کر اپنا کام کرتا ہے مگر۔مگر کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ اس کا آنکھ مٹکا بھی ہو جائے اور وہ......وہ بھی محلے کے اس لڑکے کی طرح کسی کو بیوی بنا کر لے آئے۔لہذا یہ سوچ کر زیتون بانو اپنی بہن حاجرہ کے ساتھ جگہ جگہ لڑکی دیکھنے جانے لگی مگر ہر جگہ وہ کبھی لڑکی کے چھوٹے قد، کبھی سانولا رنگ اور کبھی موٹے نقش و نگار کو بنیاد بنا کر لڑکیاں مسترد کرنے لگی۔

تنویر حسین کو اپنے کام کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھیں مگر جب سے گھر میں اس کی شادی کی باتیں شروع ہوئی تھیں اور اس کے ماں نے لڑکیاں دیکھنی شروع کی تھی تو اسے بھی گھر کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور وہ اپنی اماں اور خالہ کی باتوں پر دھیان دینے لگا۔اماں جن لڑکیوں کو دیکھ کر آتی اور اس لڑکی کے بارے میں اپنی بہن حاجرہ سے باتیں کرتی تو تنویر حسین اس لڑکی کا خیالی پیکر تراش لیتا اور خیالوں میں اس لڑکی کو دیکھنے لگتا۔شریف ہونے کے باوجود فطری تقاضے سر اٹھانے لگے تھے۔

جب زیتون بانو کو کوئی لڑکی اپنے معیار کی نہ ملی تو اس نے ایک رشتہ کرانے والی عورت سے رابطہ کیا اور اس کو اپنی ڈیمانڈ بتائی کہ وہ کیسی بہو چاہتی ہے۔زیتون بانو کی ڈیمانڈ سن کر رشتہ کرانے والی عورت حیرت زدہ رہ گئی مگر اس کے پاس زیتون بانو کے معیار کا ایک رشتہ تھا۔جب رشتہ کرانے والی نے اس رشتے کے بارے میں زیتون بانو کو بتایا تو زیتون بانو بنا لڑکی دیکھے اس رشتے پر راضی ہوگئی۔

☆......☆......☆

صابرہ اپنے نام کی طرح صابر تھی۔وہ یتیم لڑکی تھی اس کے ماں باپ اس کے بچپن ہی میں گزر گئے تھے۔وہ اپنے غریب ماموں کے ساتھ رہتی تھی صابرہ کا ماموں محنت مزدوری کر کے اپنے چھ بچوں کو پیٹ پال رہا تھا۔ایسے گھر میں آدھی روٹی صابرہ کو بھی مل جاتی تھی۔زیتون بانو کو جب صابرہ کے بارے میں رشتہ کرانے والی نے بتایا تو زیتون بانو نے صابرہ کو بنا دیکھے ہی پسند کرلیا۔

زیتون بانو ایک زمانہ شناس عورت تھی وہ جانتی تھی کہ اگر نگوڑے میکے والی اور ٹرک بھر کر جہیز لانے والی لڑکی



بہو بن کر اس کے گھر آئی تو ایسی لڑکی زیتون بانو کے قابو میں نہیں آئے گی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی اس کے اکلوتے بیٹے کو ہی لے کر اڑن چھو ہو جائے۔ ان ہی خیالات کے تحت زیتون بانو صابرہ کو دیکھنے اپنی بہن حاجرہ کے ساتھ صابرہ کے ماموں کے گھر پہنچی۔

صابرہ کے ماموں ممانی نے اپنے حساب سے دونوں بہنوں کا اچھا سواگت کیا اور اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا مگر زیتون بانو وہاں اکڑی بیٹھی رہی اور زیادہ کسی سے بات چیت نہیں کی۔ مگر وہ لومڑی کی نظر سے صابرہ اور دیگر گھر کے افراد کا معائنہ کر رہی تھی۔

زیتون بانو کے رویے سے صابرہ کے ماموں اور ممانی کے چہروں پر مایوسی جھلکنے لگی مگر رخصت ہوتے ہوئے زیتون بانو نے صابرہ کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو صابرہ کے ماموں اور ممانی کے چہروں پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ گھر واپس آ کر زیتون بانو کی بہن حاجرہ نے زیتون بانو سے کہا۔

”آپا! میرا تو خیال تھا کہ آپ وہاں رشتے سے انکار کر دیں گی مگر آپ نے تو...... اس گھر سے تانی کو کوئی جہیز نہیں ملنے والا......“ حاجرہ نے جملہ توڑ توڑ کر ادا کیا۔

”جہیز کی مجھے فکر نہیں ہے۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔“ زیتون بانو نے بھی جملے توڑ کر جواب دیا۔

”مگر آپا! آپ نے لڑکی کی عمر دیکھی ہے تانی سے آدھی عمر کی ہے۔“ حاجرہ بولی۔

”یہی تو میں چاہتی تھی کہ لڑکی کم عمر ہو۔ کم عمر لڑکی ہر ماحول میں ڈھل جاتی ہے۔ پھر یتیم بچی ہے، ماموں ممانی ایک دفعہ بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکیں گے تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھیں گے۔ اگر میں تھوڑے ٹکڑے میکے والی بہو لے آؤں تو اسے اپنے میکے کا بڑا مان ہوگا اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹکڑے میکے والی بہو میری اکلوتی کمائی میرے بیٹے ہی کو لے کر چلتی بنے۔ تو میں ابھاگن کیا کروں گی۔“ زیتون بانو کا خوف زبان پر آ ہی گیا۔

”مگر آپا لڑکی بہت چھوٹی اور معصوم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے حسن اور معصومیت کا جادو تانی پر چل جائے؟“ حاجرہ نے ایک نئے خوف کا اظہار کیا۔

”تانی کی ساری لگام میرے ہاتھ میں ہیں۔ وہ میری نظر سے اپنی بیوی کو دیکھے گا۔“ زیتون بانو نے بڑے مان سے حاجرہ کو جواب دیا تو حاجرہ خاموش ہو گئی۔

☆......☆......☆

”گھر بھی پکا ہے اور گھر میں آسائش کی ساری چیزیں بھی موجود ہیں۔ دیکھنا ہماری صابرہ راج کرے گی۔“ تنویر حسین کو دیکھنے کے بعد واپس جاتے ہوئے راستے میں صابرہ کے ماموں نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لڑکا بھی شریف ہے مگر......“ صابرہ کے ممانی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”مگر کیا۔“

”لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔ صابرہ کا تو ابھی سن سولہ کا ہی لگا ہے۔“ صابرہ کی ممانی کی زبان پر دل کی بات آ گئی۔

”ارے لڑکے کی عمر کون دیکھتا ہے...... اچھے قد کاٹ کا ہے پھر کماؤ بھی ہے۔ سوچ صابرہ کے بعد ہمیں اپنی بھی چار چار بیٹیوں کا بیاہ کرنا ہے۔“ صابرہ کے ماموں نے جواب دیا۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں مگر...... مجھے زیتون بانو کی زبان سے تھوڑا ڈر لگ رہا ہے۔ زیتون بانو زبان کی بہت کڑوی ہے۔“

”تو فکر نہ کر۔ ہماری صابرہ اپنی خدمت سے ساس کا دل جیت لے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر منے کے ابا! صابرہ کی شادی کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔“ صابرہ کی ممانی نے ایک نئے خدشے کا اظہار کیا۔

”دیکھ صابرہ کی ماں کا جو تھوڑا بہت زیور ہے وہ صابرہ کو چڑھا دینا، باقی میں نے زکوٰۃ کمیٹی والوں سے بات کی ہے۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبیل نکال دے گا۔“ صابرہ کے ماموں نے جواب دیا۔ مرحومہ بہن اور بہنوئی کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

گھر پہنچ کر صابرہ کے ماموں نے صابرہ کو اپنے پاس بٹھایا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہو کہا۔

”صابرہ بیٹے۔“ صابرہ کے ماموں نے نہایت پیار سے صابرہ کو مخاطب کیا تو صابرہ نہایت حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اپنے بچپن سے اس نے اپنے

ماموں کو ہر وقت غصے سے چیختے چلاتے ہی دیکھا تھا۔ صابرہ تو پھر بھی یتیم ہونے کی وجہ سے اکثر بچ جاتی تھی۔ ماموں اپنے بچوں کو ذرا سی غلطی پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے تھے۔

”صابرہ بیٹا۔ ایک مہینے بعد تیری شادی ہے تو رخصت ہو کر اس گھر سے چلی جائے گی۔ شادی کے بعد لڑکی کا اپنے میکے پر ہر قسم کا حق ختم ہو جاتا ہے اور پھر تیرا تو میکہ بھی نہیں ہے۔ یہ غریب ماموں جب تک تیری ذمہ داری اٹھا سکتا تھا اٹھالی۔ شادی کے بعد تو تُو بھول جانا تیرا کوئی ماموں بھی تھا۔ اپنے شوہر کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا اور اس کی ماں کو اپنی سگی ماں سمجھنا۔ سسرال میں صبر اور برداشت سے کام لینا۔ اگر تیرے ساتھ کچھ زیادتی ہو بھی جائے تو اس کو نہایت صبر سے برداشت کرنا۔ بیٹا تیرا ماموں اتنا غریب ہے کہ اس کی جیب میں تیرے گھر تک آنے کا کرایہ بھی شائد نہ ہو۔“ اتنا کہہ کر صابرہ کے ماموں خاموش ہو گئے۔

”ماموں! میں کبھی آپ کو یا کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ اگر میرے ساتھ کچھ غلط بھی ہوگا تو میں نہایت صبر کے ساتھ اسے برداشت کروں گی۔“ صابرہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”شاباش بیٹا۔ مجھے تم سے یہی امید ہے۔“

☆......☆......☆

ادھر دوسری جانب تنویر حسین کے دوست اس کو مسلسل چھیڑ رہے تھے۔ اس کے شادی شدہ دوست اسے مشوروں سے نواز رہے تھے۔ چند دوست مسلسل تنویر حسین سے مذاق کر رہے تھے۔ تنویر حسین کم گو تھا اور خود کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی کا مذاق برداشت کرتا تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی...... اس کی شادی کے حوالے سے دوست اس کو چھیڑ رہے تھے تو تنویر حسین کو یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ دوستوں کی باتوں سے تنویر حسین کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ تنویر حسین کے شادی شدہ دوست اسے سہاگ رات کے حوالے سے ڈائیلاگ یاد کروا رہے تھے جو اسے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر بولنے تھے۔

تنویر حسین کے لئے ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب تک شادی کے متعلق سوچا نہیں تھا تو کوئی خواہش نہیں تھی مگر اب دل میں ارمان جاگ اٹھے تھے۔ تنویر حسین کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت گھر میں گزارنے لگا تھا۔ بات بے بات مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کی دلی کیفیت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔

”دیکھ لو آپا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی اور تانی کے دانت کیسے نکل رہے ہیں۔“ تنویر حسین کو آپ ہی آپ مسکراتا دیکھ کر حاجرہ نے اپنی بہن زیتون بانو سے کہا تو زیتون بانو نے کوئی جواب نہیں دیا اور فکرمندی سے اپنی گردن ہلانے لگی۔

ادھر صابرہ کی سہیلیاں بھی صابرہ کو مسلسل چھیڑ رہی تھیں اس کی سہیلیوں میں ایک دو شادی شدہ سہیلیاں بھی تھی وہ صابرہ کو مسلسل گائیڈ کر رہی تھی

”اف! صابرہ تجھے دیکھ کر تو دولھا بھائی فدا ہو جائیں گے۔“

”سچی کہتی ہوں۔ صابرہ تیرے کان رومانی جملے سن سن کر پک جائے گے۔ مگر دولھا بھائی کے زبان نہیں تھکے گی۔“ صابرہ کی ایک شادی شدہ سہیلی نے کہا

”کیوں۔۔ کیا تیرے بھی کان پک گئے تھے اپنے شوہر کے جملے سن سن کر۔“ صابرہ کی ایک سہیلی نے کہنے والی کو چھیڑا۔

”ہٹ بے شرم۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ہمیں بتاؤ دولھا بھائی کیا کیا کہتے تھے۔۔“ سب سہیلیاں صابرہ کو چھوڑ کر اس سے چمٹ گئی تو صابرہ کی اس سہیلی نے شرماتے ہوئے اپنے شوہر کے چند جملے پیش کیے۔

اس طرح کی باتیں سن کر صابرہ کے دل میں بھی امنگیں جاگنے لگیں اور وہ جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

پھر وہ وقت بھی آ ہی گیا جب دولھا بنے تنویر حسین پھولوں سے سجی گاڑی میں چھوئی موئی سے صابرہ کو بیاہ کر اپنے سنگ لے آیا۔ دلہن بنی صابرہ جب تنویر حسین کے سنگ اس کے گھر پہنچی تو محلے کی وہ عورتیں جو کسی وجہ سے شادی میں نہ جا سکی تھیں، وہ تمام عورتیں زیتون بانو کے گھر اکٹھا ہو گئیں۔ سب تنویر حسین کی دلہن کو دیکھنا چاہتی تھی محلے کی جو بھی عورت صابرہ کی موہنی صورت دیکھتی وہ

دیکھتی رہ جاتی۔ ذرا سی دیر میں پورے محلے میں یہ بات پھیل گئی کہ تانی کی دلہن پریوں کی طرح معصوم اور خوبصورت ہے۔ جب تنویر حسین کے کانوں میں صابرہ کی خوبصورتی کی آوازیں پہنچیں تو اس کے چہرے پر ایک مغرورانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تنویر حسین کی اس مسکراہٹ نے زیتون بانو کو بے چین کر دیا۔

''آپا دیکھ لو تانی کے تو دانت ہی بند نہیں ہو رہے ہیں۔'' حاجرہ نے موقع پا کر اپنی بہن زیتون بانو سے کہا۔

''معلوم ہے، زیادہ پریشان مت کر مجھے۔'' زیتون بانو نے حاجرہ کو جھڑک دیا۔ خود زیتون بانو بھی صابرہ کی خوبصورتی سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر غریب اور کم عمر لڑکی لائی تھی کہ وہ اس کے قابو میں رہے گی مگر...... کہیں بازی الٹ نہ جائے۔ یہ سوچ سوچ کر زیتون بانو دہل رہی تھی۔

جب ایک ایک کر کے سب مہمان گھر سے رخصت ہو گئے اور تنویر حسین بھی اپنے کمرے میں اپنی دلہن کے پاس جانے کے لئے پر تولنے لگا تو زیتون بانو نے اپنے کمرے کے دروازے سے تنویر حسین کو آواز دی اور اپنے کمرے میں بلایا۔

جب تنویر حسین ماں کی طلبی پر کمرے میں پہنچا تو زیتون بانو تھکی تھکی سی مسہری پر تکیے سے ٹیک لگائے۔ پیر پھیلائے بیٹھی تھی۔ تنویر حسین ماں کے قدموں کے پاس مسہری پر بیٹھ گیا۔ تنویر حسین کے بیٹھنے کے بعد زیتون بانو دھیمی لہجے میں بولنے لگی۔

''تانی بیٹا...... دنیا میں بہت کم مائیں میری جیسی ہوں گی۔ میں نے اپنا آپ مار کر تجھے پالا ہے۔ تجھے تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ کب تیرا ابا اس دنیا سے گیا تھا۔ میں نے تنہا دنیا سے لڑ کر تجھے جوان کیا ہے۔'' زیتون بانو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''ہاں اماں...... میں گواہ ہوں اس بات کا کہ تم نے کتنی مشکلیں اٹھائیں ہیں۔''

''بس میرے لعل...... یہ بات یاد رکھنا کہ میں تیری ماں ہوں۔ کہیں شادی کے بعد تو بدل گیا تو میں بوڑھیا کیا کروں گی۔'' زیتون بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اماں...... اماں یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں کیوں بدل جاؤں گا۔'' ماں کے آنسو دیکھ کر تنویر حسین تڑپ اٹھا۔

''بیٹا میں نے دنیا دیکھی ہے۔ شادی کے بعد لڑکے بیوی کے کانوں سے سنتے اور بیوی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ماں بے چاری تو کسی گنتی میں نہیں آتی۔'' زیتون بانو نے تنویر حسین کو مزید جذباتی کیا۔

''میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔'' تنویر حسین بے چین ہو گیا۔

''نہ...... نہ میرے لعل! تُو ایسا نہیں ہے مگر تیری بیوی کا مزاج کیسا ہے یہ پتا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کو وہ میری چوٹی پکڑ کر گھر سے باہر نکال دے تو میں بیوہ بوڑھیا کہاں جاؤں گی۔'' زیتون بانو باقاعدہ رونے لگی۔

''اماں۔ اماں۔'' تنویر حسین سچ مچ گھبرا گیا۔ ''اماں ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔ اگر کبھی میری بیوی نے آپ سے اونچی آواز سے بھی بات کی تو وہ دن اس کا اس گھر میں آخری دن ہوگا میں تین حرف کے ساتھ اسے اس کے گھر واپس بھیج دونگا۔'' تنویر حسین نے آخر کار وہ جملہ بول ہی دیا جس کا زیتون بانو کو انتظار تھا۔

''مجھے تجھ پر پورا اعتبار ہے تانی بیٹا! میں تو اب صرف اس لئے زندہ ہوں کہ تیرے بیٹے کا منہ دیکھ لوں تُو مجھے جلدی سے دادی بننے کی خوشخبری سنا دے۔'' زیتون بانو آنسو پونچھتے ہوئے بولی تو تنویر حسین مرد ہو کر بری طرح شرما گیا۔

''جا اپنے کمرے میں جا۔ تیری دلہن انتظار کر رہی ہوگی۔'' تھوڑی دیر بعد زیتون بانو نے تنویر حسین سے کہا۔

''کرنے دو انتظار۔ کوئی انتظار کرتے کرتے مر تو نہیں جائے گی۔'' تنویر حسین نے بے زاری سے کہا اور زیتون بانو کے پاؤں دبانے لگا۔ تھوڑی دیر میں زیتون بانو کی آنکھ لگ گئی تو تنویر حسین نے نہایت آہستگی سے اپنی ماں کو چادر اوڑھائی اور دبے قدموں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تنویر حسین بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ اب اس کے جذبات میں وہ گرمی نہیں تھی جو تھوڑی دیر پہلے تھی۔ زیتون بانو کی باتوں نے تنویر حسین کے سارے جذبات ٹھنڈے کر دیے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی شادی نے اس کی ماں کو کتنے خدشات میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ کتنی بے سکون ہو گئی ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے تنویر حسین اپنے کمرے میں پہنچا۔ دروازے کی چٹخنی لگا کر مسہری کی جانب بڑھا۔

مسہری پر صابرہ دل میں کئی ارمان سنبھالے سمٹی بیٹھی تھی تنویر حسین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا مسہری کے پاس آیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر صابرہ مزید سمٹ گئی۔ خوبصورت سی مسکان اس کے لبوں پر مچلنے لگی۔ شرم سے اس کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔ تنویر حسین مسہری کے قریب پہنچ کر مسہری پر بیٹھ گیا تنویر حسین کے بیٹھتے ہی صابرہ مزید سمٹ گئی۔ تنویر حسین نے صابرہ کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر صابرہ کو مخاطب کیا۔

''صابرہ! آج نکاح کے دو بولوں سے تُو میری بیوی بن گئی ہے اور میں تیرا شوہر بن گیا ہوں، مگر یاد رکھنا تیرا شوہر بنانے سے پہلے میں اپنی بیوہ ماں کا بیٹا ہوں۔ میری ماں نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر مجھے پالا ہے۔ اس دنیا میں مجھے اپنی ماں سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کبھی زندگی کے کسی موڑ پر تمہاری وجہ سے میری ماں کا دل دکھا تو تم سمجھ لینا وہ دن تمہارا اس گھر میں آخری دن ہوگا۔ میں......''

''میں کبھی بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میری زندگی کا مقصد آپ کو اور اماں جی کو خوش رکھنا ہے۔'' صابرہ نے تنویر حسین کی بات مکمل نہ ہونے دی اور تڑپ کر جواب دیا۔

یہ گھر اس کی آخری پناہ گاہ تھا۔ اس گھر سے نکل کر وہ کہاں جاتی۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص اس کے سر کا سائیں تھا۔ اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کی ہر خواہش ہر حکم بجا لانا اس کی عبادت تھی۔ بن ماں باپ کی کچے پکے مکان میں رہنے والی صابرہ کے لئے تنویر حسین جیسے گبرو جوان کی رفاقت ایک نعمت تھی جس پر وہ خدا کا جتنا شکر بجا لاتی کم تھا۔ صابرہ تنویر حسین کا ساتھ پا کر بے حد خوش تھی۔ زیتون بانو کی باتوں نے تنویر حسین کے جذبات کو بے شک ٹھنڈا کر دیا تھا مگر اب جبکہ صابرہ نے خود گھونگھٹ الٹ کر اسے طمینان بخش جواب دیا تو تنویر حسین مطمئن ہو گیا۔ اب تنویر حسین پُرشوق نظروں سے صابرہ کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ اس کی نظریں صابرہ کے حسین چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ صابرہ تنویر حسین کے مسلسل گھورنے پر بری طرح شرما گئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنا گھونگھٹ خود ہی اٹھا دیا تھا مگر اب شرم سے اس کا برا حال تھا۔ وہ اپنے حنائی ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رہی تھی ادھر تنویر حسین کا دل بھی صابرہ کے حسن کے قصیدے پڑھنے کو چاہ رہا تھا مگر دماغ میں ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ کہیں صابرہ اپنی تعریفیں سن کر اس کے سر پر نہ چڑھ جائے۔ آخر دل وہ دماغ کی اس کشمکش میں جیت دماغ کی ہوئی اور تنویر حسین نے مزید کوئی بات کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر لائٹ بند کر دی۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا، وقت کا چرخہ گھومتا رہا صابرہ تنویر حسین کے گھر میں دو وقت کی روٹی کے عوض گھر کا سارا کام کرتی اور اپنی ساس زیتون بانو کے طعنے سنتی۔ کئی بار زیتون بانو نے صابرہ پر ہاتھ بھی اٹھایا مگر صابرہ سر جھکا کر نہایت دلجمعی سے زیتون بانو اور تنویر حسین کی خدمت کرتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی صابرہ کا بھی دل چاہتا تھا کہ اس کا شوہر اس سے پیار کرے۔ اس کی دل جوئی کرے۔ جب وہ تھک ہار کر رات کو بستر پر لیٹے تو اس کا شوہر اس کے دل کے زخموں پر اپنے پیار کا مرہم رکھے۔ کبھی اس کے لئے گجرا لائے، اس کو کوئی تحفہ دے مگر تنویر حسین کے دماغ میں زیتون بانو نے شادی کی پہلی رات جو زہر بھرا تھا وہ اتنا طاقتور تھا کہ لاکھ صابرہ کی خدمت کے تنویر حسین کا دل صابرہ کے لئے نرم نہ پڑ سکا۔ وہ کئی کئی روز تک صابرہ کو مخاطب بھی نہیں کرتا تھا۔ ورنہ تنویر حسین رات کو کام پر سے آتے ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ جاتا اور زیتون بانو کے ساتھ ہی کھانا کھاتا۔ کھاتے وقت اسے کبھی صابرہ کی یاد نہیں آئی۔ نہ ہی اس نے کبھی صابرہ سے پوچھا کہ اس نے بھی کھانا کھایا یا نہیں۔

رات گئے تک تنویر حسین اپنی ماں سے باتیں کرتا رہتا اور پھر جب اس کو نیند ستانے لگتی تو کمرے میں آ کر سو جاتا۔ صابرہ رات بھی اس انتظار میں کاٹتی کہ شائد کبھی تنویر حسین اس سے اس کا حال چال بھی پوچھ لے مگر...... مگر تنویر حسین بے حس مجسمے کی طرح سوتا رہتا اور صابرہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے ان پانچ سالوں میں اور تو کچھ نہیں بدلا ہاں زیتون بانو کے طعنوں میں تیزی آ گئی۔ اب زیتون بانو دیگر طعنوں کے ساتھ صابرہ کو

بانجھ ہونے کا طعنہ بھی دینے لگی۔ زیتون بانو صابرہ کو بے ثمر درخت کہتی تھی وہ ہر آئے گئے کے سامنے یہ دکھڑا روتی اور برملا اپنے لاڈلے بیٹے کی دوسری شادی کی بات کرتی۔ تنویر حسین کی دوسری شادی کا سن کر صابرہ اندر تک لرز جاتی۔

یہ گھر اس کی آخری پناہ گاہ تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کہاں جا سکتی تھی۔ صابرہ گڑگڑا کر خدا سے اولاد کی دعائیں کرتیں۔ مگر لگتا تھا کہ ابھی صابرہ کے آزمائش کے دن ختم نہیں ہوئے۔

ایک دوپہر جب گرمی اپنے عروج پر تھی، انسان تو انسان چرند پرند بھی اپنے ٹھکانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ایسی چلچلاتی گرمی میں زیتون بانو کے گھر کا دروازہ زور سے کسی نے بجایا۔

"کون آ گیا اس وقت۔" زیتون بانو تخت پر پیر پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی اور صابرہ ان کے پیر دبا رہی تھی۔

"چل پرے ہٹ۔ میں دیکھتی ہوں کون ہے۔" زیتون بانو نے پاؤں سے صابرہ کو ہٹایا اور تخت سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔

"کون ہے۔" دروازے کے پاس پہنچ کر زیتون بانو نے پوچھا۔

"اماں جی۔ ہمیں تائی نے بھیجا ہے یہ سامان آپ کو دینا ہے۔" دروازے کے دوسری جانب سے ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔

"اچھا۔ اچھا کھول رہی ہوں دروازہ۔" اتنا کہہ کر زیتون بانو نے دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکنے لگی یہی زیتون بانو کی غلطی تھی۔ دروازے کو ایک زبردست ٹھوکر لگی اور دو موٹے تازے لڑکے گھر میں داخل ہو گئے۔ دروازے کو لگنے والے زوردار دھکے سے زیتون بانو زمین پر گر گئی مگر پھر فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم لوگ۔۔"

"خاموش بڑھیا۔۔۔" ایک لڑکے نے اپنی پینٹ کی جیب سے پستول نکال کر زیتون بانو پر تان لیا۔ پستول دیکھ کر زیتون بانو خوف سے کانپنے لگی، دوسرا لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اپنا پستول صابرہ پر تان لیا۔

"جو کچھ مال گھر میں رکھا ہے ہمارے حوالے کر دو ورنہ۔۔۔" ایک لڑکے نے زیتون بانو کو دھمکی دی۔

"ہم۔ ہم لوگ غریب لوگ ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔۔" زیتون بانو اب سنبھل چکی تھی۔

"سیدھی طرح بتا دو کہ مال کہاں رکھا ہے ورنہ۔۔۔" لڑکے نے پستول زیتون بانو کی کنپٹی سے لگایا صابرہ خوفزدہ نظروں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ دیکھ لینا پولیس تم لوگوں کا کیا حشر کرتی ہے۔" زیتون بانو نے زور سے چیخ کر کہا زیتون بانو کی بات سن کر ایک لڑکے نے اپنے پستول کا دستہ زور سے زیتون بانو کے سر پر دے مارا زیتون بانو ہلکی سی چیخ کے ساتھ زمین بوس ہو گئی اور ان کے سر سے خون بہنے لگا یہ دیکھ کر صابرہ حواس باختہ ہو گئی اور اماں کہہ کر زیتون بانو کے پاس جانا چاہتی تھی مگر دوسرے لڑکے نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو مجھے! اماں کے پاس جانے دو دیکھو کتنا خون نکل رہا ہے اماں کے سر سے۔" صابرہ رونے لگی۔

"خاموش...... بتا۔۔ مال کہاں چھپا رکھا ہے۔" لڑکے نے صابرہ کی گردن پر پستول کی نال رکھی۔

"لے جاؤ سب کچھ لے جاؤ مگر۔ خدارا اماں کو چھوڑ دو۔۔" صابرہ گڑگڑائی۔

"چل مال نکال۔" ایک لڑکے نے صابرہ کو دھکا دیا تو صابرہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے کی جانب بڑھی۔

"بڑھیا کا خیال رکھنا میں مال لے کر آتا ہوں۔" ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے سے کہا اور صابرہ کے پیچھے چل دیا۔

کمرے میں پہنچ کر صابرہ نے الماری کھولی اور جو کچھ تھا نکال کر لڑکے کے سامنے رکھ دیا۔

"بس یہی کچھ...... باقی کا مال کہاں ہے۔" لڑکے نے اپنے سامنے رکھے زیور اور پیسوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے صابرہ سے پوچھا۔

"بس یہی کچھ ہے۔" صابرہ مسلسل رو رہی تھی۔

"بس اتنا سا مال۔ تنویر حسین کماتا تو اچھا خاصا ہے۔ گھر میں روپیہ پیسہ نہیں رکھتا۔" لڑکے نے سارا زیور اور پیسے ایک رومال میں باندھے اور اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے۔

"بس یہی کچھ ہے خدارا سب لے جاؤ مگر ہمیں چھوڑ دو۔" صابرہ مسلسل رو رہی تھی۔

"شٹ۔ اتنی محنت کے بعد بس اتنا سا مال......" لڑکے نے مایوسی سے گردن ہلائی پھر کمرے میں چاروں اطراف نظریں گھمانے لگا۔ صابرہ دیوار کے ساتھ سہمی ہوئی کھڑی تھی اس کا دوپٹہ اس کے قدموں میں پڑا تھا وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"اتنی محنت کے بعد اتنا سا مال مزا نہیں آیا۔" لڑکے نے کمرے میں نظر دوڑانے کے بعد مایوسی کے عالم میں گردن ہلائی پھر اس کی نظر سہمی ہوئی صابرہ پر پڑی تو اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے اپنا پستول اپنی جیب میں رکھا اور آگے بڑھ کر صابرہ کو پکڑ لیا صابرہ چیخنے لگی مگر اس لڑکے نے صابرہ کو کمرے میں رکھی مسہری پر دھکا دے دیا......

☆......☆......☆

صابرہ پر ایک قیامت گزر چکی تھی۔ وہ بے حس مسہری پر پڑی تھی ڈاکو لٹ کا مال و دولت کے ساتھ صابرہ کی عزت بھی لوٹ کر لے گیا تھا۔ کافی دیر تک صابرہ بے سدھ مسہری پر پڑی رہی پھر اسے زیتون بانو کا خیال آیا تو وہ گھبرا کا اٹھ بیٹھی اور دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچی صحن کے فرش پر زیتون بانو بے ہوش پڑی تھی زیتون بانو کے سر سے خون نکل نکل کر فرش پر جم چکا تھا۔ صابرہ اپنی تکلیف بھول گئی اور زیتون بانو کو ہوش میں لانے لگی مگر زیتون بانو ہوش میں نہ آئی تو صابرہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ صابرہ کی رونے کی آواز سن کر محلے کے افراد جمع ہو گئے۔ کسی محلے دار نے تنویر حسین کو بھی خبر کر دی تنویر حسین فوراً گھر آ گیا اور زیتون بانو کو ہسپتال لے گیا زیتون بانو ایک ہفتہ بے ہوش رہ کر ہوش میں آ گئی۔ صابرہ اپنی تکلیف بھول کر ساس کی خدمت میں لگ گئی۔ سارے محلے دار اور جان پہچان والے ان کے گھر ڈکیتی کی واردات اور مال و اسباب لٹنے پر صابرہ سے ہمدردی کر رہے تھے مگر صابرہ کسی کو یہ نہ بتا سکی کہ ڈاکو مال و دولت کے ساتھ اس کی عزت بھی لے گئے۔ صابرہ خاموشی کے ساتھ زیتون بانو کی تیمارداری میں لگی رہی، آخر کار صابرہ کی محنت رنگ لے آئی اور زیتون بانو صحت یاب ہو گئی اور زندگی کی جانب لوٹ آئی مگر صابرہ......

صابرہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی تمام لوگ صابرہ کی حالت کو ڈکیتی کی دہشت سمجھ رہے تھے پھر ایک دن جب صابرہ گھر کے کام کر رہی تھی کہ اس کا سر زور سے چکرایا اور وہ دھڑ سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا صابرہ۔" زیتون بانو اس وقت صابرہ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ صابرہ کو گرتے دیکھ کر زیتون بانو لپک کر اس کے پاس پہنچی اور صابرہ کو گھسیٹ کر تخت پر لٹایا اور اسے ہوش میں لانے لگی۔ جب صابرہ ہوش میں نہیں آئی تو زیتون بانو نے پڑوس کے لڑکے کو بھیج کر محلے میں کلینک کرنے والے لیڈی ڈاکٹر کو بلایا۔ لیڈی ڈاکٹر نے صابرہ کو انجکشن لگایا تو صابرہ ہوش میں آ گئی پھر لیڈی ڈاکٹر صابرہ کا چیک اپ کرنے لگی صابرہ کی چیک اپ کرنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر مسکرانے لگی۔ اور مسکرا کر زیتون بانو سے کہا۔

"مبارک ہو اماں! آپ کو! آپ کی دعائیں رنگ لے آئی ہیں۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔"

"کیا"

"ہاں آپ کی بہو ماں بننے والی ہے۔ مگر یہ بہت کمزور ہے۔ آپ کو اس کا پورا پورا خیال رکھنا پڑے گا۔ اسے مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے اور اس کی ڈائٹ کا بھی خاص خیال رکھیے۔ میں کچھ دوائیں لکھ دیتی ہوں آپ منگوا لیجیے۔" لیڈی ڈاکٹر نے کہا اور دوائیں لکھ کر زیتون بانو کو دیں پھر صابرہ کی جانب مڑی اور صابرہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ آرام کرنا۔" اتنا کہہ کر لیڈی ڈاکٹر اپنی فیس لے کر چلی گئی۔

لیڈی ڈاکٹر کے جاتے ہی زیتون بانو صابرہ سے لپٹ گئی اور اسے پیار کرنے لگی۔

"میری رانی! تُو نے دیر سے سہی مگر مجھے خوشخبری سنا ہی دی۔ تُو۔ تو اب آرام کر میں خود گھر کے سارے کام کر لوں گی۔ تو، تو میری آئندہ نسلوں کی امین ہے۔" زیتون بانو صابرہ کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

صابرہ حیران نظروں سے زیتون بانو کو دیکھ رہی تھی۔ ان پانچ سالوں میں پہلی بار زیتون بانو نے صابرہ کو پیار کیا تھا۔ صابرہ حیران حیران نظروں سے زیتون

بانو کو دیکھ رہی تھی۔

''تو ایسا کر اپنے کمرے میں جا اور آرام کر۔ میں یہ خوشخبری تائی کو بتا کر آتی ہوں۔'' زیتون بانو نے کہا اور صابرہ کو سہارا دے کر اس کمرے تک پہنچایا اور صابرہ کو آرام سے مسہری پر لٹا دیا اور پھر گھر سے باہر چلی گئی۔

ادھر صابرہ کا ذہن مختلف سوچوں میں گھرا تھا۔

''یہ۔ یہ بچہ تائی جی کا تو نہیں ہے۔ یہ تو، یہ تو، اس ڈاکو کا ہے...... جو......'' صابرہ خوف سے لرز رہی تھی۔ دو ماہ پہلے کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

''میں۔ تائی جی کو سب سچ بتا دوں گی۔ یہ بچہ ان کا نہیں ہے۔ میں تائی جی کو دھوکا نہیں دے سکتی۔'' صابرہ مسلسل سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صابرہ نے دھیرے سے اپنے پیٹ کو سہلایا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''میں نے اس بچے کے لئے کتنی دعائیں مانگیں۔ مگر...... مگر اس طرح بچہ...... نہیں نہیں......'' صابرہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

اسی وقت بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی تنویر حسین کی آواز بھی ابھری۔ تنویر حسین صابرہ کو پکار رہا تھا۔ صابرہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔ اسی وقت تنویر حسین کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کافی سامان تھا اس نے سامان مسہری کے ایک کونے پر رکھا اور مسہری پر صابرہ کے مقابل بیٹھ گیا۔ پھر اس نے بڑے پیار سے صابرہ کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور صابرہ کے ماتھے پر پیار کیا۔ صابرہ نے حیران نظروں سے تنویر حسین کو دیکھا۔ آج تک تنویر حسین نے اسے اس طرح پیار نہیں کیا تھا۔

''صابرہ۔ اماں نے مجھے بتا دیا ہے۔ سچ صابرہ میں۔ میں بہت خوش ہوں، اور یہ خوشی تم نے مجھے دی ہے۔ سچ ہے خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ اب ہمارے گھر بھی ننھا مہمان آئے گا۔ اف وہ مجھے پاپا کہہ کر پکارے گا تو کیسا لگے گا۔'' تنویر حسین اپنی ہی رو میں بولتا جا رہا تھا پھر اس نے صابرہ کو اپنے سینے سے لگایا۔

''دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں۔'' تنویر حسین نے مسہری کے کونے میں رکھا بڑا سا شاپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ تیرے لئے میں یہ سوٹ لایا ہوں۔'' تنویر حسین نے صابرہ کو کڑھائی والا سوٹ دیتے ہوئے کہا تو صابرہ سوٹ ہاتھ میں لئے حیران نظروں سے تنویر حسین کو دیکھ رہی تھی، جو شاپر میں سے اور چیزیں بھی نکال رہا تھا۔

''یہ دیکھ یہ سونے کا ہار صرف تیرے لئے ہے۔ جب اماں نے مجھے یہ خوشخبری سنائی تو میں سیدھا سنار کے پاس گیا اور یہ ہار خرید کر لے آیا۔ یہ ہار تجھ پر بہت اچھا لگے گا۔'' تنویر حسین نے اتنا کہہ کر ہار کو ڈبے سے نکالا اور صابرہ کے گلے میں پہنانے لگا۔ صابرہ کو لگ رہا تھا کہ آج وہ حیرت سے مر ہی نہ جائے۔ تنویر حسین اس کے لئے تحفہ لایا تھا......

صابرہ حیران حیران نظروں سے تنویر حسین کے تکے جا رہی تھی۔

''اوہ ۔۔ صابرہ آج ۔۔۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش......'' تنویر حسین نے صابرہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مجھے ۔۔ تائی جی کو سچ بتا دینا چاہیے۔'' صابرہ نے سوچا۔

''اگر...... اگر تم تائی جی کو سچ بتا دو گی تو سوچو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ آج کتنا خوش ہے۔ کیا تم ان سے ان کی خوشیاں چھین لینا چاہتی ہو۔۔'' صابرہ کے اندر سے ایک دوسری آواز ابھری تھی۔

''لیکن۔ لیکن ۔ اگر نہیں بتاؤں گی تو یہ دھوکا ہوگا۔'' صابرہ مسلسل سوچوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔

''نہیں صابرہ یہ دھوکا نہیں ہے۔ سنا ہے قیامت کے دن بچے اپنی ماں کے نام سے پکارے جائیں گے۔ تمہارا یہ بچہ بھی تمہارے نام سے پکارا جائے گا، تمہارا یہ بچہ بہت قسمت والا ہے، جو دنیا میں آنے سے پہلے اتنے سب لوگوں کو خوشیاں دے رہا ہے۔ خدا کے لئے ان سب کی خوشیاں مت چھینو۔'' صابرہ کے اندر سے پھر ایک آواز ابھری۔

صابرہ نے ایک لمحے کو، صرف ایک لمحے کو سوچا اور پھر تنویر حسین کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور تنویر حسین کی قمیص میں جذب ہو گئے۔

☆☆......☆☆

آستین کے سانپ



ایم یعقوب

ڈیرہ اسماعیل خان سے اس شخص کی بپتا جسے اس کے دوستوں نے برباد کر ڈالا

ممبئی میں میری ایک لڑکے سے دوستی ہوئی۔

''اس کا نام ستار تھا۔ سندھ کے علاقے خیر پور میرس سے اس کا تعلق تھا۔ اس نے اپنی کہانی سنائی۔ میں اسے قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

آیئے سنتے ہیں عبدالستار کی زبانی۔

''میرا نام عبدالستار ہے۔ لوگ اور گھر والے دوست احباب پیار سے ساحل کہتے ہیں۔ میں جب پیدا ہوا تو اپنے آپ کو غریب گھرانے میں پایا۔ اللہ



کے فضل و کرم سے ضرورت کی ہر چیز مجھے مہیا تھی۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی تھے اور ایک بھائی مجھ سے چھوٹا تھا۔ ماں باپ کا سایا سر پر تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابو نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اللہ کے پاس چلے گئے۔ ہماری تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ ہم برباد ہو گئے۔ ہمارے سر کا سایا ہی اُٹھ گیا۔ چھوٹی سی عمر میں ہم باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ ایسے وقت میں بڑے بھائیوں نے گھر والی زمین فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میں چوتھی کلاس میں تھا۔ بھائیوں نے گھر والی زمین فروخت کر دی اور کراچی میں کرائے کا مکان لے لیا۔

سب بھائی صبح سویرے کام پر نکل جاتے اور میں سارا دن فارغ رہتا۔ کبھی میر پور خاص والے کزن آ جاتے اور تھوڑا ٹائم پاس ہو جاتا۔

دن گزرتے جاتے جا رہے تھے۔ میں امی کے ساتھ گھر پر ہی رہتا۔ میرے دوست واجد، وقاص اور وسیم تھے جو کراچی میں بنگلوں پر کام کرتے تھے۔ کبھی کبھار ملنے آ جاتے۔ دل بہت خوش ہو جاتا۔ ہنسی خوشی سے دن کٹ رہے تھے کہ میری معصوم سی زندگی میں دُکھوں کے یکے بعد دیگرا انبار لگنے شروع ہو گئے۔

ماجد جب بھی آتا اپنی میڈم صاحبہ کی باتیں کرتا تھا ماجد کی میڈم بہت ہی، خوش مزاج اور نیک سیرت تھیں۔ ہر وقت ماجد میڈم کی تعریفیں کرتے کرتے نہ تھکتا تھا۔ ماجد آٹھ سال کا تھا تو اس میڈم کے پاس کام بھی کرتا اور ساتھ دینی اور دنیاوی تعلیم بھی حاصل کرتا تھا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ ماجد، وقاص، وسیم سے میری ملاقات میں کمی نہ آئی۔ وقت اپنی رفتار سے سب کو دور لے جا رہا تھا۔ میری عقل میں سب دنیا داری آ گئی تھی مگر اپنی جان سے گہرے پیارے دوستوں کا پردہ نہ اٹھا سکا، ان کی اصلیت نہ جان سکا، کہ یہ میرے دوست ہیں یا دشمن یا آستین کے سانپ۔

ماجد کی میڈم کا نام کہکشاں تھا۔ میڈم کہکشاں کی بہن پروین کراچی میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ فہد جو انجینئرنگ کا کورس کر رہا تھا۔ ایک دن ماجد ملنے آیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پریشان ہو گیا کہ جانے وہ کہاں چلنے کو کہہ رہا ہے۔ وضاحت طلب کی تو کہنے لگا۔

"یار میری میڈم کی ایک اور بہن ہے، میڈم پروین جو کراچی میں رہائش پذیر ہے۔ ان کو ایک ملازم چاہیے جو چھوٹا کم سن عمر کا بچہ ہو۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے تم بہتر ہو۔ گھر میں فارغ ہی تو رہتے ہو اور وہ میڈم پروین تم کو لکھنا پڑھنا بھی سکھائیں گی۔"

میں خوش ہو گیا۔ شام کو گھر والوں سے بات کی امی اور بھائیوں نے ہاں کر دی کہ اچھا ہے اس بہانے پڑھ لکھ بھی لو گے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر لو گے۔"

اگلے دن ماجد کو کال کی اور ماجد نے کہا کہ میرے پاس آ جاؤ اس وقت ماجد اپنی میڈم کہکشاں کے ساتھ میڈم پروین کے بنگلے میں کراچی آیا ہوا تھا۔ میں بتائے ہوئے ایڈریس پر خوشی خوشی آ گیا۔ جیسے ہی گیٹ پر گیا تو سامنے ماجد کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ میڈم نے میرا نام پوچھا اور کہا کہ کل سے اپنے کپڑے اور سامان وغیرہ لے آنا۔ میں تم کو اپنے اسکول میں پڑھایا کروں گی اور سیکنڈ ٹائم تم گھر میں مالی اور چوکیدار کے ساتھ ساتھ رہنا۔" میں خاموش کھڑا رہا۔ آج تک امیر سنے تھے مگر آج دیکھ بھی لیے تھے۔

☆......☆......☆

میں سویرے سویرے اُٹھا تیاری کی اور چل پڑا۔ دو جوڑے لے کر اپنی بربادی کی طرف تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگا۔

بنگلے پر گیٹ کے سامنے چوکیدار بابا الیاس اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے انھیں ادب سے سلام کیا تو بدلے میں مجھے بزرگ کی ڈھیر ساری دعائیں ملیں۔ بابا الیاس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں بنگلے میں داخل ہو گیا۔ بہت ہی بڑا صحن تھا بنگلہ تھرڈ بلڈنگ تھا۔ خوب صورت رنگ برنگے کئی قسم کے پھول بنگلے کی چار دیواری کے ساتھ کھلکھلا رہے تھے اور صحن کے سامنے گراسی پلاٹ تھا۔ ایسا لگتا

کہ میں کسی حسین دنیا میں آ گیا ہوں۔ جو جنت سے کم نہیں ہو سکتی۔ غریبی، بھوک پیاس نے دل کے تمام ارمان خاک کر دیے تھے، جو آج بنگلے میں آتے ہی پھر سے زندہ ہو گئے۔

میڈم پروین نے مجھے اپنے پاس بٹھایا' پیار کیا اور کام سمجھایا کہ کچھ بھی نہیں کرنا بس مارکیٹ سے کچن والی ماسی کو کچن کا سودا سلف لانا ہے اور جب میں کہوں چائے بنانا ہے۔" میں سب باتیں سمجھ گیا۔

اس بنگلے میں مالی، چوکیدار بابا الیاس، کچن الی ماسی جو جھاڑو بھی دیتی تھی اور ایک کپڑے دھونے اور پریس کرنے والی ہر صبح آتی اور کام کر کے چلی جاتی۔ بنگلے میں میڈم پروین، میں، مالی چوکیدار ہی رہتے تھے۔ میرا کام صرف پڑھائی کرنا تھا۔ جو میڈم مجھ پر احسان کر رہی تھیں۔ وہ غریب لوگوں کے بچوں کو گھر میں نوکر بنا کر پڑھاتی۔ میڈم خود یونیورسٹی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھیں اور ان کا اپنا اسکول بھی تھا، چار دن میڈم حیدرآباد یونیورسٹی پڑھانے جاتی اور چار دن اپنے اسکول میں حاضری دیتی اور پڑھاتی، یوں زندگی کا گھوڑا محوِ سفر منزل کی طرف گامزن رہا۔ میرے لیے صبح سویرے قرآن کا قاری قرآن پاک پڑھانے آتا، آٹھ بجے میڈم کے ساتھ گاڑی میں میڈم کے اسکول دنیاوی تعلیم حاصل کرتا۔ اسکول میں، میں میڈم کو امی بولتا اور گھر میں بھی۔ جب اسکول گاڑی سے میڈم کے ساتھ اترتا تو سب پریشان ہو جاتے، ہر زبان پر یہی ہوتا کہ یہ لڑکا کون ہے۔ جو اسکول کی مالکن کے ساتھ گاڑی میں آتا ہے، ہر شخص مجھ پر رشک کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اچھی خاصی شکل دی تھی۔ اب میں تین سالوں میں میڈم پروین کا بیٹا بن چکا تھا۔ مڈل پاس کر چکا تھا۔ میڈم کے ساتھ، میں نے بہت عزت پائی تھی۔

میں اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ ماجد اور وسیم تقریباً ہر روز شام کو کال کرتے کبھی ملنے بھی چلے آتے۔ میں اپنی میڈم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا۔

☆......☆......☆

ایک دن عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو ماجد کی کال آ گئی۔ حال احوال پوچھا پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ماجد بولا۔

"یار اتنا عرصہ ہو گیا کوئی گرل فرینڈ بھی بنائی ہے یا ایسے ہی جھک مار رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں یار مجھے کیا پتا یہ گرل فرینڈ کیسے بنائی جاتی ہیں اور ہوتی کیسی ہیں۔" میں سیدھا سادا بندہ تھا جو ان چیزوں سے بے خبر تھا۔ پھر مجھے ماجد بتانے لگا کہ کوئی لڑکی ملے تو اسے پٹا۔ اس سے اچھی اچھی باتیں کر۔ اسے پیار کر اور مزے لوٹ۔"

اب مجھے ماجد بُرے کاموں کی دعوت دینے لگا اور بتایا کہ میں نے چار گرل فرینڈ بنائی ہوئی ہیں۔ ہر روز مجھ سے فون پر بات کرتی ہیں اور کبھی کبھار مل بھی لیتی ہیں۔ لائف انجوائے کر رہا ہوں۔"

اب میرا دماغ میں پوری طرح ماجد کی باتوں میں آنے لگا کہ واقعی ماجد کی طرح مجھے بھی کوئی گرل فرینڈ بنانی چاہیے۔

☆......☆......☆

کچن والی ماسی نے کام سے جواب دے دیا اور صبح ہوتے ہی ایک نئی کچن والی کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ میڈم کے کہنے پر جب گیٹ کھولا تو دیکھا کہ سابقہ کچن والی کے ساتھ ایک نقاب پوش لڑکی اندر داخل ہوئی اور سیدھی میڈم کے پاس چلی گئی۔ میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ لڑکی کالے برقعے میں تھی ہاتھ اور پاؤں پر لگی مہندی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میڈم نے لڑکی سے پوچھا کہ کیا نام ہے؟"

"جی میرا نام عابدہ ہے۔"

"کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں دو ماہ پہلے شادی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو کچن کا کام سنبھال لو گی۔"

"جی میڈم اچھی طرح سے سنبھال لوں گی۔ کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

میڈم نے مخلصانہ لہجے میں جواب دیا۔ "تو ٹھیک ہے تمھیں سات ہزار ہر ماہ تنخواہ ملتی رہے گی۔" میڈم نے اُسے گھر کے رولز بتائے اور کہا کہ کل آ جانا کچن

اور کچن کی صفائی اور برتن سودا سلف چیک کر لیتا۔"

"جی اچھا جی۔" میں ان دونوں کو گیٹ پر چھوڑ آیا، اور شام کو میڈم کراچی سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہونے لگیں تو کہا کہ بیٹا ستار کل عابدہ آئے گی۔ اسے سب کچھ سمجھا دینا اور اچھی طرح سے کچن کی صفائی کروانا۔"

"جی امی جان! آپ بے فکر ہو جایئے۔"

شام کو میں نے ماجد سے بات کی اور بتایا کہ ایک نئی کام والی آئی ہے۔" تو ماجد فٹ سے بولا۔

"یار تُو اسے اپنی گرل فرینڈ بنا لے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں یار اس کی دو ماہ پہلے شادی ہوئی ہے۔"

"تو کیا ہو گیا، شادی ہوئی ہے تم نے تو ٹائم پاس کرنا ہے۔ اپنے جھوٹے پیار میں پھنسا کر اپنا مطلب نکالنا ہے اور بس!"

میں ماجد کی باتوں میں آ گیا۔ جیسے وسیم اور ماجد کہتے، ویسا کرتا گیا۔

☆......☆......☆

صبح آٹھ بجے ایک خوب صورت حسن کی مالکہ گیٹ سے اندر آتے ہوئے دکھائی دی۔ میں لان میں بیٹھا ہرے بھرے پھولوں کو گھور رہا تھا۔ وہ حسن کا شاہ کار میرے قریب تر آنے لگا۔ دل میں عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ لڑکی ناگن کی طرح بل کھاتی کمر لیے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ میں بولنے کی طاقت ختم ہو چکی تھی، گویا میرے منہ میں زبان ہی نہ رہی تھی۔

"ہیلو آپ ستار ہیں۔"

"جی میں آپ کا دیوانہ ہوں۔"

یہ الفاظ جیسے ہی نکلے تو خوابوں کی دنیا سے زمین پر آن گرا۔ لڑکی چلائی تو مجھے ہوش آیا۔

"یہ کیا بکواس ہے مسٹر! آپ ہوش میں تو ہو۔"

میں بے خودی میں بہک گیا تھا۔ "سوری دراصل میں کسی اور کے خیالوں کی دنیا میں گم تھا۔ او کے۔ جی ہاں میں ہی ستار ہوں۔ اور آپ کون؟"

"جی میں میڈم کی نئی ملازمہ! کل بھی آئی تھی۔ نقاب میں تھی۔"

"اچھا تو وہ تم تھیں۔ میں نے کل آپ کو دیکھا نہیں تھا۔ آؤ تمھیں کچن دکھاتا ہوں۔"

میں عابدہ کو کچن میں لے گیا۔ کام سمجھایا اور باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد میڈم کی کال آ گئی۔ میڈم نے پوچھا۔

"ستارہ بیٹا سب کچھ ٹھیک ہے نا۔ اور عابدہ کام پر آئی ہے۔" میں نے کہا۔

"جی وہ آ گئی ہے اور کچن میں کام کر رہی ہے۔"

میں بات کرتے ہوئے کچن کی جانب چل پڑا دیکھا تو عابدہ بغیر دوپٹے کے ہانڈی بنانے میں مصروف تھی۔ میں نے فوراً میڈم کو بول دیا کہ عابدہ ننگے سر کام کر رہی ہے۔" پھر میں نے الماری سے دوپٹہ لیا اور عابدہ کو کہا۔

"محترمہ! یہ پردے دار اور عزت داروں کا بنگلہ ہے۔ یہاں پر کسی نے ننگے سر دیکھ لیا تو اسی وقت چھٹی ہو جائے گی۔ یہ لو دوپٹہ۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اُسے دوپٹہ دے دیا۔

پھر ہر روز عابدہ آتی اور اپنا کام پوری ایمان داری سے کرتی۔ جب میڈم واپس حیدرآباد سے آئیں تو عابدہ کچن میں زیادہ کام کرتی۔ اب اس سے میری فری گپ ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن میں نہا رہا تھا۔ میرا موبائل ٹیبل پر پڑا تھا جو شاید بج رہا تھا۔ مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ عابدہ نے اٹھا لیا۔ ماجد کی کال تھی۔ عابدہ نے ماجد سے علیک سلیک کی۔ ماجد نے پوچھا کہ آپ کون ہو؟

عابدہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ۔ میں ستار کی گرل فرینڈ ہوں۔" پھر عابدہ نے ماجد کو اپنا نمبر دے دیا۔ اس بات سے میں لاعلم تھا۔

شام کو جب میں نے وسیم کو کال کی تو وسیم بہت ناراض تھا۔ وجہ پوچھی تو بولا۔

"ستار تُو نے گرل فرینڈ بنائی اور مجھے اور ماجد کو بتایا تک نہیں۔" اب چونکنے کی باری میری تھی۔ میں

نے تو کوئی گرل فرینڈ نہیں بنائی پھر ان کو کیسے پتا چل گیا اور کس نے بتایا ہو گا۔ اتنے میں ماجد کی کال آ گئی اور خوب ہنس رہا تھا اور شاباشی دی۔

"واہ یار مان گئے تم کو۔ آخر تم چھپے رستم نکلے۔ بنا لی گرل فرینڈ ویری گڈ۔"

میں نے ماجد کو کہا کہ یار میرا یقین کرو میں نے کوئی گرل فرینڈ نہیں بنائی۔" تو جھٹ سے ماجد بولا تو وہ عابدہ کون ہے؟ کل میری بات ہوئی تھی عابدہ سے تیرے نمبر پر۔ عابدہ نے ریسیو کیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ میں ستار کی گرل فرینڈ ہوں۔"

میرے دل میں پیار کا رکا سمندر آہستہ آہستہ ماجد کی باتوں سے ٹھاٹیں مارنے لگا۔

عابدہ نے خود ہی میری طرف قدم بڑھایا تھا۔ عابدہ جیسے ہی کل آئی تو میں نے پوچھ لیا کہ تم نے ماجد کو کیا کہا تھا کہ تم میری گرل فرینڈ ہو۔"

تو عابدہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں ستار! میں آپ کی گرل فرینڈ مالی ہوں۔"

اور پھر وہ یکدم اداس ہو گئی۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو بولی۔ "ستار گھریلو مجبوری ہے۔ مجھے دو ہزار روپے چاہئیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ مارا اور دو ہزار کے بجائے چار ہزار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

عابدہ نے دو ہزار واپس کر دیے کہ صرف دو ہزار کی ضرورت ہے۔"

"اچھا تو اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔" ہمدردی انسانیت کا نام ہے۔ میں نے ہم دردی میں دو ہزار دے دیے۔

میں ہر روز بات ہوتی۔ وسیم اور ماجد کو ہر بات جو بھی عابدہ اور میرے درمیان ہوتی۔ کچھ دنوں بعد ماجد نے فون کیا کہ میں نے عابدہ کی نند سے دوستی کر لی ہے۔ عابدہ کی نند کا نام یاسمین تھا۔

جب میڈم حیدرآباد چلی گئیں تو ماجد حیدرآباد سے میرے پاس آ گیا، ساتھ میں وسیم بھی تھا۔ ماجد میڈم سے جھوٹ بول کر آیا تھا کہ سسرال جا رہا ہوں اور سیدھے میرے پاس آ گیا اور مجھے کہا یار میں نے یاسمین اور عابدہ سے بات کی ہے۔ یاسمین مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور ہم تینوں ان کو اس بنگلے میں لے کر آئیں گے۔" میں ماجد اور وسیم کی باتوں میں پھنس گیا اور انکار نہ کر سکا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا قیامت برپا ہو گی۔

میں نے بغیر سوچے سمجھے چوکیدار کو چھٹی دے دی، مالی کو بھی گھر بھیج دیا۔ ہم تینوں عابدہ اور یاسمین کو لینے چل پڑے۔ ہم بائیک پر تھے۔ عابدہ اور یاسمین ٹیکسی میں تھیں، ہم آگے تھے اور اُن سے کال پر بات ہو رہی تھی۔ ٹیکسی بنگلے پر رکی، ہم بھی اترے، گیٹ کھولا اور عابدہ، یاسمین جلدی سے اوپر والی منزل کی طرف چلی گئیں۔ میں نے ایک کمرے میں ماجد اور یاسمین کو بٹھایا اور دوسرے میں، میں اور عابدہ بیٹھ گئے۔ جوس اور پانی ہم نے پہلے سے لا کر الگ الگ کمروں میں رکھ دیا تھا۔ میں عابدہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو عابدہ نے کہا۔

"جلدی کرو، کام ختم کرو، جس کے دو ہزار دیے تھے مجھے۔ ایک ہزار میرا اور ایک ہزار یاسمین کا ماجد کے ساتھ۔"

یہ الفاظ عابدہ کے منہ سے سنتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے اوپر آسمان گر رہا ہو اور میں زمین کے اندر دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ زبان اور جسم میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ عابدہ بار بار کہہ رہی تھی جلدی کرو، جلدی کرو میرے پاس پیسے نہیں ہیں، آپ کو واپس دینے کے لیے۔"

میں غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جسے اچھا دوست سمجھا وہ اتنی گر سکتی ہے۔ پیسوں کے لیے اپنی عزت آبرو بھی گنوا سکتی ہے۔ میں غافل تھا دنیا کے رنگوں سے۔ میں نے دو تھپڑ عابدہ کے منہ پر رسید کیے اور کہا کہ نکل جاؤ یہاں سے! تم پیار اور دوستی کے لائق نہیں۔"

میں ماجد اور وسیم کی باتوں میں آ ضرور گیا تھا مگر اتنا بھی اندھا نہ ہوا تھا جو اچھا بُرا نہ دیکھ سکوں۔ ماجد اور یاسمین منہ کالا کر چکے تھے۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔

ماجد بولا کہ۔ یار دل خوش ہو گیا۔ تم بتاؤ۔“
میں آگ بگولا ہو گیا اور ماجد کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور دھکے مار کر بنگلے سے باہر نکال دیا۔ وسیم جو نیچے کھڑا تھا وہ بھی ماجد کی ساتھ چلا گیا۔ پھر شام کو وسیم سے بات کی اور عابدہ سے ہونے والی پوری کہانی میں نے اُسے بتا دی۔ میں ماجد سے بہت ناراض بھی ہوا مگر بعد میں ماجد سے معافی مانگی اور ہم پہلے جیسے ہو گئے مگر اب میں نے ماجد اور وسیم سے شرط رکھ لی کہ اس پاکیزہ گھر میں کوئی ایسا غلط کام نہ ہوگا، جس سے میری بدنامی ہو۔

آہستہ آہستہ میں یہ قصہ بھی بھول گیا اور کچھ دنوں بعد میں نے عابدہ کی میڈم سے شکایت لگا دی اور اُسے نوکری سے فارغ کرا دیا۔ میں نے اُس سے دل کی گہرائی سے سچی دوستی، سچا پیار کیا تھا۔ مگر عابدہ نے مجھے غلط سمجھا۔

☆......☆......☆

ہمارے بنگلے میں ایک آم کا پیڑ لگا ہوا تھا۔ اس بار اُس پر بہت پھل لگا۔ مالی اور چوکیدار کو دینے کے باوجود بھی بہت سارے آم بچ گئے۔ میں بڑی ٹرے میں آم رکھ کر اپنے بنگلے کے سامنے والے مکان میں رہنے والوں کو دینے چلا گیا۔ بیل دی تو ایک لڑکی آئی اور بولی۔ ”جی کون؟“

”جی میں سامنے والے بنگلے میں رہتا ہوں۔ یہ آم ہیں آپ لوگوں کے لیے۔“

وہ ہنس کر مڑی اور جانے لگی تو میں نے آواز دی۔

”جی ٹرے؟“ وہ لڑکی مسکراتے ہوئے پلٹی اور کہا۔

”آپ جائیے شام کو مل جائے گی۔“ میں چلا آیا۔

میں شام کو وسیم سے بات کر رہا تھا۔ اور اسے تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کی خبر دے رہا تھا کہ گیٹ کی بیل بجی۔ مغرب کا وقت تھا۔ بابا الیاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میں گیٹ پر گیا تو سامنے اُسی لڑکی کو پایا۔

”جی یہ رہی آپ کی ٹرے۔“ وہ ہنس دی۔

”جی آپ ہنسی کیوں ہیں؟“ اسے ہنستے ہوئے وجہ پوچھنے لگا۔ تو اس نے کہا۔

”بس ایسے ہی۔“ اندر چلا آیا۔ اور وسیم سے دوبارہ بات شروع کر دی۔ جو ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اُس کو بتایا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں ابھی بتایا تھا۔“

پھر نو بجے کھانے کے بعد امی کی کال آئی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ۔ ”بیٹا میڈم سے پندرہ دن کی چھٹی مانگ لو، ماموں کے گھر جانا ہے۔“

میں نے میڈم سے بات کی تو میڈم نے کہا ٹھیک ہے ماہِ رمضان کے 15 دن تم حیدرآباد رہ کر آ جاؤ اور پھر آخری پندرہ دن تم یہاں میرے پاس رہو گے۔“ میڈم مجھے اپنے بیٹے جیسا مان دیتی تھیں۔

☆......☆......☆

گھر جا کر سب دوستوں، رشتے داروں اور کزنز سے ملا، میرا ایک کزن کامران جو رینجرز میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اُس سے بھی ملاقات ہوئی۔ کامران نے مجھے اپنے ایک دوست کا نمبر دیا۔ اس کا دوست بھی کراچی میں رینجرز میں تھا۔ کامران نے کہا تھا کہ اگر کراچی میں کوئی مسئلہ ہو تو میرا نام لے کر میرے دوست سے شیئر کرنا۔ میں پندرہ دن بعد پھر کراچی آ گیا۔

شام کو افطاری تیار ہوئی تو میں نے افطاری ٹرے میں رکھی اور سامنے والے بنگلے پر دینے چلا گیا۔ بیل دینے پر وہی لڑکی سامنے آئی۔ مجھے سامنے پا کر اس نے جھٹ شکوہ کیا۔

”کہاں گم ہو گئے تھے اتنے دن سے۔“

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

”او شہزادے میں تم سے کہہ رہی ہوں۔“

میں حیرانگی سے پوچھنے لگا کہ تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“

ہاں بدھو تم سے کہہ رہی ہوں۔“

”او کے اچھا۔ میں گاؤں گیا ہوا تھا۔“

”آپ کے برتن میں خود دے جاؤں گی آپ جاؤ۔“

”اچھا اپنا نام تو بتاؤ۔“

”کیوں۔“ میں نے مذاق میں کہا۔

”ویسے ہی۔“

”اچھا پہلے تم اپنا نام بتاؤ۔“ میں نے سوال کا جواب دیے بنا اُس سے سوال کر ڈالا۔ جواب میں اس لڑکی نے اپنا نام 'جمیلہ' بتایا۔ میں اپنے بنگلے میں چلا آیا۔ کچھ دیر بعد جمیلہ خود ٹرے میں اپنی افطاری سجا کر لے آئی۔

ہر روز ہم اپنی اپنی افطاری کا تبادلہ کر کے، باقی پندرہ دنوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ جمیلہ کئی بار میرا نام پوچھتی رہی مگر میں ٹال جاتا۔ آخر ایک دن مجبوراً بتا دیا۔

اب جمیلہ اوپر کھڑکی سے سارا دن مجھے تکتی رہتی۔ میں بھی اس سے بہت فری ہونے لگا تھا۔ جب جمیلہ ایک نظر مجھے دیکھ لیتی تو اپنے آپ کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرتی۔

میں پیار بھری ایک بات کرتا تو وہ دس کرتی۔ میں شام کو ماجد اور وسیم کو ہر بات بتا دیتا وہ کہتے۔

”یار موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دو، بس اسے پٹا لو۔“ میں اب پھر سے ماجد اور وسیم کی باتوں میں آنے لگا تھا اور جمیلہ سے قریب تر ہونے لگا۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا ہم محبت کی سب حدیں پیار کرنے لگے۔

☆......☆......☆

ایک دن میں رات کے وقت جمیلہ سے مل کر گیٹ کراس کر رہا تھا جمیلہ اوپر اپنے بیڈ روم سے مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اچانک جمیلہ کے کزن نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور ایک تھپڑ رسید کیا، اور پستول نکال لی۔

”ستار آج کل تُو میری کزن سے بہت ملتا ہے۔ تُو ایک گولی کی مار بھی نہیں۔ تیری لاش کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ چھوڑ دے جمیلہ کا راستا۔“

میں نے کہا۔ ”تم نہیں جانتے میں جمیلہ سے کتنی محبت کرتا ہوں اور جمیلہ بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ جو کرنا ہے کر لینا مگر میڈم کو کچھ نہیں بتانا ورنہ بہت بُرا ہوگا۔“

یہ سب کچھ جمیلہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ اب ہم دنیا کی نظروں میں آ گئے تھے۔ نجانے کون سی قیامت برپا ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھ کیا کیا جانا تھا؟ کہیں سوسائٹی میں بدنامی نہ ہو جائے۔ میں ڈرا ہوا سا رہنے لگا کہ کہیں میڈم کو خبر نہ ہو جائے۔ ورنہ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔

رات کے آخر پہر میں نے ماجد اور وسیم کو کال کی۔ میڈم اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ میں اپنے بیڈ روم میں تھا۔ سامنے والی کھڑکی سے جمیلہ کے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب جانے کیا انجام کیا ہوگا۔ دل ڈر اور خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وسیم نے بڑی دیر بعد کال پک کی۔ اور میں نے اُسے فوراً ساری کہانی سنا ڈالی۔

☆......☆......☆

میں نے صبح ہوتے ہی لکھن عرف کامران کے دوست عبدالرحمٰن کے نمبر پر فون کیا جو کراچی میں رینجرز میں اعلیٰ عہدے پر ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ مسلسل تین چار بار لگاتار کال کی اور ڈھیر سارے میسج کیے مگر کوئی رسپانس نہ ملا۔ پھر میں عصر کی نماز پڑھنے لگا تو موبائل سائلنٹ پر لگا دیا۔ جب نماز پڑھ لی تو دیکھا عبدالرحمٰن کی دس مسڈ کال آئی ہوئی تھی۔ دوبارہ کال کی' علیک سلیک کے بعد رینجرز کے ہیڈ کوارٹر میں بہت بڑا دھماکہ ہوا کال بھی کٹ گئی۔ عبدالرحمٰن بھی اس وقت ہیڈ ایئر ڈیفنس میں تھا۔ ہیڈ کوارٹر ہمارے قریب ہی تھا۔ کچھ دنوں بعد رینجرز کے دو اہلکار بنگلے پر آئے اور مجھے دھماکے کی پوچھ تاچھ کے لیے لے گئے اور پوچھا دھماکے سے دو منٹ پہلے عبدالرحمٰن کے نمبر پر آپ کی کال آئی تھی۔ کیا کرتے ہو؟ کس گروہ سے تعلق ہے۔“

وہ سوال پر سوال کر رہے تھے اتنے میں لکھن کی کال آ گئی تو فوراً رینجرز والے نے اٹھا کر بات کی اور تفصیل بتائی تو کچھ دیر بعد مجھے عزت سے چھوڑ دیا۔

مجھے بہت افسوس ہوا عبدالرحمٰن کا۔ جو کچھ دن پہلے وطن کی عزت کے لیے شہید ہو گیا تھا۔ واپس آیا تو

میڈم نے پوچھ گچھ شروع کردی۔ ایسا لگنے لگا جیسے میڈم مجھ پر شک کرنے لگی ہیں اور مجھ پر نظر رکھنے لگی ہیں۔

فون پر زیادہ بات کرتا تو فوراً کٹ کرا دیتیں اور بہانے سے کسی کام کا بول دیتیں۔

موٹر سائیکل، عام سائیکل یوز کرنا ختم کرادیا گیا۔ جمیلہ سے فون پر بات ہوجاتی تھی۔ جمیلہ کو کہا تھا کہ میری پڑھائی نہیں ہورہی' میں کبھی بھی جاسکتا ہوں۔ مگر میرا انتظار کرنا' میں کبھی نہ کبھی آؤں گا میرا انتظار کرنا۔ شادی ہوگی تو صرف تم سے ورنہ مرجاؤں گا۔"

میں' بات وسیم اور ماجد کو بتادیتا تھا۔ اپنی سچی محبت جمیلہ کے بارے میں' میں نے انھیں بتایا ہوا تھا مگر ماجد اور وسیم کی شکل میں دو ایسے آستین کے سانپ نکلے جنھوں نے میری ہر اک خوشی اک پل میں ڈس لی۔ مجھے کسی کام کا نہ چھوڑا۔ ماجد میری میڈم کے پاس آگیا، وسیم بھی ساتھ تھا۔ میرے اسکول جانے کے بعد دونوں میڈم کو میری ہر بات بتانے لگے میڈم مجھے شک اور حقارت سے دیکھنے لگی تھیں، ماجد کا خیال تھا مجھے بے عزت کرواکے گھر سے نکلوادے گا اور اس کا گاڑی میں گھومنا پھرنا، لڑکیوں کو میڈم کی غیر موجودگی میں لے آنا آسان ہوجائے گا اور ماجد کی عزت واہمیت زیادہ ہوجائے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ جو میرے اچھے سچے بھائیوں جیسے دوست تھے کھوٹے سکے نکلے۔ میں کہکشاں میڈم کے ساتھ حیدر آباد میں تھا۔ میڈم کا فون آیا۔

"واہ بیٹا کیا عزت بنائی ہے ہماری محبت کی اور ہمارے ٹکڑوں پر پل کر کیا چاند چڑھایا ہے تم نے۔ یہ امید نہیں تھی مجھے تم سے۔" میڈم کے منہ سے یہ سب سن کر میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ میں زندہ درگور ہوتا گیا۔ آنسو کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جنھیں میں حقیقی اور سچے دوست سمجھتا تھا، انھوں نے میرے راز میڈم کے سامنے فاش کردیے تھی۔

میں میڈم سے کہتا رہا کہ امی جان بھروسہ رکھیں میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب جھوٹ بولا ہے ماجد اور وسیم نے۔ حقیقت جو ہے وہ میں بتاؤں گا۔"

میڈم نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "خبردار! جو۔ اب کبھی مجھے امی جان کہا تو۔" اور پھر کال کٹ گئی اور ماجد کی کال آگئی۔

"ہاں بچو! دیکھا اس دن کیسے تھپڑ رسید کیا تھا اور مجھے بے عزت کرکے گھر سے نکالا تھا۔ اب دیکھا انجام۔"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ کام ماجد اور وسیم کا ہی کیا دھرا ہی۔ میری دنیا اُجڑ گئی تھی۔ میں میڈم کی نظروں میں گر گیا تھا۔ میری اوقات ایک کوڑی کی بھی نہ رہی تھی۔

میں کچھ دنوں بعد میڈم کے گھر آیا۔ اس وقت میڈم حیدر آباد میں تھیں۔ ماجد اور وسیم بھی ساتھ گئے ہوئے تھے۔ بابا الیاس سے ملا، بابا الیاس نے مجھے بھاگ جانے کا کہا کہ جمیلہ کا کزن روز تجھے تلاش کرتا ہے اور کئی بار یونٹ کے آدمی پوچھ کر گئے ہیں۔ میں نے جمیلہ کو فون کیا اس وقت وہ گھر پر اکیلی تھی۔ اندر گیا وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ خوب روئی اور میں نے اُسے ڈھیروں تسلی دیں اور کہا کہ جمیلہ تم میری ہو، صرف میری۔ آج میں جارہا ہوں ہم بھاگ کر شادی کریں گے۔ میرا انتظار کرنا۔

اس کے بعد میں نے باقی سامان اٹھا کر ایک نظر بنگلے کو دیکھا اور نئے راستے پر گامزن ہوگیا۔

کچھ دن گھر رہنے کے بعد اسی فیکٹری میں آگیا اور آپ سے ملاقات ہوئی اب سمجھ نہیں آتی میں جمیلہ سے کیسے رابطہ کروں۔ ایک سال گزر گیا ہے۔ وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جمیلہ کا کزن میری موت بن گیا ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی ماردے گا۔ پھر خیال آتا ہے کہ کیا پتا اب جمیلہ بھی بدل گئی ہو۔ مجھے بھلا دیا ہو۔ ایک بیتے سپنے کی طرح جو صبح ہوتے ہی یاد نہیں رہتا۔ بھول جاتا ہے۔

ماجد اور وسیم کھوٹے سکے نکلے اور مجھے ہر طرح سے برباد کردیا۔ کروں تو کیا کروں سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔

☆☆☆

ایک تصویر، ایک کہانی

میں کس کے ہاتھ پہ.....!



مادہ ہرن اپنی زندگی میں صرف ایک بار تولد کے عمل سے گزرتی ہے۔ خدا کی قدرت سے ان کی نسل چل رہی ہے۔ ہرن کے پیدا ہونے والے بچے بہت انمول ہوتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا؟ ایک بے رحم شکاری نے شکار کرتے ہوئے تاک کر گابھن ہرن کا نشانہ لیا اور..... گزشتہ دنوں بلوچستان کے ایک علاقے میں یہ کارنامہ سرانجام دیا گیا۔ جس پر انسانیت سر نیہوڑائے پڑی ہے۔



ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 17

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس

کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک ولا ور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آ جاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

ان لوگوں کی تعداد دیکھ کر دل پر خوف و دہشت طاری ہو رہی تھی، پھر کشتی ان لوگوں کے بالکل قریب پہنچ گئی اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، قبائلیوں نے کشتی والوں پر نیزوں کی بارش شروع کر دی۔ بے شمار نیزے کشتی کے اوپر گرے اور بے شمار کشتی میں سوار لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ شکر ہے کہ کوئی نیزہ کارگر نہیں ہوا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ کشتی میں جھکے ہوئے رائفلیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ مسٹر گرج نے کہا۔

”میں بلاوجہ ان لوگوں کا قتل عام نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ یہ وحشی اور جنگلی ہیں اور اپنی عادت کے مطابق عمل کر رہے ہیں، پہلے ہوائی فائرنگ کر کے دیکھو، اگر ان کا زور ٹوٹ جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ مجبوراً ہمیں ان کے نشانے لینا ہوں گے۔“

اس دوران وحشی جوش کے عالم میں دریا میں کود پڑے اور پانی کے بہاؤ پر تیز رفتاری سے کشتی کی جانب آنے لگے، شاہ زیب اور مسٹر گرج نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تو دھماکے سنتے ہی ساحل پر کھڑے لوگ واپس بھاگ نکلے۔ جو پانی میں اترے تھے اپنی جگہ رک گئے اور پھر کناروں کی جانب تیرنے لگے، یہ لوگ مسلسل ہوائی فائرنگ کرتے رہے، چند ہی لمحات کے بعد ان کا نام و نشان بھی غائب ہو گیا۔ مسٹر گرج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، انہوں نے گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے ہمیں ان کی زندگیاں نہ لینا پڑیں۔“

بہر طور یہ لوگ ان وحشیوں کے چنگل سے نکل آئے اور اس کے بعد کافی حد تک پرسکون ہو گئے تھے۔ کشتی اب اس علاقے سے بہت دور نکل آئی تھی اور جوں جوں یہ لوگ آگے بڑھتے جا رہے تھے دریا کا پاٹ چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور بہاؤ میں بھی سست رفتاری آتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ کشتی بالکل سست ہو گئی اور چپو سنبھالنے پڑ گئے، ایک چھوٹا سا ٹیلہ نما جزیرہ اس طرح سامنے آ رہا تھا جیسے اس نے دریا کا راستہ روک لیا ہو۔ شاہ زیب نے حیرت سے مسٹر گرج کی طرف دیکھا تو مسٹر گرج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس ٹیلے کے دوسری جانب قبیلہ اشتالا آباد ہے۔“

”لیکن مسٹر گرج کیا یہ ٹیلہ دریا کا راستہ روک لیتا ہے؟“

”نہیں... یہاں سے دریا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آگے چل کر یکجا نہیں ہوتا بلکہ دو مختلف سمتوں میں نکل جاتا ہے، ہمیں بائیں سمت چلنا ہے اور جونہی ہم ٹیلے کے دوسری طرف پہنچیں گے، اشتالا کی سرزمین شروع ہو جائے گی۔“

شاہ زیب کا منہ حیرت سے کھل گیا، اس نے ایک عجیب سی سنسنی محسوس کی تھی، بہر حال مسٹر گرج کی ہدایت کے مطابق کشتی کو ٹیلے کے پاس سے بائیں سمت کاٹ لیا گیا اور یہ لوگ اسے کھینچتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی

کنارے سے جا لگی تھی، یہاں اسے خشکی پر کھینچ لیا گیا اور پھر نیچے اتر کر پیدل چلنے لگے۔ مسٹر گرج ہر چیز کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شوراک اور سونارا ابھی خاموش تھیں، دونوں کمال کی لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک بھی بولنا نہیں جانتی تھی۔ مسٹر گرج چند لمحات حالات کا جائزہ لیتے رہے پھر بولے۔

”کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں یہاں، پہلے دریا کے اس کنارے پر آبادی تھی لیکن اب یہ آبادی ویران پڑی ہے پتا نہیں کیوں؟“

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ صحرائے اعظم کا یہ علاقہ بھی دوسرے علاقوں سے مختلف نہیں تھا، اجاڑ ویران میدان اور ان کے اختتام پر کہر سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، سرمئی دھند لکے، دھواں دھواں سا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، مسٹر گرج کسی قدر الجھا ہوا نظر آ رہا تھا اور یہ لوگ اس میدان میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

پھر دفعتاً ہی کچھ ہوا، زمین نے اچانک انسان اگلنا شروع کر دیے تھے اور یہ سارے کے سارے وحشی انسان تھے، گہرے سیاہ رنگوں کے مالک اور افریقہ کی روایت کے مطابق ان کے چہرے انتہائی خوفناک تھے اور وہ جانوروں کی کھالوں سے اپنے بدن ڈھکے ہوئے تھے، ان کی آنکھیں سفید تھیں لیکن ان میں دوستی کا انداز نہیں تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اچانک ہی زمین سے نکلے تھے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، انہوں نے اپنے نیزے سیدھے کر لیے اور شاہ زیب وغیرہ کو گھورتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے، پھر انہوں نے شاہ زیب وغیرہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس کے بعد ان میں سے ایک نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مسٹر گرج آہستہ سے بولا۔

”کوئی تعرض نہ کرنا آگے بڑھتے رہو، یہاں کی تبدیلیاں میرے لیے حیرت انگیز ہیں، لیکن فکرمندی کی بات نہیں۔ آگے چل کر جب ہم شیکال کے پاس پہنچیں گے تو ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔“ مسٹر گرج کے یہ الفاظ کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے، شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود اس کا ذہن بھی اس سلسلے میں صاف ہے یا نہیں، کیا اس کی مرضی کے مطابق معاملہ نہیں ہوا ہے۔ پھر یہ لوگ آگے بڑھتے رہے اور پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ اس پہاڑ کے دوسری جانب ایک بہت وسیع میدان میں جھونپڑوں کا شہر آباد تھا، مقامی باشندے نیزے ہاتھوں میں تھامے ان جھونپڑوں کے درمیان چل پھر رہے تھے۔ ان لوگوں کو بھی ایک جھونپڑی کے درمیان لے جایا گیا جس کے اطراف احاطہ بنا ہوا تھا اور پھر ان چاروں کو اسی احاطے میں دھکیل دیا گیا۔ احاطے کی دیواریں کچی مٹی اور چھت گھاس پھونس سے بنی ہوئی تھیں۔

احاطے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا جو گھاس پھونس کا بنا ہوا لیکن بہت مضبوط تھا، یہ لوگ پریشانی سے اُدھر اُدھر دیکھنے لگے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، شاہ زیب نے مسٹر گرج سے کہا۔

”ان کا رویہ تو اچھا نہیں ہے۔“

”ظاہر ہے بیرونی لوگوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ہو گا، البتہ ان میں سے کوئی نہیں جانتا ہو گا کہ لوگ ہیں کیا چیز...“

”وہ لوگ یہ بات کیسے مانیں گے؟“

”میں کسی ایسی شناسا شکل کا منتظر ہوں جس سے میں میسی سوناٹا کے لیے پیغام بھیج سکوں۔“

شاہ زیب خاموش ہو کر مسٹر گرج کی صورت دیکھنے لگا، نجانے کیوں اس کا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ بہتر نہیں ہے اور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے، ایک اور خیال بھی شاہ زیب کے ذہن میں آیا تھا۔ مسٹر گرج کے بیان کے مطابق میسی سوناٹا زندہ ہو گی اور کیا وہ اپنی بیٹی کو پہچان کر سارے حالات درست کر دے گی ہو سکتا ہے کہ میسی سوناٹا زندہ نہ ہو اور اب یہاں شوراک کی ضرورت ہی نہ محسوس کی جاتی رہی ہو، شاہ زیب نے یہی سوال مسٹر گرج سے کر ڈالا۔

”اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“ مسٹر گرج تشویش سے بولے۔

شاہ زیب کا دل چاہا کہ مسٹر گرج کا جبڑا توڑ دے، جب یہ امکانات تھے تو اس نے یہ احمقانہ حرکت کیوں کی تھی، لیکن پھر اسے مسٹر گرج کے کہے کچھ اور الفاظ بھی یاد آئے، ظاہر ہے وہ اپنی مرضی سے ان علاقوں میں نہیں آئے تھے، بے شک اس نے اس سلسلے میں کاروائی کی تھی، لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ سب کچھ مسٹر گرج کی مرضی کے مطابق ہی ہو جائے، بہر طور اب جو کچھ ہوگا وہ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔

پورا دن گزر چکا تھا اور رات کی تاریکی فضاؤں پر مسلط ہوتی جا رہی تھی، ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا، شاہ زیب کھردری زمین پر لیٹ گیا تھا، دماغ اور بدن چیخ رہے تھے، نجانے کب نیند آ گئی تھی، غالباً صبح ہونے والی تھی۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی تھی، چاروں طرف مکمل خاموشی طاری تھی۔

شاہ زیب نے اٹھ کر اُدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو قرب و جوار کے مناظر نگاہوں میں واضح ہونے لگے۔ شاہ زیب نے ایک گوشے میں سونارا کو دیکھا جو احاطے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی، لیکن شوراک اور مسٹر گرج موجود نہیں تھے۔ پورے احاطے میں نگاہیں دوڑانے کے باوجود وہ دونوں نظر نہیں آئے اور شاہ زیب کے انداز میں کسی قدر حیرانی پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ بات اتنی اہم بھی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے مسٹر گرج اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے چلا گیا ہو۔ شوراک کی غیر موجودگی بھی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس نے کسی سے رابطہ قائم کر لیا ہے، لیکن سونارا کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ شاہ زیب کو دیکھ کر اس نے ہونٹ کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئی، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''تمہاری ذہنی قوتیں اب بھی واپس آئیں یا نہیں۔'' شاہ زیب نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا اس نے شاہ زیب کو دیکھا اور خاموش رہی۔ شاہ زیب نے پھر کہا۔

''گونگی لڑکیوں کو دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کہ ان کی گردن دبا دوں۔''

سونارا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا تھا۔

''اے اے میڈم سونارا، اب کہیں آپ رونا نہ شروع کر دیں، خدا کے لیے میرے گناہوں کو معاف کر دیا جائے اور اگر آپ نے رونا دھونا شروع کر دیا تو درحقیقت میں خودکشی کے امکانات پر غور کروں گا۔''

سونارا بدستور چہرہ چھپائے بیٹھی رہی، شاہ زیب جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں بولے گی، بہر طور مسٹر گرج کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے دوپہر ہو گئی، ویسے مہذب دنیا کے لوگ ہوں یا غیر مہذب سرزمین کے باشندے، تھوڑی سی اخلاقیات سب میں ہوتی ہیں اور یہ لوگ بھی اخلاق سے عاری نہیں تھے، غالباً بیس گھنٹے کے فاقے کے بعد انہیں کھانا فراہم کرنے کا خیال آیا تھا، چنانچہ چند مقامی افراد کھانے پینے کی اشیاء ان کے پاس رکھ کر چلے گئے، وہی دودھ پھل وغیرہ تھے جنہیں زہر مار کرنا پڑا۔ سونارا نے البتہ کچھ نہیں کھایا تھا، اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

البتہ شاہ زیب نے یہاں ملائمت سے کام لیا، جھلاہٹ اپنی جگہ لیکن سونارا کا کچھ نہ کچھ کھانا ضروری تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔

''سونارا، اگر تم مسٹر گرج کے لیے پریشان ہو تو میرا خیال ہے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ تمہیں یہاں آنے کا مقصد معلوم ہی ہے، یقینی طور پر مسٹر گرج ان لوگوں سے گفت و شنید کرنے گئے ہوں گے اور اب وہ اس قبیلے کی بیٹی کو ان کے حوالے کر دیں گے اور ہمیں یہاں بہترین مراعات حاصل ہو جائیں گی، شوراک کی مکمل حقیقت کم از کم تمہیں تو معلوم ہوگی، یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

سونارا نے کوئی جواب نہیں دیا بہر طور شاہ زیب اسے دودھ پلانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر شام ہو گئی، رات کے کھانے کی شاید ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی، اچھا انداز تھا ان لوگوں کا، کم از کم ڈائٹنگ ہو رہی تھی، حالانکہ ان کے لیے اس کی گنجائش نہیں تھی، طویل عرصہ ہو گیا تھا کوئی ڈھنگ کی چیز کھائے ہوئے، لیکن مجبوری کا نام صبر ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

رات گزر گئی۔ پھر دوسرا دن البتہ اس دن صبح کو پھر کھانے پینے کی اشیاء پہنچا دی گئی تھیں اور اس کے بعد رات ہی کو خبر لی گئی۔ کھانے میں یہ بے ترتیبی نوٹ کر لی گئی تھی، چنانچہ اب کوئی چیز واپس نہیں کی جاتی تھی، جتنی کھائی کھائی باقی سنبھال کر رکھ لی، البتہ مسٹر گرج کی مسلسل غیر موجودگی سے اب تشویش ہونے لگی تھی۔ شوراک کا بھی کوئی پتا نہیں تھا، یہ صورت حال بھی انتہائی پریشان کن تھی، اگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو مسٹر گرج کی بیٹی اور شاہ زیب کا کیا بنے گا۔ شاہ زیب انہی سوچوں میں گم رہا تھا۔

اسی طرح چوتھا اور پانچواں دن بھی گزر گیا، اب سونارا پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ وہ عموماً احاطے کے چکر لگاتی رہتی تھی، رات کو بھی شاہ زیب نے اسے سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن احاطے کی زندگی شاہ زیب کے لیے بری نہیں تھی، تھوڑی سی بھاگ دوڑ اسی احاطے میں کر لیتا تھا جو جسمانی ورزش کے لیے کافی تھی۔ اس وقت بھی رات ہو گئی تھی اور چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ سونارا ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھی اور شاہ زیب اس سے کچھ فاصلے پر زمین پر لیٹا ہوا تھا، وہ دیر تک مسٹر گرج کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور پھر اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاہ زیب کو اپنے چہرے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا اور شاہ زیب نے ایک دم اس کی کلائی پکڑ لی، سونارا کی کلائی تھی، اس نے آہستگی سے کلائی چھوڑ دی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''کوئی بات ہے سونارا؟''

''ہاں۔'' اس کی آواز سنائی دی اور شاہ زیب ایک دم اچھل پڑا۔ یہ آواز سونارا کے منہ ہی سے نکلی تھی اور لہجہ انتہائی نغمہ بار تھا، اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آئی، کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ شاہ زیب ششدر ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''سونارا... یہ تم بول رہی ہو، کیا میں اپنے کانوں پر یقین کر لوں کہ یہ تم ہی بول رہی ہو؟''

''ہاں اٹھو شاہ زیب اٹھ جاؤ۔'' سونارا نے کہا مگر شاہ زیب تو پہلے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ میری پریشانیاں اب عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ اب ہمیں بیوقوفوں کی طرح انتظار نہیں کرنا چاہیے شاہ زیب۔''

''خدا کی پناہ اس خوبصورت آواز اور اس شستہ لہجے کو اب تک کیوں حلق میں دبا رکھا تھا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟''

''براہ کرم طنز کی گفتگو مت کرو، اب تمہارے سوا میرا کوئی ساتھی نہیں رہ گیا ہے۔''

''یقین کرو سونارا، تمہیں بولتے دیکھ کر مجھے اتنی حیرت ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے''

''میں بول رہی ہوں اور بول سکتی ہوں، مگر میں جان بوجھ کر خاموش تھی، براہ کرم اتنا جاننے کے بعد اس بارے میں مزید سوالات مت کرو، اب یہ سوچو کہ ہم مسٹر گرج کی تلاش میں کیا اقدامات کر سکتے ہیں۔''

''یقیناً کچھ نہ کچھ کریں گے اور اگر تم یہ بتا دو کہ تم نے اب تک خاموشی کیوں اختیار کر رکھی تھی تو میری تمام الجھنیں رفع ہو جائیں گی اور میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکوں گا، اس کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''شاہ زیب میرا نام سونارا نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا

''خوب پھر غالباً قلوپطرہ ہوگا۔''

''نہیں میرا نام شوراک ہے۔''

''کیا؟'' شاہ زیب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں میرا نام شوراک ہے اور میں اسی علاقے کی بیٹی ہوں۔''

شاہ زیب کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

''میری کہانی تم سن ہی چکے ہو، انکل گرج مجھے یہاں سے لے گئے اور اس کے بعد انہوں نے میری پرورش

کی، لیکن انہیں غالباً یہ اندازہ شروع ہی سے ہو چکا تھا کہ دوسرے لوگ خزانے کے حصول کے لیے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور ایسی صورت میں مجھے نقصان پہنچ سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا ایثار کیا۔ وہ بہت عظیم انسان ہیں۔ تم ان کی ذہنی عظمت کا تصور تک نہیں کر سکتے شاہ زیب۔''

''آہ واقعی، واقعی میں شدید حیرت کا شکار ہوں۔''

''ان حالات میں ہونا ہی چاہیے، بہرحال انکل گرج نے یہ محسوس کر کے کہ میں خطروں میں گھری ہوئی ہوں، انہوں نے اپنی بیٹی کو شوراک کی حیثیت دے دی اور جاننے والے اسے شوراک کے نام سے جاننے لگے جبکہ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کا روپ دے دیا۔''

''ویری گڈ۔'' شاہ زیب نے دلچسپی سے کہا۔

''اس کے لیے انتہائی بہترین بندوبست کیا گیا، انکل گرج نے ایک لمبی پلاننگ کی تھی وہ مجھے سونارا کی حیثیت سے معمولی انداز میں پرورش کر رہے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ میسی سوناٹا اور شیکال کے خزانے سے دلچسپی رکھنے والے مجھ سے دور ہی رہیں۔ وہ سونارا کی طرف متوجہ رہیں جو شوراک بنی ہوئی تھی اور میری زندگی کو کوئی نقصان نہ پہنچے پائے۔ اس کے لیے سونارا کو بہترین تربیت دی گئی۔ وہ جسمانی طور پر بھی بہت ہی اعلیٰ قسم کی لڑکی تھی اور یہی کیفیت اس کی ماں کی بھی تھی جو مسٹر گرج کی بیوی تھیں اور جن کا انتقال ہو گیا تھا۔ سونارا آتش فشاں بن گئی، اس کا ہر فن میں طاق ہونا اس کے لیے انتہائی کارآمد رہا اور انکل گرج اس کے ذریعے اپنا کھیل کھیلتے رہے۔ پھر اسٹون برادرز کا معاملہ سامنے آیا اور انکل گرج کے تمام خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ انہوں نے سونارا کو شوراک کی حیثیت سے فرار کرا دیا اور اس علاقے کا آدھا نقشہ اس کے پاس محفوظ کرا دیا تاکہ یہ لوگ اس کے پیچھے لگے رہیں اس کے بعد کی کہانی تمہیں معلوم ہے۔ اسٹون برادرز کا پورا گروہ اسے شوراک سمجھ کر اس کے پیچھے لگا رہا، لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئی۔ جبکہ میں انکل گرج کے ساتھ ہی رہی۔ اسی طرح یہاں تک کا سفر کیا گیا۔''

''بہت دلچسپ۔'' شاہ زیب نے اسی انداز میں کہا اور شوراک گھور کر اسے دیکھنے لگی، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''انکل گرج نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو میری وجہ سے موت کے داؤ پر لگا دیا تھا اور سونارا میری حیثیت سے جنگلوں میں بھٹکتی پھری، یہ معمولی کام نہیں تھا شاہ زیب۔ میری زبان اس لیے بند کر دی گئی تھی کہ بہرطور میں ایک لڑکی ہوں، کسی بھی مرحلے پر میری زبان سے ایسا کوئی جملہ نکل جائے جو دوسروں کو میرے بارے میں مشکوک کر دے یہ بھی ایک بہت طویل معاہدہ تھا جو مجھے کرنا پڑا اور اب انکل گرج سونارا کو شوراک کی حیثیت سے باہر لے گئے ہیں کہ کسی بااختیار شخصیت کو شوراک کے بارے میں تفصیلات بتا دیں، انہوں نے اس وقت بھی رسک نہیں لیا کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ آہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ کسی مشکل کا شکار ہو گئے ہیں، ورنہ اتنا عرصہ وہ مجھے نظرانداز نہ کرتے، مسٹر شاہ زیب کچھ کرو، ورنہ ہم یہیں گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔''

شاہ زیب یہ دلچسپ اور عجیب و غریب کہانی سن رہا تھا، واقعی اس سلسلے میں مسٹر گرج نے بڑی عظمت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن اس وقت شاہ زیب بھی کیا کر سکتا تھا، اس نے شوراک سے پوچھا۔

''لیکن میڈم، ایک بات بتائیں گی آپ مجھے؟''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا مسٹر گرج کی بیٹی سونارا جو شوراک بنی ہوئی تھی گونگی تھی؟''

''نہیں اس نے اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی ہے، لیکن شوراک بننے کے لیے اسے بھی اپنی زبان بند رکھنی پڑی تھی۔''

شاہ زیب نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، تو وہ لڑکی جس نے اپنا سب کچھ شاہ زیب کو سونپ دیا تھا اور اس سے بے پناہ اپنائیت کا اظہار کرتی تھی گونگی نہیں تھی، اس نے جان بوجھ کر اپنی زبان بند رکھی تھی۔ نجانے کیوں وہ

اس لڑکی کی طرف سے کچھ بددل سا ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ اس کہانی کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

''مگر شوراک اب کیا کیا جائے، یہ بتاؤ۔''

شوراک اس کے سوال پر دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر اس نے کہا۔

''کسی طرح یہاں سے نکل کر یہ معلوم کرنا ہوگا کہ انکل گرج ابھی تک کامیاب کیوں نہیں ہو سکے۔ کیا میری ماں زندہ نہیں ہے، کیا میرا باپ موجود نہیں ہے یہاں۔ یہ ساری باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی ہیں۔ بہت عرصہ گزر گیا مسٹر شاہ زیب، بہت طویل عرصہ گزر گیا ہے، یہاں کچھ تبدیلیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ کہیں یہ تبدیلیاں انکل گرج کے لیے مصیبت کا باعث تو نہیں بن گئیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر فرض کرو، تمہاری ماں میسی سوناٹا زندہ ہے۔ تمہارا باپ بھی موجود ہے، تو ہمارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم شوراک ہو۔''

''اوہ یہ بہت آسان بات ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میں سو فیصد اپنی ماں کی ہم شکل ہوں۔ اس کے علاوہ میری پشت پر قبیلے کا نشان موجود ہے جبکہ سورانا کی پشت پر وہ نشان نہیں ہے۔ اگر میری ماں مجھے دیکھ لے گی تو فوراً پہچان لے گی، یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے، اصل کام یہ ہے کہ ہم پتا لگائیں کہ یہاں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور انکل گرج کہاں غائب ہو گئے ہیں؟''

''فرض کرو اگر مسٹر گرج ہمارے یہاں سے نکلنے کے بعد یہاں پہنچے تو پھر کیا ہوگا؟''

''اگر وہ میری ماں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اب تک بہت کچھ ہو چکا ہوتا۔ یقینی طور پر کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور اب ہمیں ہر قیمت پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر میں کسی طرح اپنی ماں تک پہنچ گئی پھر ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی اور ہم انکل گرج کو بھی تلاش کر لیں گے۔''

''لیکن یہاں سے کیسے نکلیں گے، آخر میں کیسے اس میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔''

''تم کیسے مرد ہو شاہ زیب۔ مرد تو بہت کچھ کر دکھاتے ہیں۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر مجھے مجبوراً میدان عمل میں اترنا پڑے گا، انکل گرج نے جس طرح میری حفاظت کی ہے میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ ورنہ میں بھی بزدل نہیں ہوں اور بہت کچھ کر سکتی ہوں۔''

''خدا کے لیے فوراً ہی کوئی قدم اٹھا کر اپنی اور میری زندگی خطرے میں نہ ڈال دینا، تھوڑا سا صبر کر لو، ہو سکتا ہے مجھے کچھ سوچنے کا موقع مل جائے۔''

شوراک خاموش ہو گئی، لیکن شاہ زیب کا سر چکرانے لگا تھا، یہ حقیقت تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اب تک جو لڑکی شوراک کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہی ہے وہ درحقیقت مسٹر گرج کی بیٹی سونارا ہے، جبکہ یہ لڑکی اصل شوراک ہے۔

سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں لڑکیاں اچھی طرح بول سکتی تھیں، لیکن دونوں ہی نے اتنی طویل خاموشی قائم رکھی تھی۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ اگر واقعی شوراک کے بیان کے مطابق مسٹر گرج کسی مشکل کا شکار ہو گئے ہیں تو یہ مشکل شاہ زیب اور شوراک تک پہنچنے میں کتنا وقت لگائے گی۔ باہر کی آوازیں مسلسل محسوس کی جا سکتی تھیں۔ جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ شاہ زیب وغیرہ کی نگرانی سے غافل نہیں ہیں۔

☆......☆......☆

رات گزر گئی، صبح کو پھر ناشتا آ گیا تھا، شاہ زیب نے آہستہ سے شوراک سے کہا۔

''شوراک ناشتا کر لو یہ ہماری جسمانی بقاء کے لیے ضروری ہے۔''

''تم ناشتے کی بات کرتے ہو میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں، اگر آج تم نے کچھ نہ کیا تو پھر یہ بات ذہن نشین

کرلو کہ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا میں کروں گی، میں اب انکل کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کوئی بے نتیجہ کارروائی کرنے سے کیا حاصل، ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

"میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں اب زائل ہوتی جا رہی ہیں۔"

"خدا کے لیے انہیں سنبھالو تم، میرا مطلب ہے پتا نہیں تمہارا مذہب کیا ہے، لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو حواس میں رکھو۔ کچھ سوچتے ہیں فوراً ہی کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں ہے۔"

شوراک خاموش ہو گئی تھی۔ البتہ اس کے بعد اس نے پورا دن شاہ زیب سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

پورا دن گزر گیا، پھر رات آ گئی، اس کے بعد شوراک نے اور کوئی گفتگو نہیں کی تھی، رات کا کھانا البتہ اس نے پیٹ بھر کر کھا لیا اور شاہ زیب کو اس بات پر حیرت بھی ہوئی، اب وہ کسی قدر پرسکون نظر آ رہی تھی۔

کہیں اس سکون کی آڑ میں کوئی طوفان تو کروٹیں نہیں بدل رہا، پھر اس وقت اندازے کے مطابق رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا جب شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا، وہ یہ جائزہ لینا چاہتا تھا کہ باہر کی کیا کیفیت ہے۔ اگر یہاں سے فرار کی کوشش کی جائے تو اس میں کامیابی کے کس حد تک امکانات ہیں۔

اس نے احاطے کا ایک چکر لگایا اور پھر دروازے تک پہنچ گیا، اس نے دروازے کو ہلا جلا کر دیکھا، پھر اسے کھولنے کی کوشش کی، ہلکی ہلکی آوازیں پیدا ہوئی تھیں، لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا۔ شاہ زیب چند لمحات انتظار کرتا رہا، اس کے بعد اس نے پھر دروازہ کھولا تو وہ فوراً ہی کھل گیا اور شاہ زیب جھونک میں باہر نکل آیا، اس کا سر پتھریلی چٹان سے ٹکرایا تھا اور سر کے سامنے تارے ناچ گئے۔ ایک لمحے کے لیے میں چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ کوئی چیز ہاتھ آ گئی، پتلا سا ڈنڈا تھا جسے سنبھال کر اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بچایا تھا، لیکن نجانے کیا ہوا، ڈنڈے کے ساتھ ساتھ ہی کوئی اندر آیا اور دھپ سے زمین پر گر پڑا، شاہ زیب نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر شاہ زیب نے اس ڈنڈے کو ٹٹول کر دیکھا جو اب اس کے ہاتھ میں بے وزن تھا، اوپری سرے پر ہاتھ لگایا تو محسوس ہوا کہ نوکدار نیزہ ہے، شاہ زیب نے گھبرا کر نیزے کو پوری قوت سے دروازے سے باہر اچھال دیا اور دوسرے لمحے اسے ایک کراہ سنائی دی، کراہ بھی تعجب خیز تھی۔ شاہ زیب چند سیکنڈ احمقوں کی طرح کھڑا رہا اور پھر اسے عقب سے شوراک کی آواز سنائی دی

"باہر نکلو، میں نے اس کی گردن دبا دی ہے۔"

"کک.. کس کی؟"

"جسے تم نے اندر کھینچا تھا۔"

"مم میں نے.." شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر نیچے بیٹھ کر اس شے کو ٹٹولنے لگا جو اندر آ کر دھپ سے گری تھی، کوئی انسان ہی تھا اس کے حلق سے پھر ایک آواز نکل گئی۔

"ارے باپ رے" اور پھر اسے صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہوا، اس کی آہٹ سن کر باہر موجود کسی وحشی پہرے دار نے دروازہ کھولا تھا اور شاہ زیب اسی جھونک میں باہر نکلتا چلا گیا تھا اور پھر شاہ زیب کا سر اس سے ٹکرایا تھا، اس نے سنبھلنے کے لیے اس وحشی کا نیزہ پکڑ کر کھینچا جس سے وہ اندر آ گرا۔ پیچھے سے شوراک نے اس پر قابو پا لیا، شوراک نے اس دوران شاہ زیب کو پھر احاطے کے دروازے سے باہر دھکیلا تھا اور شاہ زیب پھر کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔ جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ بھی ایک انسانی بدن ہے۔ باہر نسبتاً کچھ روشنی تھی جو ان روشن مشعلوں کی تھی جو آس پاس کے خیموں پر نصب تھیں۔

شاہ زیب نے ان روشنیوں میں اس بدن کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ وہ انسانی بدن بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے، اس کی گردن میں ایک نیزہ ترازو تھا۔ شاہ زیب کو یہ اندازہ لگانے میں وقت نہیں ہوئی کہ اس کا پھینکا ہوا نیزہ تھا جو باہر کھڑے اس پہرے دار کی گردن میں ترازو ہو گیا تھا۔ بہرحال قدرت شاید مدد کر رہی تھی۔ پھر شوراک نے اس کا

بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"اب چلو! یہاں کیوں رکے ہوئے ہو، اگر دوسرے لوگ آ گئے تو ہم دونوں مارے جائیں گے"

ان الفاظ کے ساتھ ہی جیسے شاہ زیب کے بدن میں بجلیاں بھر گئیں اور وہ پوری قوت سے ایک جانب بھاگا، شوراک بھی اس کے ساتھ تھی۔ غالباً دوسرے لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح بھاگ نکلیں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں جنگل میں پہنچ گئے۔ جنگل میں بھی اندھا دھند بھاگتے ہوئے کافی دیر گزر گئی اور پھر جب سورج کی روشنی پھوٹی تو یہ لوگ ایک چٹانی علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ لیکن دوڑنے سے ان کے بدن تھک کر چور ہو گئے تھے۔ پھر وہ چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگے، تب شوراک نے کہا۔

"ہمیں اس سے زیادہ دور نہیں نہیں نکلنا چاہیے، اگر انہیں ہمارے فرار کا علم ہو گیا تو وہ ہمیں تلاش کریں گے، لیکن ان کے قریب پہنچنے سے پہلے بہتر ہے کوئی ایسی جگہ دریافت کر لی جائے جہاں ہم پوشیدہ ہو جائیں، اگر ہم ان سے بہت دور نکل گئے تو پھر صورت حال معلوم کرنے میں بہت دقت ہو گی۔"

پھر یہ لوگ کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں پوشیدہ ہوا جا سکے، علاقہ بہت خوبصورت تھے ہر جگہ سبزہ اگا ہوا تھا۔ پھر ایک سبزے سے گھری ہوئی چٹان کے نیچے ایک سوراخ نظر آیا اور یہ لوگ تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئے، چند ہی لمحات کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ سوراخ کے دوسری جانب کوئی کشادہ غار ہے، چنانچہ یہ اندازہ لگائے بغیر کہ اس غار میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے دونوں اس غار میں داخل ہو گئے۔ غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور انہیں تھوڑا سا نیچے کودنا پڑا تھا، لیکن یہاں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی، کوئی ایسا رخنہ نظر نہیں آیا تھا جس سے روشنی اندر آ سکتی، چند لمحات دونوں وہیں کھڑے ہو کر تاریکی میں آنکھیں پھاڑتے رہے۔

"اوہ ادھر دیکھو، شاید وہ کوئی سرنگ ہے۔" شوراک نے کہا

شاہ زیب نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ دیں، شروع میں تو کوئی اندازہ نہ ہوا لیکن چند لمحات کے بعد جب آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو اس نے بھی اس سیاہ دھبے کو دیکھ لیا جو غار کے آخری سرے پر تھا۔ یقیناً وہ کوئی سرنگ تھی جس میں بمشکل کھڑا ہوا جا سکتا تھا اور اگر اس میں کہیں کوئی پتھر ابھرا ہوتا تو سر کے ٹکڑے بھی اڑ سکتے تھے، چنانچہ ان دونوں نے ہاتھ اوپر کر لیے تاکہ چھت کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ سکیں۔ سرنگ کافی لمبی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس میں گھٹن نہیں تھی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد یہ دونوں رک گئے۔

"کیا خیال ہے آگے بڑھتے رہیں؟" شوراک نے کہا۔

"اور اطمینان کے ساتھ تحت الثریٰ میں جا پڑیں۔" شاہ زیب نے جواب دیا۔

"اوہ تم تو بلاوجہ بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہو، حالانکہ تم اتنے بزدل نہیں ہو۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"یہی کہ تم بزدل نہیں ہو، تم نے کس دلیری سے ان دونوں کو قتل کر دیا۔"

"ارے خدا سے ڈرو، وہ تو کمبخت خود ہی قتل ہو گئے، میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔" شاہ زیب نے دانت پیستے ہوئے کہا اور شوراک ہنسنے لگی۔

"خود قتل ہونے کی بھی خوب رہی، کیا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے وہ نیزے اپنے بدن میں اتار لیے تھے۔"

"بس کیا بتاؤں کیا ہوا تھا؟" اس کے بعد شاہ زیب نے ساری کارروائی شوراک کو بتائی اور وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"تم واقعی بہت دلچسپ انسان ہو شاہ زیب، مگر میں ایسی مصیبتوں میں گرفتار ہوں کہ تمہاری شخصیت سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتی، آؤ اس سرنگ کو آگے تک دیکھیں۔"

وہ دونوں پھر آگے بڑھنے لگے، تنگ و تاریک سرنگ شیطان کی آنت کی مانند لمبی تھی۔ ویسے تاریکی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی وجہ سے ان کی رفتار بہت سست تھی، بعض جگہ سرنگ کچھ نیچی بھی ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے

انہیں جھک کر سفر کرنا پڑا اور پھر اس کا اختتام ہو گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے یہ لوگ کسی بہت ہی کشادہ غار میں پہنچ گئے ہوں، دہانے سے باہر نکلے تو خلاء میں ہاتھ مارے، خلاء لامحدود تھی۔ یہ احساس ان الفاظ سے ہوا جو شوراک کے منہ سے نکلے تھے۔

"یوں لگتا ہے جیسے سرنگ کا اختتام ہو گیا۔" اس کے یہ الفاظ بری طرح گونجنے لگے تھے اور دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے، اس غار کی بلندی بے پناہ تھی اور شاید وسعت بھی، یہ لوگ چند لمحات اپنی جگہ کھڑے رہے پھر شوراک نے کہا۔

"آؤ اسے بھی ٹٹول کر دیکھیں، ہو سکتا ہے اس کا بھی کوئی باہر جانے کا راستہ ہو۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے شاہ زیب، یہ ہماری بہترین پناہ گاہ ہے اور یہاں کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس پناہ گاہ میں ہم کریں گے کیا، کتنی دیر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟"

"سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے اور پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اگر ہم دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائیں اور ہمیں تحفظ مل جائے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی بحال ہوں گی۔"

"اور میں بہت لطف اندوز ہو رہا ہوں.. کیوں؟" شاہ زیب نے کسی قدر بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور شوراک ہنسنے لگی، پھر شاہ زیب کا شانہ تھپتھپاتی ہوئی بولی۔

"آؤ آگے بڑھیں۔"

اور یہ لوگ آگے بڑھ گئے، پیروں کے نیچے کوئی گیلی سی چیز محسوس ہو رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے غار کے فرش پر گھاس بچھی ہو، لیکن اس گھاس نے جو کارنامہ دکھایا اس سے بھی لطف ہی آ گیا دفعتاً وہ گھاس ان دونوں کے وزن کو لے کر سمٹنے لگی اور دونوں گرتے گرتے بچے، ان دونوں نے سہارے کے لیے ایک دوسرے کو تھامنا چاہا لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے۔ البتہ گرنے سے ان کو کوئی چوٹ نہیں لگی تھی کیونکہ وہ گھاس اب زمین سے کافی اونچی ہو گئی تھی اور پھر یہ تو بعد میں ہی احساس ہوا کہ یہ گھاس نہیں بلکہ رسیوں کا کوئی جال ہے، جس پر یہ لوگ چل رہے تھے اور اب جال اوپر اٹھنا شروع ہو گیا تھا، ان دونوں نے جدھر بھی ہاتھ پاؤں مارے ادھر ہی لڑھک گئے اور دیر تک دونوں اسی طرح تاریکی میں جال میں پھنسے ہوئے لڑھکنیاں کھاتے رہے۔ ان دونوں کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا۔

پھر دفعتاً ہی ایک سمت سے روشنی پھوٹی۔ یہ مشعل کی روشنی تھی اور پھر مشعل دیوار میں نصب ہو گئی، پھر دوسری مشعل جلی پھر تیسری اور پھر چوتھی اور اس کے بعد وہ ہیولا نظر آیا جو غار کی دیواروں نصب شدہ مشعلیں روشن کرتا پھر رہا تھا۔ یہ لوگ حیرت سے اس وحشی کو دیکھنے لگے جس کا بدن تنگ دھڑنگ تھا، بھاری بدن درمیانہ قد کا مالک یہ شخص مقامی باشندہ ہی معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سر پر پروں کی ٹوپی تھی، بدن اچھا خاصا تھا اور وہ اپنی حرکات سے چست و چالاک نظر آتا تھا۔

روشنی میں ان دونوں نے چھت کی طرف دیکھا، بہت اونچائی پر اس جال کی ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں اور جال بھی کافی وسیع تھا۔ غار میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، تھوڑی دیر کے بعد غار پوری طرح روشن ہو گیا۔ مشعلیں جس چیز سے جل رہی تھیں وہ نہ تو بدبودار تھی اور نہ ہی دھواں دے رہی تھی، پورے غار میں صرف یہی ایک وحشی نظر آ رہا تھا جس کا تعلق شاید شیکال سے تھا۔

ایک سمت ایک چھوٹا سا دہانہ اور نظر آیا، غالباً یہ وہیں سے نکلا تھا۔ جب غار پوری طرح روشن ہو گیا تو اس کا کام ختم ہو گیا، اس نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب اور شوراک کو دیکھا اور پھر کچھ الفاظ ادا کیے، لیکن دونوں میں سے کوئی بھی اس زبان کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ یہ دونوں بڑے اطمینان سے جال میں لٹکے ہوئے تھے، وحشی نے چند لمحات کھڑے ہو کر انہیں دیکھا پھر ایک سمت بڑھا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ

رقص کر رہی تھی۔ رنگ گہرا سیاہ اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پائی جاتی تھی، شاہ زیب کو نجانے کیوں یہ احساس ہوا کہ وحشی کے انداز میں ایک پراسراری کیفیت ہے، وہ ان دونوں کے نزدیک کھڑا مسکرا رہا تھا، لیکن پھر دفعتاً ہی اس کی آنکھوں میں شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔ وہ شوراک کو دیکھ رہا تھا، اس کے بعد وہ دوڑتا ہوا ایک طرف گیا اور ایک مشعل اپنی جگہ سے نکال کر لے آیا تاکہ اور غور سے شوراک کا چہرہ دیکھ سکے، شوراک نے آہستہ سے کہا۔

"لگتا ہے جیسے اب کچھ ہونے والا ہے۔"

شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وحشی شوراک کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ کے انداز میں نکلا۔

"میرے خدا۔" یہ جملے اس وحشی نے خالص انگریزی میں کہے تھے جس کی وجہ سے شاہ زیب اور شوراک حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے، شوراک نے آہستہ سے کہا۔

"کیا تم انگریزی بول سکتے ہو؟"

"اوہ اب تو میں لاطینی، فرانسیسی، جرمنی بھی بول سکتا ہوں اور اگر تم چاہو تو جاپانی زبان بھی، اور میرے خدا حیرت انگیز، واقعی حیرت انگیز۔" چند لمحات وہ اسی طرح ان دونوں کو گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی آتشیں ہتھیار ہے؟"

"میرے پاس ہے۔" شاہ زیب نے کہا۔

"براہ کرم اسے نکال کر جال سے باہر پھینک دو۔ میں تمہارے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرا آتشیں ہتھیار میری زبان ہے، ایسی اعلیٰ پائے کی گالیاں سناؤں گا تمہیں کہ تمہارے تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا، اگر تم اپنی بہتری چاہتے ہو تو جو بھی آتشیں ہتھیار تمہارے پاس موجود ہے اسے باہر پھینک دو۔"

"بیوقوف آدمی، اگر ہمارے پاس ہتھیار ہوتا تو اب تک تمہارے بدن میں لاتعداد سوراخ ہو گئے ہوتے"

"اگر تم نے مجھ سے بدعہدی کی تو میں بھی اس کے لیے مجبور ہو جاؤں گا۔"

"تم چاہو تو ہماری تلاشی لے سکتے ہو۔"

"تو اب میں تمہیں جال سے باہر نکال رہا ہوں، لیکن ایک بات سن لو، میں لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں ہوں، تم نے اگر ایسی کوشش کی تو سخت نقصان میں رہو گے، میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں، جو حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے اسے میں صرف اتفاق نہیں سمجھتا، میں سمجھتا ہوں کہ بہت ہی بری بات ہونے جا رہی ہے۔"

"اس سے بری بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نہ زمین پر ہیں اور نہ آسمان پر۔"

"میں تمہیں نیچے اتارتا ہوں، لیکن براہ کرم مجھ سے تعاون کرنا۔"

اس نے کہا اور پھر واپس ایک طرف چل پڑا، غالباً وہ جال کو نیچے اتارنے جا رہا تھا، لیکن پھر کسی خیال کے تحت وہ رکا اور اس کے بعد اس سوراخ میں چلا گیا۔ چند لمحات کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول دبا ہوا تھا۔ پستول ہاتھ میں لے کر اس نے جال کی اس رسی کو نیچے کیا جس سے وہ جال آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا اور اس کے بعد یہ دونوں جال سے باہر نکل آئے۔ وحشی نے کہا۔

"تم لوگ میرے ساتھ آؤ، تمہیں میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

شاہ زیب اور شوراک نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، پھر دونوں اس وحشی کے ساتھ اس دہانے کی طرف بڑھ گئے۔ جس سے وہ خود نکل کر باہر آیا تھا۔ دہانے کے دوسری طرف کا منظر البتہ مختلف تھا، یہاں بہت ہی نفیس قسم کی

چیزیں رکھی ہوئی تھیں، کھانے پینے کی اشیاء، ایک طرف مقامی طور پر لکڑی سے بنائی گئی میز اور اسٹول نما کرسی، دوسری طرف زمین پر بہت سی گھاس بچھی ہوئی تھی جسے نہایت عمدگی سے سیٹ کیا گیا تھا اور وہ ایک نرم اور آرام دہ بستر بن گیا تھا، غرض اس ویرانے میں اور اس جنگلی علاقے میں آسائشوں کا جو بندوبست کیا جاسکتا تھا جدید پیمانے پر وہ کرلیا گیا تھا۔

وحشی نے ان دونوں کو ایک طرف بیٹھنے کی پیشکش کی اور پھر بولا ''میں تمہیں عمدہ قسم کی کوفی پلاسکتا ہوں اور اچھا کھانا دے سکتا ہوں، یہ میری طرف سے دوستی کا اظہار سمجھو۔ لیکن جواب میں میں تمہاری دوستی چاہتا ہوں۔''

''کوفی۔'' شاہ زیب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں... برازیل کی نہایت عمدہ کوفی۔''

''یار بڑے ماڈرن وحشی معلوم ہوتے ہو، بہر طور اگر تم ایسا کرو تو یوں سمجھ لو کہ ہمارے تمہارے درمیان تمام اختلافات ختم۔''

وحشی نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اب وہ ان دونوں کی طرف سے کسی حد تک مطمئن ہوگیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے پستول اپنے پاس سے جدا نہیں کیا تھا تاکہ اگر یہ دونوں کھانے پینے کے بعد بھی کسی شرارت پر آمادہ ہوں تو وہ اپنا تحفظ کرسکے۔

اس کے بعد اس نے کیروسین اسٹو نکالا اور اس پر کوفی کا پانی چڑھا دیا، اس کے ساتھ ہی وہ مخصوص قسم کے ڈبوں سے کھانے پینے کی اشیاء نکال رہا تھا اور شاہ زیب اور شوراک حیران تھے کہ شیکال کا یہ مہذب وحشی کیا حیثیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ اس نے بہترین کوفی بنائی تھی۔ کوفی کے پیالے اس نے شاہ زیب اور شوراک کو دیے اور دو پلیٹیں ان کے سامنے رکھ دیں جن میں عمدہ قسم کے بسکٹ اور ڈرائی فروٹس رکھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں کوفی پیتے رہے تبھی ہی شوراک نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''کیا اس کا تعلق شیکال سے نہیں ہے؟''

''اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو، اس کوفی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''نہیں شاہ زیب، یہ مجھے شیکال کا باشندہ نہیں معلوم ہوتا، تم اس کی انگلش سے کوئی اندازہ لگا سکتے ہو؟''

''میں اس کی کوفی سے بہت سے اندازے لگا سکتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کوفی کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اور کوفی لینا پسند کروگے؟'' اس نے شاہ زیب سے سوال کیا۔

''اس سے زیادہ پسندیدہ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔'' شاہ زیب نے کہا اور اس نے شاہ زیب کا کپ پھر سے بھر دیا، شاہ زیب نے شکریے کے ساتھ دوسرا کپ بھی قبول کرلیا۔ البتہ شوراک نے دوبارہ کوفی نہیں لی تھی۔ پھر جب یہ لوگ تمام چیزوں سے فارغ ہوگئے تو وحشی شاہ زیب اور شوراک کے پاس آ بیٹھا اور بولا۔

''دوستو اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تمہیں بھی خزانے کا چکر ہی یہاں لے آیا ہے''

''میری بات کرتے ہو تو میں تقدیر کے اسی چکر میں گرفتار ہوں اور جہاں تک میری دوست کا تعلق ہے تو اگر اس کے ذہن میں کوئی خزانہ ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔'' شاہ زیب نے جان بوجھ کر شوراک کا نام نہیں لیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے تعاون کرو، میں تمہاری زندگی کی ضمانت لیتا ہوں۔''

''زندگی کے لیے تو ہر طرح کا تعاون کیا جاسکتا ہے، لیکن دوست کیا تم اپنے بارے میں بتانا پسند نہیں کروگے، آخر تم نے شیکال میں رہ کر اتنی عمدہ قسم کی انگریزی اور اعلیٰ قسم کی کوفی کہاں سے حاصل کی؟''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر وہ بولا۔

''ہر چند کہ اتنی جلدی تمہارے اوپر اعتبار خود میری ذات کے لیے خطرناک ہے، لیکن میں خطرات کی زیادہ

پروانہیں کرتا۔ جو زندگی گزار رہا ہوں اس میں ہر لمحہ اتنے خطرات پیش آتے ہیں کہ بالآخر خطرے کا احساس میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بے شک بتا رہا ہوں لیکن اگر تم اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو تو یہ تمہارے ضمیر پر منحصر ہے۔ لیکن میں تم سے ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہوں اور مجھے تمہاری آمد سے بے پناہ خوشی ہوئی ہے۔"

"ہمیں بھی تمہارے مل جانے سے بے پناہ خوشی ہوئی ہے، لیکن زیادہ خوشی اس وقت ہوگی جب تم مکمل طور پر اپنا تعارف کراؤ گے۔"

"میرا نام جوشان ہے اور میں برطانوی باشندہ ہوں۔" اس نے کہا۔

شاہ زیب اور شوراک اچھل پڑے، پھر شاہ زیب نے کہا "لیکن برطانوی بھائی یہ تم روسیاہ کیسے ہو گئے؟"

"میرے چہرے پر میک اپ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"واقعی کمال کا میک اپ ہے۔ لیکن کیا تم مقامی زبان بھی جانتے ہو؟"

"اچھی طرح۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ کون سی مصیبت تھی جس کی بنا پر تم برطانیہ چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے؟"

"خزانہ.. سونے کی چمک، ہیروں کی جگمگاہٹ انسان سے اس کی عقل چھین لیتی ہے، شیکال کا وہی روایتی خزانہ مجھے یہاں لے آیا ہے جس کی تلاش میں تم یہاں پہنچے ہو۔ انحراف کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا۔ صحرائے اعظم کے ان ہولناک علاقوں کا سفر کر کے یہاں آنے والے کسی چکر میں ہی آ سکتے ہیں، تقریباً کوئی اتنے خطرات مول نہیں لے سکتا۔"

"چلو ٹھیک ہے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ہم بھی خزانے ہی کی تلاش میں آئے ہیں، لیکن مسٹر جوشان، آپ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔"

"تم تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کیا کچھ کرنا پڑا اور کیا کیا قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ میرے ساتھ چھ افراد اور بھی تھے اور وہ چھ کے چھ ہلاک ہو گئے۔"

"اور تمہیں زندہ رہنے کے لیے یہ روپ ہی اختیار کرنا پڑی۔"

"ہاں.. اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا، میں تقریباً چار سال سے ان لوگوں کے درمیان ہوں"

"میرے خدا، چار سال، لیکن تمہارے پاس اس کوفی کی موجودگی، کیا یہ چار سال پرانی کوفی ہے۔" شاہ زیب نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا وہ مسکرانے لگا پھر بولا۔

"ذہین آدمی ہو، لیکن یہ کوفی چار سال پرانی نہیں ہے، شیکال کے اس خزانے کے سلسلے میں بہت سے گروہ یہاں آ کر ہلاکت کا شکار ہو چکے ہیں، کوفی کے یہ چار بڑے پیکٹ میں نے ایک گروہ ہی سے حاصل کیے تھے۔ یہاں کے باشندے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، یہ ڈرائی فروٹس اور یہ تمام چیزیں بھی انہی کا عطیہ ہیں۔"

"تو کیا یہاں باہر سے آنے والے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے؟"

"یہ ایک طویل کہانی ہے، اگر تم مجھے اس بات کا اطمینان دلا دو کہ میرے ساتھ مکمل تعاون کرو گے تو میں تمہیں یہ کہانی سنا سکتا ہوں۔"

"پیارے بھائی، اس سے پہلے جن گروہوں سے تم نے یہ کوفی وغیرہ حاصل کی تھی انہیں تم نے اپنے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا؟" شاہ زیب نے دوسرا تیز سا سوال کر دیا۔ جوشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔

"نہیں مجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ ہی کوئی ان وحشیوں کے چنگل سے نجات حاصل کر کے مجھ تک پہنچ سکا ہے، تم پہلے دو افراد ہو جنہوں نے یہ جرأت اور ہمت کی ہے۔"

شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے شوراک کو دیکھا، لیکن شوراک کا چہرہ ستا ہوا تھا، شاہ زیب سمجھ گیا کہ وہ اس وقت کس احساس کا شکار ہے، باہر سے آنے والوں کے لیے موت کا تذکرہ سن کر اس کے ذہن میں یہ احساس جاگا ہے کہ کہیں مسٹر گرج اور سونارا کو بھی قتل تو نہیں کر دیا گیا۔ بہر طور شاہ زیب اس داستان کو سننے کے لیے بے چین تھا جو مسٹر جوشان سنانا چاہتے تھے۔ چند لمحات کے بعد جوشان نے کہا۔

"دوستو! میرا تعارف ہو چکا ہے تم سے.. کیا اب بھی اپنے بارے میں بتانا پسند نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں مسٹر جوشان، میرا نام شاہ زیب ہے اور یہ..." شاہ زیب نے شوراک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ میری دوست سونارا ہیں۔" ان الفاظ پر شوراک کے چہرے پر ایک اطمینان پھیل گیا تھا جسے شاہ زیب محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ شوراک نہیں چاہتی تھی کہ اسے شوراک کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے۔

"تمہارا تعلق ایشیا سے ہے۔" جوشان نے سوال کیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے، تمہارے خدوخال ایشیائی ہیں اور یہ لڑکی غالباً امریکن ہے۔"

"تمہارا یہ سوچنا بھی بالکل درست ہے۔"

"ویسے اس کے چہرے میں ایک عجیب بات پائی جاتی ہے، خیر میڈم سونارا، میں آپ کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں، اگر آپ آرام کرنا چاہتے ہوں تو میں مداخلت نہیں کروں گا، ویسے میرا خیال ہے آپ انہی گرفتار ہونے والوں میں سے ہیں جو ابھی حال ہی میں آخری بار شیکال پہنچے ہیں۔"

"تمہارا کہنا بالکل درست ہے مسٹر جوشان، کیا تم اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر ہمیں یہ بتا سکتے ہو کہ ہمارے بقیا ساتھی کہاں گئے، میری مراد ایک لڑکی اور ایک بوڑھے ساتھی سے ہے" شاہ زیب نے کہا۔

وہ مایوس ہو کر ہونٹ سکیڑ کر بولا۔

"افسوس نہیں... میری معلومات اب اتنی وسیع بھی نہیں ہیں۔ میں اپنے طور پر ان کے درمیان جی رہا ہوں اور اس کے لیے مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کاش... ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہو جاتا ویسے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں کو قتل کر دیتے ہیں۔"

"اس کے پس پردہ ایک المیہ کہانی ہے۔"

"آہ ان ویرانوں میں بھی المیے بکھرے ہوئے ہیں۔"

"المیے کہاں نہیں ہوتے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شوراک بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی، ویسے بھی یہ لڑکی عام طور پر مسکرانے کی عادی نہیں تھی اور شاہ زیب نے اسے زندگی کی دلچسپیوں سے دور پایا تھا۔

شاہ زیب کی فرمائش پر جوشان نے اپنی کہانی سنائی اس نے کہا کہ وہ ایک مہم جو ہے اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ شیکال کے خزانے کی تلاش میں تھے، ان میں سے دو ساتھی راستے کی مصیبتوں کا شکار ہو گئے، باقی صرف پانچ افراد شیکال تک پہنچ پائے تھے۔ شیکال میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جوشان کے چاروں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا مگر جوشان ان کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، جوشان نے کہا۔

"میرے دوست تم نہیں جانتے کہ زندگی بچانے کے لیے مجھے کیسی کیسی اذیتوں اور صعوبتوں سے گزرنا پڑا ہے۔"

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی آخری منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے آخری قسط کا انتظار کیجیے)

پہلا شعلہ

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ
میں لودیتی ہوئی شعلہ سامان تحریریں

ایک خبر اور......



ایڈیسن ادریس مسیح

معاشرے کی وہ سچائی جسے ایڈیسن کے قلم نے زندگی دی

ثمینہ کی آنکھوں میں ہراس پھیلتا ہی جاتا تھا۔ اتنا بڑا شہر اور اکیلی عورت! اکیلی تو خیر نہیں تھی' چار جوان لڑکیاں بھی اس کے ساتھ رہتی تھیں مگر فی زمانہ یہی تاثر عام ہے' دس عورتیں بھی اکیلی ہی تصور کی جاتی ہیں جب تک کسی مرد کا ساتھ نہ ہو اور اس بے چاری کا مرد تو سات سمندر پار تھا۔ ایک لڑکا تھا دس سال کا' بس اسی کا دم غنیمت تھا کسی حد تک ورنہ اسے تو لگتا تھا' پورا شہر ہی گھات میں ہے اور یہ شہر بھی تو گھنے جنگل جیسا ہے۔ ہر وقت خطرے کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ تشدد زدہ لاشیں' اسٹریٹ کرائمز' وکلاء کا احتجاج' ہڑتالیں' لاٹھی چارج' آنسو گیس' اغواء' تشدد' جنسی جرائم وغیرہ۔

اخبار روزانہ اسی طرح کی چھوٹی بڑی خبروں سے اٹے پڑے ہوتے ہیں۔ اخبار بینی عذاب ہوگئی ہے' نہ پڑھیں تو کسی ادھورے پن کا احساس بے کل رکھتا ہے اور پڑھ لیں تو حالات سے پریشان۔ ثمینہ بڑا سوچتی تھی اس بارے میں۔ پتا نہیں' کب ہمارا رویہ تبدیل ہوگا اور ہم کسی اچھی بات کو بھی بطور خبر چھاپیں گے' پڑھیں گے اور سنیں گے۔ فی الحال تو لفظ خون میں ڈوبے ہوں تو ہی بات خبر کا درجہ پاتی ہے۔

ثمینہ نے کئی بار سوچا کہ اخبار پڑھنا ہی چھوڑ دے مگر چھٹتی نہیں ہے کافر منہ کو لگی ہوئی' کے مصداق' ممکن نہ ہوا اور ہر روز ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کی بدولت عدم تحفظ کا احساس بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ اپنے طور پر خود کو مضبوط رکھنے کی کوشش بہت کرتی تھی مگر اعصابی طور پر کیونکہ ایک کمزور عورت تھی لہٰذا اس کوشش میں کچھ اور گھبرا جاتی اور شوہر کو فون کر دیتی۔

''آپ سمجھتے کیوں نہیں' میں یہاں ایک دم اکیلی ہوں' کچھ احساس ہے میرا؟''

''تمہارے لیے ہی تو پردیس کاٹ رہا ہوں۔'' جواب ملتا۔

''بھلے سے یہاں میں گولی کھا کے مر جاؤں؟''

''ابے یار' تو میری بیوی ہو کر ایسا سوچتی ہے' عورت بنو عورت۔ ماشاء اللہ' پانچ جوان جہان بچوں کی ماں ہو اور ابھی تک وہی ٹین ایج......''

''یہی جوانیاں تو پریشان کرتی ہیں مجھے۔ کراچی بہت بگڑ گیا ہے فراز! بہت مشکل ہے یہاں رہنا' میں اپنے سائے سے بھی ڈرتی ہوں۔''

''تم پاگل ہو گیا؟''

''نہیں' میں عورت ہوں' وہ بھی اکیلی۔''

''تمہارا اخبار پڑھنا بند نہیں ہوا کیا؟ آج کیا پڑھ لیا؟''

''ایک لڑکی نے فون پر کسی لڑکے سے بات کرنے سے منع کر دیا تھا' اس نے اغواء کر لیا اور......''

''اوہو' تو یہ ان کا مسئلہ ہے' تمہارا نہیں' تمہیں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اور تمہارا صرف ایک ہی مسئلہ ہے پیسا......اور......''

پھر لائن کٹ جاتی اور پھر لڑکیوں کی گویا شامت آ جاتی۔

''تم آج پھر لیٹ تھیں۔''

''تمہیں یہ بریسلیٹ کس نے دیا؟''

''تم یہ اتنا تیار ہو کر کالج کیوں جاتی ہو؟''

''آج کل تم بہت الگ الگ رہتی ہو' کیا مسئلہ ہے' مجھے بتاؤ؟''

''سنو' تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے رستے میں' میرا مطلب ہے نہیں' کچھ نہیں۔''

''تو ہم اگر لڑکیاں ہیں تو ہمارا قصور بتائیں؟''

''یہ......یہ زبان دیکھ رہی ہے اپنی؟''

''تو کیا کروں؟ آپ جو ہر وقت تھانے دارنی بنی رہتی ہیں' کچھ نہ کرتے ہوئے بھی مجرم سمجھنے لگی ہوں میں خود کو۔''

''میں ماں ہوں تمہاری' دشمن نہیں ہوں۔''

''اعتماد بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ماں ہیں تو اعتماد کرنا بھی سیکھیں۔'' کوئی لڑکی کہتی اور دھپ دھپ کرتی نکل جاتی۔

ثمینہ دھواں دھواں چہرہ لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی۔ کیسے سمجھاتی انہیں؟ ویسے بھی انہیں سمجھانے سے زیادہ اسے خود کو سمجھانے کی ضرورت تھی مگر خود کو سمجھانا ایسا ہی تھا جیسا شہر کے حالات بدلنا یا اخبار بینی ترک کرنا' سو یہ مسئلہ ہمیشہ قائم رہا۔



لڑکیاں نئے دور کی پروردہ' چڑھتی جوانیاں ذرا آزادی مانگتی تھیں' اس بے وقت کی راگنی سے اکتا جاتیں۔

''اماں! تمہاری ساری روک ٹوک ہم پر ہے' ہر بات ہم ہی سے کہتی ہو' کبھی کچھ اپنے لاڈلے کی بھی پرواہ کی ہے؟ گیارہ' بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں آتا؟''

''روز تو دیر سے نہیں آتا اور پھر اس کی کیا بات ہے' لڑکیوں کے معاملات ذرا اور ہوتے ہیں' اس کا کیا ہے' مرد بچہ ہے۔''

☆......☆

سنی اب تقریباً روز ہی دیر سے آنے لگا تھا۔ ثمینہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیوں بھئی' کہاں ہوتے ہو آج کل؟''

''کہیں نہیں امی......!''

''رات دیر سے آنے لگے ہو' کیا مصروفیات پال

رکھی ہیں آج کل؛ مجھے بھی تو پتا چلے؟"

"نہیں تو امی! شام میں کرکٹ کھیلنے جاتا ہوں' آپ کو پتا تو ہے' اس کے بعد سرفہد کے گھر پر ٹیوشن پڑھنے۔ آج کل ٹرمز ہونے والے ہیں ناں تو زیادہ دیر تک پڑھاتے ہیں سر۔"

ثمینہ کو سنی کی بات پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ گہری گہری نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں امی!"

"اچھا' میں بات کروں گی تمہارے سر سے' گھر آ کر پڑھا دیا کریں گے؟"

"نن...... نہیں امی......! آپ سر سے کوئی بات نہیں کیجیے گا پلیز' وہ برا منائیں گے۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" ثمینہ نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا اور بعد میں سرفہد کو فون کر دیا۔

"سنی...... وہ تو پچھلے چار پانچ دنوں سے نہیں آ رہا' آپ نے خود ہی تو application sign کر کے بھیجی تھی؟"

"application? ہاں...... یاد آیا' میں نے ہی بھیجی تھی' اٹس او کے۔ رکھتی ہوں۔"

ثمینہ نے ریسیور رکھ دیا اور اگلے ہی لمحے مارے غصے کے اس کے دماغ کی نسیں جلنے لگیں۔ سنی گھر سے غائب تھا' اس رات بھی وہ بہت دیر سے گھر آیا۔ ثمینہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی لڑکیوں پر چیختی چلاتی اور ان سے بے عزت ہوتی رہی مگر جب سنی آیا تو پتا نہیں کیوں وہ اس سے کچھ نہ کہہ پائی سوائے اس کے۔

"میں سرفہد کو فون کر کے راضی کر لوں گی' اب تم پڑھنے کے لیے باہر نہیں جاؤ گے۔"

"لیکن......"

"میں اور کچھ نہیں سننا چاہتی' منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا گرم کرنے جا رہی ہوں۔"

اگلے دن سے سرفہد اسے گھر پر پڑھانے کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ سنی اب باہر جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ سرفہد اس کی پروگریس سے غیر مطمئن تھے اور ثمینہ' سرفہد کی کوششوں سے۔ سرفہد کے گھر پر آ کر پڑھانے سے سنی کو تو کوئی فرق نہیں پڑا مگر کنزیٰ کو ضرور پڑا۔ ہمیشہ ملگجے لباس میں رہنے والی لڑکی اب استری ٹوٹنے نہیں دیتی تھی۔ پہلے ہفتے میں دو بار نہاتی تھی' اب روز سہ پہر میں نہاتی' سلیقے سے بال گوندھتی' گھر میں میچنگ جیولری اور سینڈلیں پہن کر گھومتی اور بات بے بات مسکراتی رہتی۔ ثمینہ نے ایک بار یونہی سرسری سا کہہ دیا تھا کہ سر کے چائے کا پانی کا خیال رکھا کرو۔ محترمہ نے باقاعدہ کوکنگ کے پروگرام دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ ثمینہ کے لیے یہ ایک الگ مسئلہ بن گیا۔ اب اس کی ذمے داریوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے چوکیداری بھی کرنی پڑ رہی تھی۔

شروع دنوں میں ہی ثمینہ نے محسوس کر لیا کہ سرفہد کی نظریں کھلے دروازے سے صحن میں کچھ ڈھونڈتی رہتی ہیں اور کنزیٰ جس کے گردوں میں انفیکشن تھا اور لاکھ فرسٹریشن کے سر پیٹنے پر بھی وہ جو پانی کا گھونٹ پی کر نہیں دیتی تھی' اب بار بار صحن میں رکھی گھڑونچی کے پاس کھڑی نظر آتی تھی۔ ثمینہ اس پیاس کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ سنی کے ٹرمز ہو جانے تک تو وہ برداشت کرتی رہی' ٹرمز ہوتے ہی اس نے سرفہد کو چھٹی دے دی۔ ثمینہ کی جہاندیدہ نگاہوں نے دیکھا' فہد کے چہرے پر عجیب شکست کے سے تاثرات تھے جیسے کوئی شکار ہاتھ سے نکل جائے اور کنزیٰ کی آنکھوں میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ ثمینہ کو خوشی تھی کہ عزت رہ گئی۔ اب اسے سنی کے لیے کسی قریب قریب بوڑھے شخص کی تلاش تھی جو نظر باز نہ ہو۔ قرعۂ فال قدوس صاحب کے نام نکلا' ادھیڑ عمر' خاموش طبیعت' سنجیدہ سے قدوس صاحب لیکچرار تھے۔ ثمینہ خوش ہوئی کہ چلو اس طرف سے جان چھوٹی مگر کچھ ہی دن بعد وہ بھی رنگ دکھانے لگے۔

ثمینہ غلطی پر تھی کہ عمر رسیدہ آدمی ایسا ویسا نہیں ہو گا۔ آخر عمر کے ساتھ تجربہ بھی تو بڑھتا ہے' آسانی سے پکڑ میں آنے والے نہیں تھے قدوس صاحب۔ بڑی آہستگی سے پوری مہارت سے جال بچھانا شروع کیا تھا اور ان کا شکار کوئی لڑکی نہیں' خود ثمینہ تھی۔ بہانے بہانے سے اسے بلا کر بات کرنا اور دوران گفتگو نظر بھر بھر کے دیکھنا ثمینہ کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ مرد اگر نظر باز ہوتا ہے تو عورت بھی نظر شناس ہوتی ہے۔ ثمینہ سب سمجھ چکی تھی مگر خاموش تھی' کچھ کہنا بے کار تھا۔ من حیث القوم تمام مردوں کا یہی وتیرہ ہے' تنہا عورت انہیں بہتی گنگا لگتی ہے' مفت کی شراب لگتی ہے یا پھر پیاسی ہرنی لگتی ہے جس کے لیے گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخری حل یہی تھا کہ اپنی آنکھوں میں حیا رکھی جائے' سو وہ قائم تھی اس لیے قدوس صاحب بھی برابر آتے رہے۔ ثمینہ کو یہ تسلی بھی تھی کہ لڑکیاں اسے انکل کہتی ہیں اور سلام بھی ذرا مشکل سے ہی کرتی ہیں۔

☆......☆

ثمینہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھی' فروا کی حرکتیں کچھ مشکوک سی تھیں۔ گریجویشن کرنے کے بعد اپنی مرضی سے ہی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اکاؤنٹس کا کام کر رہی تھی۔ چھ بجے چھٹی ہو جایا کرتی تھی' سات بجے تک گھر...... مگر کچھ دنوں سے نو' دس بجا کر آنے لگی تھی۔ اس عرصے میں ثمینہ بے چاری سولی پر ٹنگی رہتی۔

"فروا......! آج پھر لیٹ؟"

"امی......! بتایا تو تھا' لیٹ آورز میں بھی کام کرنا پڑ رہا ہے اور پھر...... یہ جو جگہ جگہ سڑکیں کھدی پڑی ہیں' دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"اچھ...... چھا' مگر تم کوشش تو کیا کرو نا۔" آگے وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ آج کل ٹریفک جام کا 'ریڈی میڈ' بہانہ بہت کارآمد تھا۔

ثمینہ بار بار فروا کے ملبوس کی ایک ایک سلوٹ کو گھورا کرتی' اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں' بڑی بڑی غلافی' مخمور کافر آنکھیں! ثمینہ ان آنکھوں میں لکھی کوئی اَن کہی کھوجنے لگتی۔ فروا چونک جاتی۔

"کیا ہے امی؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں' نظر اتروا لیا کرو' کسی کالے دیو کا سایہ نہ پڑ جائے۔"

مگر ثمینہ اب لاکھ نظریں اتارتی' دعائیں پھونکتی' فروا پر کالے دیو کا سایہ پڑ چکا تھا۔ ساحل قریشی نام تھا اس کالے دیو کا۔ آفس میں ہی Finance Manager تھا۔ بہت دنوں سے یہ چکر چل رہا تھا۔ ثمینہ کب تک بے خبر رہ سکتی تھی۔ ایک دن اس نے فروا کے موبائل پر ساحل کا message پڑھ لیا تھا۔ اس کا وجود اب دھماکوں کی زد پر تھا۔ فروا سامنے آئی تو ثمینہ نے سیدھا سوال کر دیا۔

"یہ ساحل قریشی کون ہے؟"

"کولیگ ہے امی......! کیوں' کیا ہوا؟"

"اس نے تمہیں message کیوں کیا؟"

"ہو سکتا ہے' کوئی کام ہو۔"

"نہیں' اس میں کسی کام کا ذکر نہیں ہے۔" ثمینہ کا لہجہ بے حد سخت ہو گیا تھا۔

"امی......! یہ تو ایک عام سی بات ہو گئی ہے' دنیا جہان کے لوگ ایک دوسرے کو میسج send کرتے ہیں۔"

"نہیں فروا......! یہ میری تربیت نہیں ہے۔ اسے منع کر دو۔"

غزل

دل پر کسی کے دل کا اجارہ نہیں قبول
ہم کو محبتوں میں خسارہ نہیں قبول

ہم کو ہر ایک شب کے لیے چاند چاہیے
جگنو نہیں قبول' ستارہ نہیں قبول

جس میں کسی کی ذات پہ کیچڑ اُچھالا ہو
ہم کو کوئی بھی ایسا شمارہ نہیں قبول

ہم کو تو لہر بن کے سمندر میں رہنا ہے
کشتی نہیں قبول' کنارہ نہیں قبول

تم تو ہمارا دل بھی نہ رکھ پائے پیار میں
کوئی بھی تحفہ ہم کو تمہارا نہیں قبول

اک بار جو بھی سعدیہ دل سے اُتر گیا
ہم کو کسی طرح وہ دوبارہ نہیں قبول

مہمان بھی ہم بھی سعدیہ چار روز کے
دنیا کو گر وجود ہمارا نہیں قبول

(شاعرہ: سعدیہ سیٹھی۔ لندن)

’’امی......! پلیز......آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟ کیا آپ کو مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں؟‘‘ فروا نے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت اور بے چارگی سمو کر باکمال اداکاری کی تھی حالانکہ دل کا چور بری طرح کانپ رہا تھا۔ ثمینہ اس کے لہجے سے پسیج گئی تھی۔

’’نہیں بیٹا! تم پر یقین ہے مجھے مگر اس ماحول پر نہیں۔‘‘ ثمینہ نے کہا تو فروا کو لگا' الفاظ کچھ اور ہیں' لہجہ کچھ اور! مگر اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کہ خود بھی جواب دینا پڑ سکتا تھا۔

☆......☆

ستارہ کا منہ دو دن سے پھولا ہوا تھا۔ اس کے کالج میں پکنک کا پروگرام تھا۔ ثمینہ اجازت نہیں دے رہی تھی۔ کل ہی کے اخبار میں اس نے پکنک پوائنٹس پر ایک کالج کے اسٹوڈنٹ کی ’’تفریحات‘‘ سے متعلق ایک طویل رپورٹ پڑھی تھی۔ اس رپورٹ میں ایک ایسی لڑکی کا ذکر بھی تھا جس کے ساتھ وہاں کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

اس رپورٹ نے ہی ثمینہ کے حواس شل کر دیئے تھے۔ ستارہ کو کیسے اجازت مل سکتی تھی؟ مگر وہ بضد تھی۔

’’امی......! ساری دنیا جاتی ہے۔‘‘

’’مجھے ڈر لگتا ہے بیٹا......! بڑے کچے رنگ ہوتے ہیں اوڑھنی کے......عزت ایک بار چلی جائے تو......‘‘

’’امی......! کالج کی ساری لڑکیاں جا رہی ہیں' لڑکے نہیں ہیں جو آپ......‘‘

’’وہاں تو ہوں گے ناں' اور پھر شہر کے حالات' ٹریفک' اگر ایکسیڈنٹ ہو گیا تو؟‘‘

’’تو......اچھا ہوگا' مر جاؤں گی' جان چھوٹے گی اس قید خانے سے' ایک ایک قدم ناپ ناپ کر رکھنا پڑتا ہے یہاں۔ لوگوں کے ابو پابندیاں لگاتے ہیں۔ آپ نے ان کی کمی پوری کر دی۔‘‘ ستارہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

’’بیٹا......! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو' زمانہ بہت خراب ہے' قدم قدم پر پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں یہاں' ہر قدم واقعی پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔‘‘

’’امی......! پلیز......‘‘

’’اچھا' میں کسی دن خود تمہیں لے جاؤں گی کہیں۔‘‘

’’نہیں جانا مجھے آپ کے ساتھ۔ میری اپنی فرینڈز میں کتنی انسلٹ ہوگی جب میں کہوں گی کہ میری امی نے مجھے اجازت نہیں دی۔‘‘

’’اس میں انسلٹ والی کیا بات ہے؟‘‘

’’ہے امی......! ضرور ہے' کیا آپ کو اتنا بھی اعتماد نہیں ہے اپنی بیٹی پر؟‘‘

’’بات یہ نہیں ہے ستارہ......!‘‘

’’بات یہی ہے' آپ کو صرف لوگوں پر یہ ثابت کرنا ہے کہ آپ نے کس طرح اپنی اولاد کو کنٹرول کر کے رکھا ہے تاکہ لوگ واہ واہ کریں کہ دیکھو' ثمینہ کا شوہر نہیں ہے پھر بھی اس نے کس طرح manage کر کے رکھا ہے سب کچھ مگر I'm sorry امی......! میں آپ کے اس so-called ڈر کی وجہ سے اپنی زندگی کو گھن نہیں لگاؤں گی' نہیں گھونٹوں گی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا گلا۔‘‘

’’مطلب کیا ہے تمہارا؟‘‘

’’میں کالج ٹرپ پر ضرور جاؤں گی' چاہے آپ اجازت نہ بھی دیں۔‘‘

ستارہ نے سرکش لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلی گئی گویا وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اب مزید کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ ثمینہ گنگ بیٹھی رہ گئی۔ ایک موٹا سا آنسو پلکوں کی فصیلیں توڑ کر بہہ نکلا تھا۔ دل و دماغ میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ کبھی کبھی ثمینہ کو خود بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ زیادتی ہے مگر وہ مجبور تھی' یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہی تھا ورنہ کوئی بھی ڈر یا خوف عمر بھر کا روگ نہیں بنتا۔ آپ خبریں پڑھتے ہیں' آپ جلاؤ گھیراؤ بھی دیکھتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد سب زائل ہو جاتا ہے' یقیناً یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہی تھا۔

☆......☆

رات کسی لنگڑی چیونٹی کی سی رفتار سے گزر رہی تھی۔ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ہزاروں سال جتنا طویل لگتا تھا۔ وقت کی رفتار دراصل ہمارے جذبات سے جڑی ہوتی ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ صدیاں پر لگا کر اڑ گئیں اور کبھی جیسے لمحوں کی لنگڑی چیونٹی پیٹھ پر منوں بوجھ لاد کر غیر محسوس رفتار سے رینگ رہی ہو۔ ثمینہ کو بھی یونہی لگ رہا تھا کہ وقت نہیں گزر رہا' ساعتیں جم گئی ہیں۔ ستارہ

نے جو کہا' کر دکھایا تھا۔ صبح بڑے اطمینان اور اہتمام سے تیار ہو کر باقاعدہ ثمینہ کو سلام کر کے گئی تھی اور باوجود چاہنے کے ثمینہ اسے روک نہیں پائی تھی۔

ستارہ کے جانے کے بعد سے اب تک ثمینہ دل تھام کر بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کیوں کب کے پڑھے اخباروں کے تراشے اس کے سامنے ڈوب ابھر رہے تھے اور اس کا دل جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر کر دبا رہا تھا۔ کنزیٰ بار بار سمجھاتی رہی مگر وسوسوں کا غبار بہت گاڑھا تھا۔ پتا نہیں کون کون سی دعائیں پڑھ ڈالی تھیں مگر سکون کا ایک قطرہ بھی میسر نہ آیا۔ اسی طرح خوف میں کانپتے' دعائیں پڑھتے' لڑکیوں کو ڈانٹ پھٹکار کرتے۔ پہلے دن گزر گیا تھا اور پھر شام مگر رات ہوتے ہی وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ مین روڈ کے بھی کئی چکر لگا کر آ چکی تھی۔ شوہر سے رابطہ کرنے کی بھی مسلسل کوشش کی مگر ممکن نہ ہوا۔ سنی کو تو مستقل وہیں بس اسٹاپ پر ہی بٹھایا ہوا تھا۔

خدا خدا کر کے رات ساڑھے دس بجے کے قریب کہیں ستارہ کی واپسی ہوئی تھی۔

’’اتنی دیر......؟‘‘

’’ابھی تو اور لڑکیوں کو آدھا گھنٹہ مزید لگ جائے گا' میرا اسٹاپ نزدیک تھا۔‘‘ ستارہ چہکتے ہوئے بولی۔

’’اتنا بھی نہ کر سکیں کہ ایک فون ہی کر دیتیں؟‘‘

’’کہاں سے کرتی؟ نازیہ کے موبائل میں کریڈٹ نہیں تھا۔‘‘

’’سنی کہاں ہے؟ اسٹاپ پر نہیں ملا؟‘‘

’’نہیں تو' میں اسٹاپ پہ تو نہیں اتری ہوں۔ رات زیادہ تھی ناں تو میڈم نے گلی میں اتارا ہے۔‘‘

’’ہائے......تیرا بیڑہ غرق......اس بے چارے معصوم کو وہاں بٹھا کے رکھا ہے کب سے۔‘‘ ثمینہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور بیڈ پر پھینکی گئی چادر اٹھا کر اوڑھتے ہوئے باہر نکل گئی اور ستارہ بہنوں کو پکنک کے قصے سنانے لگی۔

سنی اسٹاپ پر نہیں تھا۔ ثمینہ گرتے پڑتے گھر پہنچی تھی۔ رات گہری ہوتے ہی ڈھنڈیا مچ گئی۔ گلی محلہ چھان مارا' رشتے داروں کے فون ملا لیے' مسجدوں تک میں اعلان ہوا مگر سنی کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

ثمینہ بار بار بے ہوش ہوئی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی بھی حالت بہت بری تھی۔ نیو کراچی والا بھائی تو اطلاع ملتے ہی پہنچ گیا تھا۔ محلے کے بھی چند اچھے لوگ اکیلی عورت کا خیال کر کے حتی المقدور کوشش میں تھے کہ کہیں کچھ سراغ ملے مگر......

ثمینہ کو ہوش آتا تو وہ ستارہ کو کوسنا شروع کر دیتی' وہی فساد کی جڑ تھی' اسی کی خاطر میں سنی گھر سے نکلا تھا۔

ثمینہ کو گلوکوز کی ڈرپ چڑھائی جا چکی تھی مگر اعصاب قوی نہ ہوئے' محلے کے نیم حکیم ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن بھی لگایا تھا مگر لگتا تھا' نیند بھی اپنی پوری آنکھیں کھولے سنی کا رستہ دیکھ رہی ہو۔

سانپ کی طرح پھنکارتی رات اپنے پچھلے پہر میں تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ سنی کسی اسپتال میں تھا۔ سب بھاگم بھاگ اسپتال پہنچ گئے مگر ڈاکٹرز نے سنی سے ملنے پہ پابندی لگائی تھی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی' ہر لب محو دعا۔ ثمینہ کا ماتھا تو اسپتال کے ٹھنڈے فرش سے چپک کر رہ گیا تھا اور پھر جب ڈاکٹر سے سامنا ہوا تو وہ بس سسک ہی پڑی۔

’’ک ک......کیا ہوا ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو؟‘‘

’’He is O.K. now. ٹریٹمنٹ دے دیا گیا ہے۔ امید ہے' جلدی ٹھیک ہو جائے گا مگر جو accident بچے کے ساتھ ہوا ہے' mostly ایسے cases میں بچوں کا confidence lost ہو جاتا ہے۔ آپ کو بہت زیادہ اپنے بچے کی care کرنا پڑے گی۔‘‘

’’ک ک......کیا ہوا ہے اسے......کیا؟‘‘

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا' ثمینہ اس کی تاب نہ لا سکی اور کھڑے قد سے ٹھنڈے فرش پر گر پڑی۔

اگلے روز صبح کے اخبارات میں ایک خبر اور چھپی تھی جسے ثمینہ نہیں پڑھ سکی تھی۔

’’کراچی کے سائٹ ایریا میں دس سالہ بچے کو اغواء کرنے کے بعد شدید تشدد اور اجتماعی جنسی زیادتی۔ ملزمان فرار' مضروب بچے کی جان بچا لی گئی۔‘‘

☆☆☆

وی سی آر



ارم ناز

معاشرے کی اقدار کو بھسم کرتی ایک شعلہ سامانی، کراچی سے

لمبی سیاہ سڑک جو دُور تک چلی جاتی تھی۔ سڑک کے دائیں طرف زندگی ہنستی مسکراتی عیش کرتی تھی۔ جبکہ دوسری طرف زندگی پیٹ بھر کھانے کو ترستی تھی۔ بوند بوند صاف پانی کو ترستی تھی۔ بھوکا پیٹ اور ننگا تن اِن غریبوں کا مقدر تھا۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ایک طرف تو اتنا رزق تھا کہ پیٹ بھر کھانے کے بعد کھانا کچرے کے ڈبوں میں چلا جاتا تھا۔ مگر دوسری طرف بھوک رقص کرتی نظر آتی تھی۔ سوکھے سڑے بچے جن کا ماس خوراک کی کمی کی وجہ سے ہڈیوں سے چپک چکا تھا۔ میلی اوڑھنیاں اوڑھے عورتیں مزدوری کرتے مرد زندگی کے بوجھ کو ہنسی خوشی گھسیٹ رہے تھے۔ یہاں ہر گھر کی ایک کہانی تھی۔ چلیے پہلے شنو خالہ کے گھر چلتے ہیں۔ خوراک کی تنگی سے تن سکڑا تو لوگوں نے نام کو سکیڑ کے شہناز سے شنو کردیا۔

شنو خالہ کا شوہر گلی گلی ٹھیلہ گھسیٹ کر کباڑ خریدتا تھا۔ بیٹے کی آس میں شنو خالہ نے چار بیٹیوں کی لائن لگادی تھی۔

بالآخر وہ ایک بیٹا پیدا کرنے میں کام یاب ہوگئی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چاروں لڑکیاں کیکر کے جھاڑ کی طرح بڑھ کر جوان ہوگئی تھیں۔ جوان لڑکیوں نے کوئی تتلی، جگنو، پھولوں، شہزادوں کے کوئی خواب نہ بنے تھے۔ تن ننگا اور پیٹ خالی ہو تو کتابی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ کباڑیے کے گھر شہزادے نہیں آتے۔ غریبوں کی بیٹیاں بڑی حقیقت پسند ہوتی ہیں۔ وہ اوقات سے بڑھ کر خواب نہیں دیکھتیں۔

شنو خالہ کی بڑی بیٹی شاکرہ، دوسری صابرہ، منجھلی نادرہ اور چھوٹی مائرہ۔ وہ چار پہاڑ تھے جو خالہ شنو سینے پہ دھرے بیٹھی تھیں۔ ہر آنے جانے والے سے یہی اُلتجا ہوتی۔ بہن اگر کوئی مناسب رشتہ ہو تو میری لڑکیوں کے لیے بتانا اور آنے والی ہاں ہاں ضرور بتاؤں گی۔ کہہ کر ٹال جاتی۔ تقدیر پر تو ان کے دن پھیرنے والی تھی۔ ہوا یوں کہ شنو خالہ کے شوہر دینو کباڑیے کو کسی دوست نے مشورہ دیا۔

ابے دینو وی سی آر خرید لے۔ دنوں میں ہی وارے نیارے ہوجائیں گے۔ مشورہ دینو کے دل کو لگا بیوی سے بنا مشورہ کیے ٹھیلہ بیچ دیا۔ بڑی لڑکی شاکرہ کو اچھے دِنوں کی آس دلا کر اس کی سونے کی بالیاں بھی بیچ دیں۔ تب کہیں جاکے دینو کے ہاتھ اتنے پیسے لگے کہ وہ ایک وی سی آر خرید لے۔

یہ وہ دور تھا جب کیبل کی وبا نہ پھوٹی تھی۔ وی سی آر خرید لیا گیا۔ اگلے پانچ محلوں تک شور مچ گیا کہ دینو کے گھر وی سی آر آگیا۔ محلے کے جوان اور بچے وی سی آر دیکھنے جمع ہوئے۔ تو بوڑھوں سے بھی صبر نہ ہوا۔ سفید داڑھی اور دوہری کمر والے بوڑھے بھی وی سی آر جیسی نعمت کو دیکھنے جمع ہوگئے۔ دینو نے صحن میں کرسی رکھ کر وی سی آر میں مہاراج کو بٹھا دیا۔ محلے دار لائن بنا کر جوق در جوق صحن میں داخل ہوتے اور وی سی آر کا دیدار کرتے ہوئے دوسری لائن کے ذریعے گھر سے باہر نکل جاتے۔ باہر آکر بوڑھے آپس میں ہاتھ پہ ہاتھ مار کر آدھی بستری والی ولایتی ہیروئنوں کی بات کرتے اور آنکھ دبا کر ہنستے البتہ بچے اور جوان انڈین فلم انڈسٹری سے متاثر تھے۔ دینو نے اعلان کیا کہ مغرب بعد ایک انڈین فلم چلے گی جو دیکھنا چاہے پانچ کا نوٹ ہاتھ میں لے کر آجائے۔ پھر کیا تھا پورے محلے میں کھلبلی مچ گئی۔ عورتوں نے جلدی جلدی اپنا گھریلو کام کرنا شروع کردیا۔ دینو کی چاروں بیٹیوں نے بھی ہنڈیا روٹی کرنے کے بعد کچے صحن کو صاف ستھرا کیا اور گھر کی تمام چادریں صحن میں بچھا دیں۔

وی سی آر مہاراج کرسی پر براجمان تھے۔ دینو راجہ بنا محلے کا چکر لگانے نکلا۔ دینو کی چال میں بڑی اکڑ تھی۔ کلف والا کرتا لائنوں والی لنگی اور کندھے پر چورس خانوں والا صاف ستھرا رومال، بالوں میں خوشبودار چنبیلی کا تیل۔ آج تو دینو کی شان دیکھنے کے لائق تھی۔ گردن کی اکڑ کسی طور پر کم نہ ہوتی تھی۔ چلتے چلتے ہر پانچ سیکنڈ بعد نظر گھما کر اِردگرد بھی دیکھ لیتا۔ ہر شخص دینو کو آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہا تھا۔ لوگ انتظار میں تھے کہ کب مغرب کا وقت ہو اور کب فلم چلے۔ وقت تھا



کرکٹ کے نہیں دے رہا تھا۔ محلے دار دینو کے گھر کے آس پاس چکر لگا رہے تھے۔

آخر کار مسرت کی گھڑی قریب آ گئی۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ اذان کے بعد لوگ دینو کے گھر کے صحن میں جمع ہو گئے۔ دینو کا لڑکا فیقا لوگوں سے پانچ پانچ روپے لے کر ٹین کے ڈبے میں جمع کر رہا تھا۔ ڈبہ بھرنے کے قریب قریب تھا مگر دینو کا صحن بھر چکا تھا۔ لہٰذا ہاؤس فل کے بورڈ کے طور پر صحن کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

کیسٹ وی سی آر میں لگائی گئی۔ ٹی وی کو بھی اونچی مسند پر رکھا گیا تھا تاکہ سب باخوبی فلم دیکھ سکیں۔ تو جناب خدا خدا کرکے فلم شروع ہو گئی ساتھ میں دینو جو سب سے آگے عالم فاضل بنا بیٹھا تھا۔ گویا ہوا۔

یہ انڈین فلمی اداکارہ نرگس کا لونڈا ہے۔ بڑی بہترین اداکاری کرتا ہے۔ یہ لڑکی جو اس کے ساتھ ہیروئن ہے۔ بڑا اچھا ناچتی ہے۔ اس کا نام مادھوری ہے۔ محلے دار ٹی وی پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ دینو چونکہ نکڑ کے ہوٹل پہ جا کے چائے پیتا تھا۔ ہوٹل پہ ہر وقت وی سی آر پہ فلمیں چلتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ دینو کافی ہیرو اور ہیروئنوں کے ناموں سے واقف تھا۔ فلم چلتی رہتی رہی بیچ بیچ میں گانے بھی آتے رہے۔ نرم دل لوگ 'سیڈ سین' پہ رو بھی رہے تھے اور کامیڈی سین پہ ہنس بھی رہے تھے۔ تین گھنٹے پورے ہوئے فلم ختم ہو گئی۔ تمام لوگ اُٹھ کر فلم کے مطابق بات کرتے ہوئے دینو کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جانے لگے۔

☆......☆......☆

رات ڈھلی اور صبح کی روشنی پھیل گئی۔ مگر اس محلے کے لیے یہ نئی صبح تھی۔ محلے کا ہر لڑکا ہیرو اور ہر لڑکی ہیروئن تھی۔ اور تو اور ادھیڑ عمر بوڑھوں نے بھی تیل لگا کر سلیقے سے ترچھی مانگ کاڑھ لی۔ خالہ شنو نے اپنی بڑی لڑکی شاکرہ سے رات کا خواب بڑے مزے لے کر بیان کیا۔

''اری شاکرہ رات نرگس کا لونڈا میرے خواب میں آیا۔ دیکھنے میں بڑا خوب صورت تھا۔ میں تو ساری رات اس سے باتیں ہی کرتی رہی۔'' خالہ شنو یہ بات گول کر گئی کہ وہ بھی خواب میں مادھوری تھیں۔

منہ اندھیرے اُٹھنے والا دینو آج آدھا دن گزرنے کے بعد اٹھا۔ ٹین کا ڈبہ پکڑ کر نوٹ نکالے اور گن کر ترتیب دینے لگا۔ اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ جمع رقم تھیلے میں رکھی اور صحن میں رکھی بالٹی سے منہ دھونے لگا۔ دو مرتبہ صابن سے رگڑ کر منہ دھویا۔ خالہ شنو سے رہا نہ گیا۔

''ارے آج کیا اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ دیکھو تو صابرہ تیرا ابا رگڑ رگڑ کر منہ دھو رہا ہے۔ کل تک تو کہتا تھا کہ شیر کبھی منہ نہیں دھوتا۔'' لڑکی ماں کی بات پر منہ پہ دوپٹہ رکھ کر ہنسنے لگیں۔ دینو کھسیانا ہو کر شنو کو گھورنے لگا اور باہر نکل کر تھڑے پہ بیٹھ گیا۔ دینو کا بیٹھنا تھا کہ اس کے اردگرد محلے داروں کی بھیڑ لگ گئی۔

اِردگرد لوگ اور بیچ میں دینو راجہ اِندر بنا بیٹھا۔ ایک لڑکے نے بڑے اِتراتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں چاچا دینو آج کون سی فلم لگائے گا۔'' دینو نے اکڑ کر جواب دیا۔

''ابھی تو شہر جا رہا ہوں۔ تار خرید کر لاتا ہوں۔ جس کے گھر ٹی وی ہے اسے وی سی آر سے تار لگا کر گھر میں دوں گا۔ تاکہ سب مزے سے فلم دیکھیں۔ دو فلموں کے تیس روپے اور جس کے گھر ٹی وی نہیں ہے وہ میرے صحن میں فلم دیکھے۔ دو فلموں کا دس روپے فلم وہی مغرب بعد چلے گی۔'' دینو کی تقریر پوری ہو گئی تو وہ اپنے لڑکے فیقے کو ساتھ لیے ہوئے شہر کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

محلے داروں نے اپنے کام مغرب سے نمٹانا شروع کر دیے۔ پورے محلے میں مغرب سے پہلے تاریں پھیل گئیں۔ آج دینو دو فلمیں لایا پہلی انڈین دوسری انگریزی۔ انڈین فلم شروع ہوئی تو تمام لوگ دم سادھے فلم دیکھتے رہے۔ دوسری انگریزی فلم لگی زیادہ لوگوں کو سمجھ نہ آئی۔ مگر گوری میم دیکھنے کے قابل تھی۔

دن گزرتے رہے۔ فلمیں لگتی رہیں۔ مہینے بھر میں دینو اچھے خاصے نوٹ کما چکا تھا۔ تین بڑی لڑکیوں کے رشتے بھی لگ چکے تھے اور فیقے کا نین مٹکا رضیہ چاچی کی لونڈیا سے چل پڑا تھا۔ جب بھی فلم لگتی بغل والی شمائلہ کی دادی شمائلہ سے سوال کرتی۔

''یہ لڑکیاں ناچ ناچ کر تھکتی نہیں۔ کم بخت ہر وقت ناچتی رہتی ہیں۔'' ہمت کر کے شمائلہ کا دادا بھی پوچھتا۔

''یہ لوگ چھپ کے کہاں بیٹھتے ہیں۔ جیسے ہی ہیرو ہیروئن گانا شروع کرتے ہیں یہ اِتنے سارے لونڈے لونڈیاں کہاں سے نکل آتے ہیں ناچنے کو۔'' دادا کو دیکھا دیکھی شمائلہ کی پانچ سالہ بہن جو الگ شش و پنج میں تھی۔ سوال کرتی۔

''باجی اتنے سارے لوگ ٹی وی کے اندر جاتے کیسے ہیں۔''

دینو کی اماں تو باقاعدہ تسبیح لے کر صحن میں ٹی وی کے آگے بیٹھتی۔ جیسے ہی ہیروئن پر کوئی مصیبت آتی تسبیح پڑھتے ہوئے دعا کرتیں۔

''یا اللہ اس بچی کی مشکل آسان کر۔ محلے کے تمام افراد کی زبان پر ہندی الفاظ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بچوں کو کئی فلمی گانے زبانی ازبر تھے۔ بچے لہک لہک کر گانے گاتے پھرتے تھے۔ محلے کے بزرگ اپنے آپ کو کسی طور پر بزرگ ماننے کو تیار نہ تھے۔ خزاب سے بال رنگ کر انھوں نے گئی جوانی واپس گھسیٹ لی تھی۔ خود سوچیے جہاں کے بزرگوں کا یہ حال ہو۔ وہاں کے جوان کس مقام پر ہوں گے۔

اِس محلے اور اس سے اگلے تقریباً پانچ محلوں کی مصروفیات کا مرکز وی سی آر ہی تھا۔ ان کی زندگی اِس کے گرد گھومتی تھی۔ کوئی نا جانتا تھا۔ نئی نسل کس طرف جا رہی ہے۔ دینو کا کاروبار زور و شور سے چل رہا تھا۔ دینو کو بے عزتی اس روز محسوس ہوئی جس روز دور کھڑے مسجد کے مولوی نے دینو کو لعنت دِکھاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''دینو تیرا دین گیا۔''

☆☆☆

حرام خور

فوزیہ احسان رانا

اُس ماں کی کہانی ٗجس نے اپنے بیٹے کی خودی کو کچل ڈالا تھا

ناعمہ آج بے تحاشا خوش تھی۔ خوشی اُس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اُس کی مسرت وشادمانی اُس کی حرکات وسکنات سے ہویدا تھی۔ اُس کا دل آسودگی سے دھڑک رہا تھا۔

ناعمہ ایک بیوہ خاتون تھی۔ اُس نے زین کو بغیر باپ کے پالا تھا۔ وقت اپنے دامن میں بہت سی تلخ و شیریں یادیں سمیٹے آخرکار گزر ہی گیا تھا۔ زین نے آج گریجویشن مکمل کرلیا تھا۔

ناعمہ کے کمزور بدن میں جیسے ڈھیروں طاقت آگئی تھی۔ زین ناعمہ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اس کی عمر بھر کی جمع پونجی زین ہی تو تھا۔

''بہت لمبا سفر کاٹا ہے بیٹا محتاجی کی زندگی گزاری ہے۔ اب میری محتاجی کے دن ختم ہوئے۔'' ناعمہ زین کو فرطِ جذبات سے چومے جارہی تھی۔

''اچھا یہ لے پیسے۔ جلدی سے بازار جا اور مٹھائی لے کر آ۔ میں سب سے پہلے بڑے گھر جاؤں گی۔ ان کو بہت خوشی ہوگی اصل مبارک باد کے تو وہی مستحق ہیں۔'' ناعمہ نے اپنے پلو سے چند مڑے تڑے نوٹ نکال کر زین کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

زین چلا گیا ناعمہ مسکراتے ہوئے نم آنکھوں سے زین کو جاتا دیکھتی رہی۔ اس کا طویل انتظار ختم ہوا چاہتا تھا۔ طمانیت کا احساس اس کے چہرے پر جگمگا رہا تھا۔

''بس تھوڑے دن اور پھر میں بھی ایک کماؤ بیٹے کی ماں کہلواؤں گی۔

تبھی تھوڑی دیر بعد زین مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے اندر آیا۔

''تُو بھی چل میرے ساتھ۔ تیری نوکری کی بات کروں گی، ہم بے کسوں کو ہمیشہ بڑے گھر والوں نے ہی تو آسرا دیا ہے۔ ان کی مالی مدد کی بدولت تو آج بڑھ لکھ سکا ہے۔'' ناعمہ نے مٹھائی کا ڈبہ آنچل تلے چھپایا اور زین کا ہاتھ پکڑا۔

''مجھے نہیں جانا اماں'' زین کے کرخت آواز میں برہمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا لیا۔

ناعمہ نے ٹھٹھک کر زین کو دیکھا پھر اکیلی ہی چل دی۔ ناعمہ کو زین کا انداز برا لگا تھا مگر پھر وہ سر جھٹک کر مسکرانے لگی وہ کسی بھی برے خیال کو دل میں جگہ دے کر اپنی اتنی بڑی خوشی کو غارت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب تو دن پھرنے والے تھے۔ اچھا وقت آگیا تھا۔

......☆☆☆......

ناعمہ جس وقت بڑے گھر پہنچی شام کا وقت تھا



ناعمہ سرخ اینٹوں کی روش پر بہت عجلت میں چل رہی تھی جامن کے پیڑ پر بیٹھی سنہری پروں والی چڑیا اپنی جگہ پر پھدکتے ہوئے چہچہا رہی تھی۔ ناعمہ مسکرائی وہ برسوں سے اس گھر میں آ رہی تھی۔ ہر آہٹ ہر آواز سے مانوس تھی۔ سرخ روش پر جابجا پتے بکھرے ہوئے تھے ناعمہ کے قدموں تلے پتے بے سری آوازیں نکال رہے تھے۔

بڑی بی بی سامنے سفید لیس والا دوپٹہ اوڑھے نماز کی ادائیگی کر رہی تھیں۔ ناعمہ کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ ناعمہ تخت پوش کے کونے پر ٹک گئی اور بے چینی سے بڑی بی بی کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ناعمہ کی نظریں ان کے پاکیزہ پُرنور چہرے پر ٹک گئیں صاف ستھری۔ پروقار سی بڑی اماں کی ذات میں ایک وقار تھا ٗ ایک تمکنت تھی۔

بڑی اماں سلام پھیرنے کے بعد دعا میں مشغول ہوگئیں وہ لمبی دعائیں مانگا کرتی تھیں مگر آج وہ ناعمہ کی وجہ سے جلدی فارغ ہوگئی تھیں۔

''سلام اماں یہ آپ کے لیے......'' ناعمہ نے جھجک کر مٹھائی کا ڈبہ آگے کیا۔

''یہ کس لیے......''

''زین پاس ہوگیا...... مبارک ہو۔'' بڑی اماں نے خلوصِ دل سے کہا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔ آپ کی وجہ سے تو یہ ممکن ہوا ورنہ زندگی کا کٹھن سفر کیسے کٹتا۔'' ناعمہ نے آزردگی سے کہا۔ بڑی اماں نے ناعمہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''میرا کیا کمال، انسان تو بس وسیلہ بنتا ہے کارساز تو اللہ کی ذات ہے۔ میں قسمت والی ہوں کہ اللہ نے مجھے چن لیا تاکہ میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی کرسکوں ان کے کام آسکوں۔''

''بڑی بی بی آپ بہت اچھی ہیں۔ ہم غریبوں کی مدد کرتی ہیں۔''

''ناعمہ جب مہوش کے والدین روڈ ایکسیڈنٹ

میں فوت ہوگئے تب میں بھی بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ جوان بیٹے اور بہو کی ناگہانی موت کا جان لیوا صدمہ۔ مہوش کا رونا بلکنا بہت تکلیف دیتا تھا بہت مشکل وقت تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ گھر کے سوا اور کوئی چیز میرے پاس نہیں تھی......" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"پھر اماں......"

"میں کسی رشتے دار کے گھر مدد کے لیے گئی۔ میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ شروع شروع میں، میں نے لوگوں کے کپڑے سلائی کیے۔ پھر میں نے ساتھ کباب بنا کر مختلف دکانوں پر رکھنا شروع کر دیے آمدن کا ایک معقول اور باعزت ذریعہ بن گیا......" بڑی اماں جیسے ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھیں ان کی آنکھیں نم سی ہوگئیں۔

"آپ نے پہلے کبھی یہ بات نہیں بتائی......" ناعمہ نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"بس نہ تم نے پوچھا نہ میں نے بتایا۔ میں نے مہوش کی تعلیم و تربیت پر بہت محنت کی ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز سکھائی اسے اس قابل بنایا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہوسکے۔ اپنے بل بوتے پر دنیا میں سر اُٹھا کر جی سکے۔ اپنی صلاحیتوں کا بروئے کار لا کر حق حلال کی روزی کمانے کے قابل ہوسکے۔ لیکن اس سے بھی پہلے میں نے خود محنت کی اپنی ادھوری تعلیم مکمل کی۔ کالج میں لیکچرار کی نوکری کی بہت عزت کمائی۔ دو ہاتھوں کی کمائی سے اپنی بچی کو پالا۔"

"جی بڑی بی بی۔ میں ایسا ہی سمجھتی ہوں۔"

"میں اللہ سے صرف اپنا بھرم قائم رکھنے کی دعا مانگتی ہوں کہ اللہ پاک میرا بھرم قائم رکھے......"

"بھرم...... کسی چیز کا بھرم...... ناعمہ ٹھٹکی۔

"میری سفید پوشی کا بھرم۔ اس اعتبار کا بھرم جو لوگ مجھ پر کرتے ہیں۔"

"میں اللہ کی تمام عطا کردہ نعمتوں اور آسائشوں کا شکرانہ روزانہ ادا کرتی ہوں جس باری تعالیٰ نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے محنت سے کمانے کی عادت ڈال کر میری عزتِ نفس کو بچالیا مجھے مانگ کر کھانے کی عادت پڑ جاتی تو میری انا، میری خودداری اپنی موت آپ مرجاتے۔ اللہ کا شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اللہ نے مجھے دینے والا بنایا......" وہ ابھی تک نماز کی پوزیشن میں ہی تھیں۔ ان کو اپنے پاؤں پر بوجھ سا محسوس ہوا تو بڑی بی بی نے پاؤں سیدھے کیے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے پیر دبانے لگیں۔ ناعمہ نے آگے جھک کر بڑی بی بی کے پیروں پر ہاتھ رکھے تاکہ وہ دبا سکے مگر بڑی بی بی نے پاؤں ہٹا لیے۔

"ہاتھ سلامت ہیں جب تک بیٹا تب تک میں اپنا ہر کام خود کرنا چاہتی ہوں دوسروں پر انحصار کرنا ہر کام کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنا ذہنی و جسمانی معذوری ہے۔"

"وہ بی بی اپنا وعدہ یاد ہے نا......" ناعمہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

☆......☆......☆

"ہاں یاد ہے۔ مہوش زین کو نوکری سے لگوادے گی تم بے فکر رہو......"

"بہت شکریہ......" ناعمہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

بڑی بی بی گھر کا بجٹ بنا رہی تھیں ماہانہ راشن گیس و بجلی کے بل اور دیگر اخراجات کے لیے انہوں نے پیسے الگ رکھ لیے۔ تو حسب روٹین انہوں نے ناعمہ کے لیے ایک لگی بندھی رقم الگ کرلی پھر کچھ خیال آنے پر مہوش سے بولیں۔

"مہوش بیٹا زین کی نوکری کا کیا بنا۔"

میں نے بات کرلی ہے بیس ہزار تنخواہ ہے۔ آپ ناعمہ آنٹی سے کہیے گا وہ زین کو کہے کہ وہ کل مجھے میرے آفس آکر ملے......" مہوش جو کاغذ قلم سنبھالے حساب کتاب لکھ رہی تھی قلم روک کر بولی۔ بڑی اماں نے محبت سے مسکرا کر مہوش کو دیکھا۔

"جب زین خود کمانے لگ جائے گا تب آپ ناعمہ آنٹی کو یہ رقم دینا بند کردیں گی۔"

ہاں جب زین اپنی ماں کا سہارا بن جائے گیا تب یہ رقم میں کسی اور ضرورت مند کو دینا شروع کردوں گی۔"

مہوش آج گھر پر تھی۔ دونوں دادی پوتی حساب کتاب کر رہی تھیں۔ ان دونوں کا طرز زندگی سادہ سا تھا۔ انہوں نے ضروریاتِ زندگی کے علاوہ کبھی فضول خرچیاں نہیں کی تھیں۔

"بیٹا اب کھانا بنالو بھوک لگ رہی ہے۔"

جی میں کچن میں جارہی ہوں۔" مہوش چھٹی والے دن سارے کام کیا کرتی تھی بڑی اماں کو کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

ناعمہ چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی سر چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی ننھے زین کو لے کر وہ در در کی ٹھوکریں کھاتی رہی پھر اُسے بڑی اماں ملیں۔ وہ مقامی کالج میں لیکچرار تھیں وہ ناعمہ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ تھوڑے سے دن وہ بڑی اماں کے ساتھ رہی پھر کسی خداترس خاتون نے اسے رہنے کو اپنا گھر دے دیا۔ گھر محلے کے درمیان تھا لوگ اچھے رحم دل اور نیک تھے ناعمہ کو مسئلہ نہیں ہوا۔

بڑی اماں ایک مخصوص رقم ناعمہ کو دے دیا کرتی تھیں ناعمہ اگر خیال کرتی تو محنت کو اپنا شعار بنا سکتی تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے چھوٹی موٹی محنت کرسکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اسے مانگ مانگ کر کھانے عادت ہوگئی۔ سارا محلّہ حسب توفیق اس کی مدد کرتا تھا صدقہ خیرات کے پیسوں سے ناعمہ کی زندگی آسان ہوتی چلی گئی۔ مانگنا اس کی فطرت کا حصہ بن گیا۔

شروع شروع میں اسے شرم آتی تھی پھر اس نے سب سے پہلے اپنی عزت نفس کو کچلا اپنی خودی کا گلا گھونٹا۔ ہاتھ پھیلانے والے کے پاس خودداری رہ بھی نہیں سکتی۔ وہ کبھی شکر ادا نہیں کرتی تھی۔ نہ اللہ کا اور نہ ہی اللہ کے بندوں کا۔ جن کو رب تعالیٰ نے وسیلہ بنادیا تھا۔ بس ہر وقت تنگی کے رونے رونا اور مانگنا اس کی زندگی میں شامل ہوتا چلا گیا۔

زین کی بھی حالت ایسی ہی تھی جب ماں ایسی تھی تو وہ بیٹے کو محنت کی عظمت کا درس کیسے دے سکتی تھی۔ صبر شکر کس چڑیا کا نام ہے۔ زین نہیں جانتا تھا پورے محلے سے دال روٹی اکٹھی کرنے والا زین بھی ماں کے نقشِ قدم پر چل نکلا تھا۔

......☆☆☆......

"بیٹا تیار ہوجاؤ مہوش بی بی نے تمہیں فیکٹری بلوایا ہے۔ وہاں وہ بہت بڑی پوسٹ پر کام کرتی ہیں۔ بڑی بی بی نے وعدہ کیا ہے تمہیں نوکری دلوانے کا......" ناعمہ پرجوش تھی۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی نوکری ووکری......" زین بھنا کر بولا۔

"کیوں نہیں کرنی، بیس ہزار تنخواہ ہے۔ گن گن کر دن گزارے ہیں میں نے اس دن کے لیے......"

"اماں اِدھر آ۔ میرے پاس بیٹھ۔" زین نے ناعمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھایا۔

"اماں دیکھ۔ میری بات سن، کس چیز کی کمی ہے ہمیں۔ ساٹھ ہزار روپے ہر ماہ اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ کپڑے لوگ دے جاتے ہیں۔ جس گھر اچھا پکے وہ ہمیں بھیج دیتے ہیں چاہے بچا کچا ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا کماتے ہیں اچھا پہنتے ہیں۔ گھر میں ٹی وی ہے فریج ہے ہر چیز ہے پھر میں نوکری کر کے مشقت کیوں کروں، بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی رقم گھر آجاتی ہے تو مجھے جان جوکھوں میں ڈال کر بیس ہزار کمانے کی کیا ضرورت ہے......"

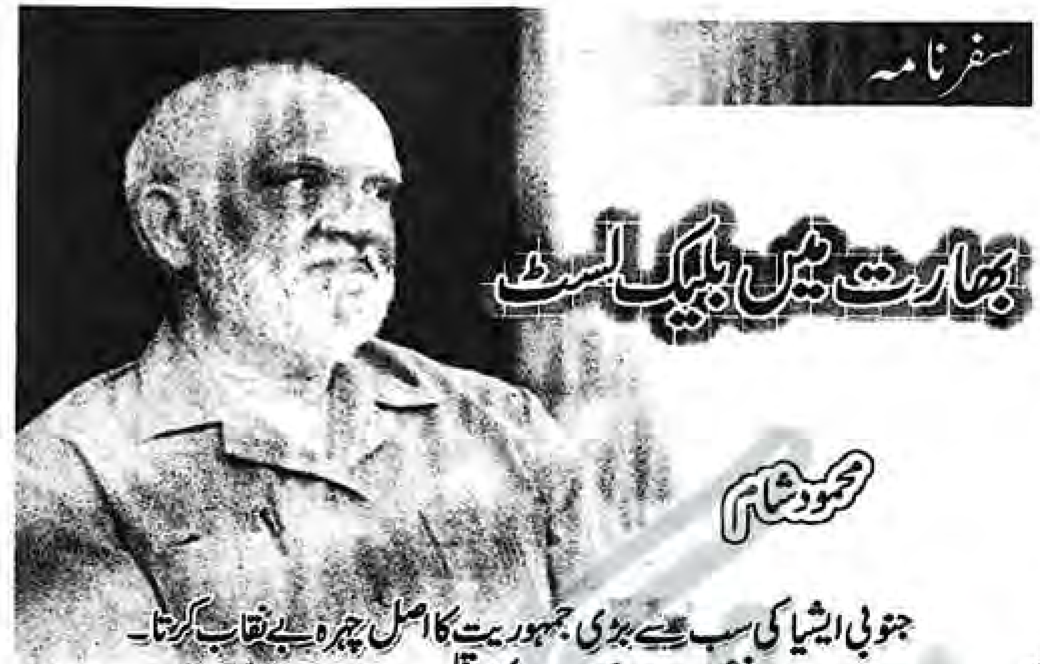
زین کیا کہہ رہا تھا ناعمہ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ زین کے حوالے سے اس نے جتنے خواب دیکھے تھے وہ خاک ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

"اماں ایک راز کی بات بتاؤں۔" وہ قریب ہوا آواز دھیمی ہوگئی۔ ناعمہ ٹکر ٹکر زین کو دیکھ رہی تھی۔

"جب میں نوکری سے لگ گیا نا......تو اسی دن یہ رقم آنا بند ہوجائے گی۔ مجھے نوکری کر کے اپنی یہ ماہانہ امداد نہیں کھونی۔ کبھی نہیں۔ میں ایم اے کروں گا پھر ڈبل ایم اے پھر پھر......زین کی آواز کسی پگھلے سیسے کی مانند ناعمہ کے کانوں میں گھستی چلی جارہی تھی آج پہلی بار اسے احساس ہورہا تھا۔ بہت شدت سے ہورہا تھا۔

"اس نے اپنے بیٹے کو کیا بنادیا تھا۔ احسان فراموش یا ہڈ حرام۔ اس کی خودی ختم ہوچکی تھی وہ معذور ہوچکا تھا لولا لنگڑا۔ حرام خور۔

☆......☆......☆



جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامہ بھارت

دوسرا حصہ

وزیراعظم واجپائی کا چہرہ پھر تمتمانے لگا ہے۔ یہ سوال ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ سیاچین ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو ہمارے دوطرفہ مذاکرات کے لیے پہلے سے شناخت کیا جاچکا ہے۔ اس پر بھارت ہمیشہ جلد از جلد تصفیے کے لیے زور دیتا رہا ہے۔ اس لیے گھما گھما کر سوال نہ کیے جائیں تو اچھا ہے۔'

اب ہم ایران سے بھارت جانے والی آئل پائپ لائن کے حوالے سے دریافت کررہے ہیں کہ بھارت اس سلسلے میں پاکستان کے تعاون سے فائدہ کیوں نہیں اٹھانا چاہتا پاکستان تو اپنے ہاں سے گزرنے والے ایران کے اس آئل پائپ لائن منصوبے میں تعاون کے لیے آمادہ ہے اور بار بار اس کا اظہار کرچکا ہے۔

وزیراعظم بھارت نے پھر توقف کیا۔ اپنے اسٹاف کی طرف دیکھا۔ اور کہنے لگے۔ یہ اتنا سادہ اور آسان مسئلہ نہیں ہے۔ ہم ایران سے گیس کے بھارت لانے کے حوالے سے مختلف معاملات پر تبادلہ خیال کررہے ہیں۔ کس طریقے۔ اور راستے سے کیا فائدہ ہے۔ اور نہیں ہے۔ یہ تو اس منصوبے کے مختلف پہلوؤں کے ٹیکنیکل اور اقتصادی جائزے کے بعد ہی علم ہوگا۔ اس سے وابستہ تمام سیاسی، علاقائی، اور اقتصادی عوامل پر غور کرنے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ گیس بھارت تک لانے کا کون سا راستہ زیادہ محفوظ اور کم خرچ ہے۔'

ہم پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ کیا ہمیں اپنے علاقے میں روایتی ہتھیاروں کے سلسلے میں عدم توازن دور کرنے کے لیے کوئی یکسانیت اور مفاہمت کرنی چاہیے جیسے یورپ والوں نے ہیلنسکی سیکیورٹی ایکٹ کی طرز پر کی ہے۔"

وہ اس ضرورت سے اتفاق تو کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ایشیا ایک ایسا براعظم ہے۔ جہاں بہت زیادہ تنوع اور اختلاف ہیں۔ یہاں کی سلامتی کی صورتِ حال یورپ میں سرد جنگ کے دور کی سلامتی سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں ایشیا میں اپنا ایک سیکیورٹی فریم ورک بنانا ہوگا۔ جو ہماری ایٹمی، سیاسی، فوجی، اقتصادی، اور ثقافتی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو۔'

ہمارا اگلا سوال ہے کہ 'آپ کے اکثر بیانات آتے ہیں کہ آپ برصغیر کے لیے ایک مشن رکھتے ہیں۔ برصغیر کے مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا خواب ہیں۔'

واجپائی جی کچھ دیر سوچتے ہیں۔ پھر گویا ہوتے ہیں۔ ہمارے برصغیر میں انسانی اور مادی وسائل کی غیر معمولی طور پر فراوانی ہے۔ میں تو یہ مانتا ہوں کہ ایک ایسے پرامن جنوبی ایشیا کے تصور کو ہمیں ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنا ہوگا اور کرنا چاہیے۔ جہاں سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے باہمی کوششیں سرگرمی سے کی جائیں۔'

ہم اب آرہے ہیں کشمیر کے حساس مسئلے کی طرف جو بھارت اور پاکستان کے درمیان مرکزی تنازع ہے۔ جب کشمیر کے مجاہدین آزادی نے کہا کہ وہ بھارت سے بھارتی آئین کے فریم ورک میں بات چیت نہیں کریں گے تو آپ نے کہا کہ بات چیت انسانیت کے فریم ورک میں ہوسکتی ہے۔ آپ کی اس سے کیا مراد تھی۔ کیا آپ صدر جنرل پرویز مشرف سے مذاکرات کے دوران بھی اپنے اس مؤقف کو برقرار رکھیں گے۔

وزیراعظم واجپائی کہنے لگے انسانیت اردو کا ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم پاکستان اور بھارت دونوں میں اچھی طرح جانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی اور معیار ہے۔ جو قانونی معاملات فرقہ وارانہ اختلافات۔ مختصر اطمینان نفع اور نقصان کے شمار سے بالاتر ہے۔ میں اس امر کا قائل ہوں کہ کسی بھی مشکل مسئلے کے حل کے لیے انسانیت ہی آخری بنیاد ہونی چاہیے۔"

کشمیر سے متعلق گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم کہہ رہے ہیں کہ اگر کشمیر کا مسئلہ حل ہوجائے تو کیا آپ اپنے دفاعی بجٹ میں کسی کمی کا تصور کرتے ہیں۔

واجپائی جی نے اس معاملے میں بات کرنے سے پہلے کوئی توقف نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ وہ اس جواب کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ وہ کہنے لگے۔ ہمارا دفاعی بجٹ اس خطے میں مجموعی سلامتی کی صورتِ حال کے تخمینے پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہر وقت مناسب دفاعی تیاری برقرار رکھنا ہے۔

کشمیر پر ہی بات چل رہی تھی۔ ہم پوچھ رہے تھے کیا آپ کشمیر کی موجودہ صورتِ حال کو تبدیل کرتے ہوئے کسی حل کے لیے آمادہ ہیں۔ مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف فارمولے آرہے ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی آپ کے نزدیک قابلِ غور ہے؟ کیا آپ کے نزدیک کوئی حل ممکن ہے؟

واجپائی جی نے انتہائی تحمل سے جواب دیا۔ اگر بھارت اور پاکستان تمام معاملات پر اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لیے پرامن اور مخلصانہ دوطرفہ مذاکرات میں مصروف ہوجائیں۔ تو کوئی مسئلہ بھی حل ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔"

ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ صدر جنرل پرویز مشرف سے مذاکرات کے دوران کیا وہ سیکیورٹی کونسل میں بھارت کی رکنیت کے معاملے میں حمایت حاصل کرنا چاہیں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انتہائی روکھے پن سے جواب دیا اقوام متحدہ کے تمام ارکان ہمارے اس نقطۂ نظر سے باخبر ہیں کہ ہم اقوام متحدہ کے ڈھانچے میں اصلاحات لاکر اسے رواں حقائق کی زیادہ نمائندہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم قدرتی طور پر تمام ممالک کی حمایت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہم پھر کشمیر کی طرف آتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کشمیری مجاہدین کا فوری طور پر اور طویل المیعاد کردار کیا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان طے کیا گیا حل قبول نہیں کرتے تو ان سے آپ کس طرح ڈیل کریں گے؟"

ان کا جواب تھا آپ تو جانتے ہیں کہ ہماری جمہوری سیاست انتخابات کے ذریعے اپنی سیاسی ترجیحات کے اظہار کی اجازت دیتی ہے۔ اسی طرح ہماری سیکیورٹی فورسز دہشت گردوں اور غیر ملکی کرائے کے فوجیوں سے نمٹنے کی خوب صلاحیت اور دم رکھتی ہیں۔ یہ دہشت گرد اور غیر ملکی عناصر بے گناہ شہریوں اور سیکیورٹی فورسز کے خلاف تشدد اور دہشت گردی بڑھا رہے ہیں۔ ہماری افواج ان سے اچھی طرح نمٹیں گی۔"

ہمارا سوال تھا۔ کیا پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ بند کرسکتے

ہیں اور تجارت۔ صحافیوں، سیاحوں اور خیالات کی آزادانہ آمد ورفت کی اجازت دے سکتے ہیں جس سے زیادہ ویزے دیے جائیں۔ زیادہ بزنس ہو۔ زیادہ ٹرینیں اور پروازیں چلیں، واجپائی صاحب کہنے لگے۔ ہم اپنے ہمسائیوں کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے قائل نہیں ہیں ہم نے ہمیشہ یہ مانا ہے کہ عوام کے آپس میں رابطے سے مفاہمت بڑھتی ہے، اس سے اچھے پڑوسیوں تعلقات کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہی ہماری کوشش رہے گی۔

ہم نے سوچا کہ ایک سوال چین کے حوالے سے بھی ہو جائے۔ کیا آپ چین کو اپنا دشمن نمبر 1 کہتے ہیں۔ کیا چین علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا کر بھارت کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟ وزیراعظم بھارت کہنے لگے نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم ایسے انداز میں نہیں سوچتے۔ ہم چین سے باقاعدہ اور دوستانہ مذاکرات کر رہے ہیں۔ اور تمام شعبوں میں دو طرفہ تعاون بڑھا رہے ہیں۔

یہ انتہائی ڈپلومیٹک اور محتاط جواب تھا۔ ہم نے پھر انہیں امریکہ کے حوالے سے کچھ کھولنے کی کوشش کی۔ امریکہ اور بھارت کے تعلقات ایک نئی سمت میں بڑھ رہے ہیں۔ جن میں پہلے سے زیادہ گرمجوشی نظر آ رہی ہے۔ کیا آپ امریکہ کے نیشنل میزائل پروگرام کے حق میں ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ پاکستان اور چین دونوں اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا امریکہ سے بھارت کے اتنے قریبی تعلقات بھارت کی روایتی ترقی پسند پالیسی کے تناظر میں ہیں؟ کیا اس سے بھارت کی روس سے قدیم دوستی متاثر نہیں ہوگی۔"

واجپائی جی نے کچھ توقف کیا پھر وہ کہنے لگے بھارت اور امریکہ قریبی تعلقات قائم کر رہے ہیں۔ جن کی بنیاد باہمی اقدار ومفادات اور ایک دوسرے کے باہمی سودمند تعاون کے مواقع پر ہے۔ امریکہ سے ہمارے تعلقات نہ تو کسی کے خلاف ہیں۔ اور نہ ہی یہ روس سمیت دوسرے ملکوں سے ہماری روایتی دوستی کی قیمت پر ہوں گے۔ ہم نے صدر بش کے اعلان کردہ نئے اسٹریٹیجک فریم ورک کے بعض امور کا خیر مقدم کیا تھا۔ خاص طور پر ان کے اس ارادے کا کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کو غیر متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے امریکہ کے اس امر کی بھی حوصلہ افزائی کی تھی کہ وہ اپنے منصوبوں پر مشوروں اور تعاون سے عمل درآمد کرے اور اپنے بین الاقوامی عہد وپیماں سے یکطرفہ طور پر گریز نہیں کرنا چاہتے۔"

ہم اب بھارت کے وزیراعظم سے جاننا چاہتے تھے کہ آئندہ عشرے میں وہ جنوبی ایشیا میں کیا منظر نامہ دیکھ رہے ہیں؟"

وزیراعظم بھارت یہ سوال سن کر کچھ جوش میں آئے۔ جنوبی ایشیا کے تمام ملکوں کو اپنے درمیان علاقائی تعاون اور ترقی کی رفتار تیز کرنی چاہیے۔ اگر جنوبی ایشیا کے ممالک پورے خطے میں دوستی اور بھروسے کی فضا پیدا کر سکتے ہیں۔ تو ہم اپنے انسانی اور مادی وسائل کو اپنے عوام کی ان کی تمناؤں کے مطابق حالت بدلنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے سوالات ختم ہو رہے تھے۔ وزیراعظم نے پوچھا کہ آپ کا قیام تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ امید ہے آپ یہاں بھی صحافیوں سے مل رہے ہوں گے۔ دیکھیں گے اگر آگرہ کے بعد میں ممکن ہوا تو ملاقات ہو۔"

ہم ان سے اجازت مانگ کر چل رہے ہیں۔ پھر ہمیں وزیراعظم آفس کی گاڑی ہی گیٹ تک چھوڑ رہی ہے۔

اب میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا ہوں۔ جلدی جلدی خبر فائل کرنا ہے۔ پھر ٹائمز آف انڈیا کے دفتر پہنچنا ہے۔

......☆☆☆......

ٹائمز آف انڈیا گروپ اور جنگ گروپ کے درمیان خبروں تصویروں کے تبادلے کی مفاہمت ہو رہی ہے۔ پاکستان کا پہلا اردو اخبار ہے جو بھارت کے کسی بڑے اخباری گروپ سے اس قسم کا معاہدہ کر رہا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایگزیکٹو مینجنگ ایڈیٹر دلیپ پڈگاؤنکر کے کمرے میں میٹنگ میں پھر تمام معاملات طے ہوتے ہیں اس بھرپور میٹنگ کے بعد ہمارا رخ 'پانچ جنیہ' کے دفتر کی طرف ہے۔ جہاں تمام پاکستانی صحافی پہنچ رہے ہیں۔ وہاں آر ایس ایس کا دفتر بھی ہے۔ اس لیے تجسس یہ ہے کہ آر ایس ایس پاکستان کے بارے میں اب کیا رائے رکھتی ہے۔ آگرہ چوٹی کانفرنس کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ پانچ جنیہ کے دفتر کو دیکھ کر اپنے پرانے اخبارات و رسائل کے دفاتر یاد آ جاتے ہیں۔ اس وقت تو اس دفتر میں استقبالیہ کے باعث سب میز کرسیاں ہلی ہوئی ہیں۔ دفتر کے برآمدوں کمروں میں ہی پکوان کا اہتمام کیا گیا ہے۔

پاکستان سے آئے ہوئے قریباً سبھی سینئر جونیئر کالم نویس صحافی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ ٹی وی چینل اخبار والے بھی موجود ہیں۔ پاکستانی صحافی بڑی اشتیاق سے راشٹریہ سیوک سنگھ کے عزائم اور مقاصد جاننا چاہتے ہیں ایک سینئر صحافی نے یہ سوال بھی کر ڈالا ہے کہ کیا تحریک آزادی میں آر ایس ایس کا کوئی کردار تھا بھی یا نہیں پانچ جنیہ کے موجودہ ایڈیٹر ترن وجے کے ساتھ ساتھ کچھ سابق ایڈیٹر بھی موجود ہیں۔ جواب راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ پانچ جنیہ 14 جولائی 1948ء کو موجودہ وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی صدارت میں شروع ہوا تھا۔ اب ترن وجے اس کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔

اکثر پاکستانی صحافیوں نے آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ بھی کیا ہے۔ اپنی آمد کے دوسرے دن ہی پاکستانی صحافیوں کو بہت کچھ سننے بحث کرنے کو مل گیا ہے۔

ہوٹل واپسی پر ہمیں فکر ہے کہ انٹرویو کی تصویریں بھی بھیج دی جائیں۔ فوٹو گرافرز نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمارے کمرے میں تصویریں پہنچا دے گا رات ڈھل رہی ہے۔ تصویریں نہیں ملی ہیں۔ پی آئی اے کی طرف سے پاکستانی میڈیا ٹیم کے اعزاز میں عشائیہ ہے۔ یہاں سفارت خانے والوں سے پوچھ رہا ہوں کہ فوٹو گرافر سے رابطہ نہیں ہوا ہے۔ ان کا پتا کیا ہے کوئی فون ہے۔ رات کے ساڑھے نو بجے دہلی میں پاکستان سفارت خانے کے منسٹر انفارمیشن کامران علی خان انکشاف کرتے ہیں کہ تصویریں تو فوٹو گرافر دوپہر 2 بجے ہی دے گیا تھا۔ وہ تو میڈیا سینٹر میں پڑی ہیں۔

ہمیں کیوں نہیں دی گئیں۔

اس کا جواب دینا، وہ ضروری نہیں سمجھ رہے۔ میڈیا کو سہولتیں پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے، حکومت پاکستان نے ان کی یہاں پوسٹنگ اسی لیے کی ہے۔ انہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ یہ تصویریں اخبار میں اشاعت کے لیے جائیں گی۔ جتنی جلد پہنچیں گی۔ اتنا بہتر ہوگا۔ ہم کھانا درمیان میں چھوڑ کر سفارت خانے کے دو اہلکاروں کو ساتھ لے کر واپس اپنے ہوٹل پہنچے ہیں میڈیا سینٹر سے تصویریں اٹھاتے ہیں۔ اس سینٹر میں اسکیننگ کا انتظام نہیں ہے۔ اس لیے ہوٹل کے بزنس سینٹر سے تصویریں بھیجنا ہوں گی وہاں بھی ایک ہی اسکینر ہے۔ اس پر پہلے سے ایک مہمان مصروف کار ہیں۔ باری آئی ہے تصویریں اسکین ہو کر ای میل سے جا رہی ہیں۔ کمرے میں واپس آ گئے ہیں۔ کراچی فون کرتے ہیں۔ پتا چلتا ہے تصویریں نہیں پہنچی ہیں۔ مسلسل کوششیں، دوسرے ایڈریس پر بھیج رہے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ خوش خبری سنائی دیتی ہے کہ تصویریں پہنچ گئی ہیں۔

آج جمعہ ہے۔ ارادہ یہی ہے کہ نماز جمعہ۔ دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں ادا کی جائے۔ میڈیا کی بس بھی جامع مسجد جائے گی، میں نیچے اترتا ہوں تو پتا چلتا ہے۔ بس نکل گئی ہے۔ میں گاڑی سے جامع مسجد پہنچتا ہوں۔ بہت دور اترنا پڑتا ہے۔ لیکن وہاں جناب عبدالقادر حسن سیکریٹری اطلاعات سید انور محمود ڈائریکٹر جنرل اے پی پی' جمیل الدین مفتی پرنسپل انفارمیشن آفیسر اشفاق گوندل' بس کے انتظار میں کھڑے مل جاتے ہیں۔ بس شاید آگے چلی گئی ہے۔ ہم مسجد کی طرف جا رہے ہیں سامنے مسجد کے مینار اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ گلی کے دونوں طرف مسلمان چھابڑی اور خوانچے والے ہیں، خریدار ہیں۔ لیکن اتنی بدبو ہے کہ چلنا دوبھر ہو رہا ہے۔ یہ گندگی خود مسلمانوں نے ہی یہاں پھیلائی ہوئی ہے۔ برصغیر کی چند قدیم تاریخی عمارتوں میں سے ایک جامع مسجد دلی اب اجڑ چکی ہے۔

دیکھ بھال صحیح طرح نہیں ہورہی ہے۔ بعض دریاں بہت خستہ حالت میں ہیں۔ پنکھوں کا بھی بندوبست اچھی طرح نہیں ہے۔ مسجد کا آنگن، درودیوار چیخ چیخ کر زبان حال سے مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے اس گھر کو سنوارو۔ سجاؤ۔ اس کی عظمت رفتہ واپس لاؤ۔

ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ جماعت ہوچکی ہے۔ نماز واپس جارہے ہیں کچھ وہیں مسجد میں لیٹ چکے ہیں۔ کچھ دروازے کے قریب خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

ہم اپنی جماعت الگ سے کرلیتے ہیں۔ پیر سیف شاہ کو امامت کا شرف ملا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ پاک ہے میرا رب جو عظیم ہے۔ اللہ نے سن لی اس کی جس نے اس کی تعریف کی۔ ہم یہاں نماز پڑھ کر تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ نماز کے بعد مسجد ہی میں تصویروں کا دور۔

پرنسپل انفارمیشن آفیسر کی طرف سے کریم ہوٹل میں ظہرانہ۔

کریم ہوٹل ایک تنگ سے بازار کی ایک اور تنگ سی گلی میں ہے۔ میں یہاں کئی بار آچکا ہوں جب یہ چھوٹا سا ریستوران تھا۔ اب تو یہ کئی منزلوں میں مہمانوں کو سمو رہا ہے۔ اسپلٹ ایئر کنڈیشنڈ کھانا اب بھی اتنا ہی لذیذ، سب نے بڑے شوق سے کھایا ہے۔ گوندل صاحب سب سے فرداً فرداً پوچھ رہے ہیں۔ ابھی کھانا جاری ہے۔ ہم ہوٹل سے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینے کھڑے ہوتے ہیں۔ سامنے کے ہوٹل میں جامع مسجد دہلی کے شاہی امام سید احمد بخاری داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ میں ان کی طرف لپکتا ہوں۔ دو تین ساتھی اور بھی ہمراہ ہیں۔ سلام و نیاز کے بعد کچھ گفتگو کی خواہش۔

ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کی بھارت آمد کے بے تابی سے منتظر ہیں۔ اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ بھارت کے وزیراعظم اور پاکستان کے صدر کے درمیان مذاکرات کے نتائج سے کشمیر کے جھگڑے کو کم کرنے کی ابتدا ہوگی۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ صدر پرویز مشرف نے حال ہی میں سیرت النبی ﷺ کانفرنس سے بہت معرکۃ الآرا خطاب کیا تھا جس میں علماء سے کہا تھا کہ وہ لال قلعے پر پاکستانی پرچم لہرانے کی بات نہ کریں اس سے بھارت کے مسلمانوں کے لیے پریشانی ہوتی ہے۔ اس خطاب کے بعد بھارت کے مسلمانوں میں تحفظ کا احساس پیدا ہوا ہے۔ ورنہ پہلے انہیں ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ انہیں آئی ایس آئی کا ایجنٹ کہہ کر تنگ نہ کیا جائے۔

امام صاحب پر امید ہیں کہ ایٹمی طاقتیں آپس میں بات کریں گی۔ تو کشمیر کے حوالے سے جو طغیانی آئی ہوئی ہے۔ وہ تھمے گی۔ اس کے بعد ہی کشتی کنارے لگانے کا سوچا جاسکتا ہے۔ یہ خوش آئند امر ہے کہ بھارت کے وزیراعظم نے دعوت دی اور پاکستان کے صدر نے اسے قبول کرلیا اور کہا کہ وہ کھلے دل سے بھارت جائیں گے۔

امام صاحب آل پارٹیز حریت کانفرنس کے موقف سے اتفاق نہیں کرتے ہم تشدد کے خلاف ہیں چاہے وہ بھارت کی فوج کرے یا جہادی تنظیمیں۔ جو کچھ کشمیر میں ہورہا ہے یہ جہاد نہیں۔ جہادی تنظیموں کو سمجھنا ہوگا کہ جہاد کس کو کہتے ہیں رح۔ کشمیری تنظیموں کو صرف کشمیر کا نہیں بھارت کے 25 کروڑ مسلمانوں کا بھی سوچنا چاہیے۔ ہم ان سے مزید وضاحت چاہ رہے ہیں وہ کہتے ہیں آل حیرت پارٹیز کانفرنس میں میرواعظ کے خیالات سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ جماعت اسلامی کے علی گیلانی کی باتوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ علی گیلانی کہتے ہیں کہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہوگا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کشمیری تنظیموں نے اس سلسلے میں بھارت کے 25 کروڑ مسلمانوں سے رائے لی۔ جو ایک تقسیم کے زخم اب تک کھا رہے ہیں۔ اب تک وہ سکون سے نہیں رہ سکے۔ ہم ملک کی اور ایک تقسیم برداشت نہیں کرسکتے۔ کشمیر علیحدہ ہوا۔ یا پاکستان میں گیا۔ تو خون میں تو ہم نہائیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ پھر کیا ہونا چاہیے وہ کہتے ہیں کشمیر کا حل وہی ہوگا۔ جو دونوں ملکوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔ لیکن کشمیر کے مسلمانوں کو بھارت کے مسلمانوں سے

الگ رکھ کر نہیں سوچا جاسکتا۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ رہے ہیں کہ لشکر طیبہ اور اس قسم کی تنظیمیں جہاد نہیں کررہی ہیں۔ وہ معصوم انسانوں کو نشانہ بنارہی ہیں۔ عام کشمیریوں سے پوچھیں کہ جن کا سب کچھ لٹ چکا، کاروبار ختم ہوچکا۔ کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ کشمیری مسلمان نوجوانوں کو مسلسل مظالم کی وجہ سے بندوق اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ظلم بھارت کی فوج کرے یا دوسرے مسلح افراد عام کشمیری کو نقصان ہی ہے۔



پاکستان کے سابق صدر جنرل پرویز مشرف اپنی اہلیہ کے ساتھ دہلی ایئرپورٹ پر

وہ گلہ کر رہے ہیں کہ جن مسلمان رہنماؤں کو ہم نے پارلیمنٹ میں بھیجا۔ وزیر بنایا۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کی بحالی۔ اقتصادی ترقی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے کشمیر کے مسلمانوں پر مظالم پر بھی آواز بلند نہیں کی۔ صرف ہم نے بلاخوف آواز بلند کی ہے' کرتے رہیں گے۔ ہم نہ بی جے پی کی حکومت سے ڈرتے ہیں نہ آر ایس ایس سے۔ لیکن ہم


[illegible]

یہ بھی کہیں گے کہ ملک کی ایک بار اور تقسیم سے بھارت کے 25 کروڑ مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک تقسیم کا خمیازہ اب تک بھگت رہے ہیں۔

امام صاحب کہہ رہے تھے وہ جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف سے بھی ملیں ہیں اور پرویز مشرف سے بھی لیکن مسلمانوں کے لیے جو درد انھوں نے پرویز مشرف کے لہجے اور باتوں میں محسوس کیا وہ دونوں کے ہاں نہیں تھا۔

امام بخاری کے ساتھ ان کے دو عقیدت مند بھی ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کی زبوں حالی کے ذکر پر ان کے مقتدی کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ وہ آئے تو تھے تو وہاں کھانا کھانے لیکن اخبار نویسوں کے سوال جواب کا شکار ہوگئے۔ ان کے دو کمسن بچے الگ سے کھانا کھا کر جاچکے تھے۔ ہم نے ان سے معذرت بھی چاہی اور اجازت بھی تاکہ وہ آرام سے کھانا کھائیں۔ اور ہم اپنی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ ہوٹل سے واپسی بس سے ہوئی ہے۔ دہلی میں فاصلے بہت طویل ہیں۔ سڑکیں بہت مصروف ہیں۔ پرانی دلی سے ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے صدیاں بیت جاتی ہیں۔

بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب اشرف جہانگیر قاضی۔ پاکستان کے چند منجھے ہوئے سفارت کاروں میں سے ہیں جو اپنے ملک کا موقف اور نقطۂ نظر انتہائی مہارت سے۔ اعتماد سے ظاہر کرتے ہیں۔ بھارت جیسے ملک میں۔ جس کی روایت دشمنی کی زیادہ ہے۔ جہاں میڈیا سخت متعصب ہے۔ پریس کہنے کو آزاد ہے۔ لیکن وہ اپنے

تعصبات کا اسیر ہے۔ وہاں اپنے ملک کی نمائندگی کرنا اپنا موقف اخباروں میں چھپوا لینا بڑی ہمت کی بات ہے۔ پاکستانی صحافیوں کو انھوں نے آگرہ چوٹی کانفرنس کے موقع پر پائی جانے والی صورتِ حال سے باخبر کیا ہے۔ پاکستان کیا چاہتا ہے۔ اس کا کیا موقف ہے۔ بھارت کیا چاہتا ہے۔ حکومت کا کیا کہنا ہے۔ اپوزیشن کیا کہتا ہے۔ ان کی گفتگو بڑی سیر حاصل ہے۔ وہ سوالات کے جوابات بھی دے رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہمارے اپنے استعمال کے لیے ہے۔ ان سے کچھ منسوب نہیں ہوسکتا۔

اس حقیقی صورتِ حال سے آگاہی کے بعد ظاہر ہے کہ ہم اتنے پرجوش اور پُرامید نہیں رہتے۔ جو دو روز سے تھے۔ آگرہ مذاکرات ایک مشکل سفارتی مرحلہ ہے۔ میں نے ان تاثرات کو دہلی سے اپنے ڈسپیچ میں کچھ اس طرح سمیٹا ہے۔

جنوبی ایشیا کے دو ایٹمی ہمسائے بھارت اور پاکستان ہفتے کی صبح سے سفارت کاری کے ایک سنگین چیلنج کا سامنا کریں گے جس سے دنیا کے بہت کم ممالک کو گزرنا پڑا ہوگا۔ بھارت کے وزیراعظم واجپائی کی دعوت پر جموں کشمیر سمیت تمام مسائل پر گفتگو کے لیے آنے والے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف جب ہفتے کی صبح بھارت پہنچیں گے۔ تو انھیں اپنی توقعات کے برعکس ایسا ماحول ملے گا جو 29 سال بعد ہونے والی سربراہی کانفرنس کے لیے زیادہ تر حوصلہ افزا اور سازگار نہیں ہوگا۔ کیونکہ بھارتی اخبارات اور بالخصوص ٹیلی ویژن چینلوں نے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے سربراہوں کو چائے پارٹی میں مدعو کرنے اور بھارت کی طرف سے ویزے وغیرہ کی پابندیاں ختم کرنے پر پاکستان کے ردعمل کو ضرورت سے زیادہ منفی گردانتے کا مسلسل پرچار کرکے ایک ایسی فضا پیدا کردی ہے۔ جو پہلے سے مذاکرات سے امیدیں باندھنے والے عوام کو بھی برعکس انداز میں سوچنے پر مجبور کررہی ہے۔ نئی دہلی کے سنجیدہ سفارتی حلقے بھی اس صورتِ حال کا بہت بغور مطالعہ کررہے ہیں۔ اپنی معلومات کی بنا پر ان کا یہ خیال ہے کہ جنوبی ایشیا کے ان دونوں بڑے ہمسایوں اور نصف صدی سے زیادہ عرصے سے متحارب ملکوں کی اعلیٰ قیادت اور خارجہ محکموں کو سفارت کاری کے بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے بنیادی مسائل پر جو موقف ہیں۔ وہ انتہائی سخت ہیں اور ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہیں۔ اس لیے اپنے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے کسی ایسے نکتے تک پہنچنا ایک بڑی مہارت کا غیر متوقع مظاہرہ ہوگا۔ جہاں سے ایسے اقدامات شروع ہوں کہ دونوں قیادتیں اپنے اپنے عوام کو یقین دلا سکیں کہ امن کے قیام اور مسائل کے حل کی ابتدا ہوچکی ہے۔ بھارت کا میڈیا۔ اور لیڈرشپ جو بھی کہے اصل مسئلہ کشمیر ہی ہے۔

سفارتی حلقوں کے تجزیے کے مطابق پاکستان کے وفد کے بنیادی نکات یہ ہیں۔

☆ کشمیر ایک متنازع علاقہ ہے

2۔ اس کا فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ کشمیر کے عوام کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ رائے دیں کہ وہ بھارت کے ساتھ رہیں گے یا پاکستان کے ساتھ۔

3۔ گزشتہ نصف صدی سے کشمیریوں کو یہ حق نہیں ملا۔ اور وہاں بھارت نے زبردستی فوجی قبضہ کررکھا ہے۔ کشمیر عوام کا خون بہہ رہا ہے۔ کشمیر کو اگر کلیدی مسئلہ سمجھ کر قدم نہیں اٹھایا گیا تو اور کسی مسئلے پر بھی پیشرفت نہیں ہوسکتی۔

4۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کے حوالے سے In Tegrated (مربوط) اور Comprehensive (جامع) مذاکرات ہونا چاہئیں۔

5۔ سفری سہولتوں۔ ویزہ وغیرہ کے اجراء کے اقدامات اس وقت تک بے معنی ہیں جب تک مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے بات نہیں ہوتی۔

سفارتی حلوں کے مطابق بھارت کے موقف کے بنیادی نکات یہ ہیں۔

1۔ کشمیر بھارت کے دستور کے مطابق بھارت کا حصہ ہے۔

2۔ کشمیر میں ہنگامہ آرائی اور سرحد پار سے دہشت گردی بند ہونی چاہیے۔

3۔ کشمیر پر بات کرنی ہے تو پاکستان کے زیر تحویل کشمیر (آزاد کشمیر) پر بات ہونی چاہیے۔

4۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان Composit (تمام مسائل پر ملے جلے) مذاکرات ہونے چاہئیں۔

5۔ پاکستان کو سفری سہولتوں کے اجراء ویزے پر کیے گئے بھارت کے اقدامات کا جواب دینا چاہیے۔ اس کے نزدیک یہ اعتماد کی تعمیر کرنے والے اقدامات ہیں۔

سفارتی حلقوں کے مطابق آل پارٹیز حریت کانفرنس کو مدعو کرنے پر بھارت کا واویلا مناسب نہیں ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان بی جے پی کے لیڈر اور جن سنگھ کے بانی اٹل بہاری واجپائی اور دوسری طرف کارگل اور کشمیر میں جہاد کے بارے میں قطعی نظریات رکھنے والے صدر جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں مذاکرات ہونے والے ہیں۔ ان حلقوں کے مطابق اٹل بہاری واجپائی اس وقت بھارت کے مقبول ترین محترم ترین لیڈر ہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں گے اسے سب تسلیم کریں گے۔ ان کو صرف اپنی پارٹی کو قائل کرنا ہوگا۔ وہ بھارت کی تاریخ میں جواہر لعل نہرو کے بعد ایک مستحکم اور موثر حیثیت رکھنے والے وزیراعظم ہیں۔ دوسری طرف صدر جنرل پرویز مشرف کو عوام۔ کورکمانڈرز اور فوج کی طرف سے بالعموم مینڈیٹ ملا ہے۔ پھر وہ جو فیصلہ کریں گے۔ اسے توثیق حاصل ہوگی۔ کیونکہ سیاسی لیڈروں کے فیصلوں میں خدشہ ہوتا ہے کہ اسے فوج مسترد کردے گی۔ بعض سفارتی حلقوں کا کہنا ہے کہ دارالحکومت دہلی کی بجائے مذاکرات کو سیاسی طور پر مشہور مقام آگرے میں لے جانا ایک پکنک کے مترادف ہوسکتا ہے۔ ایک سنجیدہ سربراہی ملاقات نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں بعض دوسرے بالخصوص مغربی سفارتی کار یہ کہتے ہیں کہ ایک عرصے سے متحارب قوموں کے درمیان پہلے مذاکرات ایسے ہی پرفضا سیاسی، مقامات پر ہوتے ہیں۔ جیسے کیمپ ڈیوڈ اور اوسلو۔ ان مذاکرات سے تناؤ ختم ہوتا ہے اور دیر تک جاری رہنے والے مذاکرات کی ابتدا ہوتی ہے۔ ان حلقوں کے مطابق دونوں ملکوں کے خارجہ محکموں خفیہ ایجنسیوں اور سفارت کاروں کے تدبر کا مسلسل یہ امتحان ہوگا۔ کہ وہ کشمیر کے حل سے متعلق مختلف ملکوں اور حلقوں کی طرف سے چلائے گئے کس فارمولے کی طرف گامزن ہوتے ہیں جن میں دریائے چناب کو مستقل سرحد بنانا۔ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی سرحد ماننا جموں کو بھارت۔ آزاد کشمیر کو پاکستان کے پاس رہنے اور کشمیر کی وادی کو خودمختار ماننا قسم کے فارمولے سفارتی حلقوں میں گشت کررہے ہیں۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ واجپائی اور مشرف کشمیر کے علاقے پر گفتگو ضرور کریں گے۔ جس میں جموں کشمیر، آزاد کشمیر لداخ اور پاکستان کے شمالی علاقے شامل ہیں۔

اشرف جہانگیر قاضی کی باتیں بروقت اور برمحل رہیں۔ اس سے پاکستانی صحافیوں کو اپنے کالم لکھنے خبریں بھیجنے۔ بھارتی میڈیا۔ رہنماؤں اور وزراء سے بات چیت کرنے کے لیے ایک سمت اور ایک بنیاد ملی ہے۔

اشوکا ہوٹل میں شریمتی این جے کرشنا کی طرف سے پاکستان میڈیا کے اعزاز میں استقبالیہ ہے یہ بھارت کی اشفاق گوندل ہیں۔ معاف کیجیے پرنسپل انفارمیشن آفیسر ہیں۔

27 برس پہلے میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میرا یہ قیام تین ہفتے تک پھیل گیا تھا۔ ہوٹل کچھ اور وسیع ہوگیا ہے۔ استقبالیہ میں سب کچھ ہے۔ ہارڈ ڈرنکس۔ سافٹ ڈرنکس۔ پرانے صحافی نئے صحافی۔

کیا امید ہے کچھ نتیجہ نکلے گا۔

کشمیر پر بات آگے بڑھے گی۔

جنگ اور 'پانچ جنیہ' کے مشترکہ مقابلے کا بھی ذکر ہورہا ہے۔

میں شملہ معاہدہ کے حوالے سے کوئی چہرہ تلاش کررہا ہوں۔ پاکستان کے ساتھیوں میں بھی کوئی نظر

نہیں آیا تھا۔ اب بھارت کے صحافیوں میں بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ اندر ملہوترہ ہیں۔ بھارت کے سینئر صحافی۔ ان سے تو ملاقات ہوئی تھی۔ شملہ کے دنوں میں ان کے کالم بہت مقبول تھے۔ ”آپ بمبئی میں میرے فلیٹ میں آئے تھے۔ عینی (قرۃ العین حیدر) بھی تھیں۔

اندر ملہوترہ بتا رہے ہیں کہ پران سبروال سخت علیل ہیں۔ ہسپتال میں داخل ہیں۔ آپ ان سے ضرور ملیں۔“

میں اندر ملہوترہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پران سبروال بہت پرانے ساتھی ہیں۔ وہ پاکستان میں صدر بھٹو کا انٹرویو کرنے آئے تھے۔ اس وقت بالٹی مور سن کے بیورو چیف ہوتے تھے۔ یہ اس اخبار کے عروج کا دور تھا۔ عالمی خبروں میں اس کا بہت ذکر ہوتا تھا۔ ہم صدر بھٹو کے خصوصی جہاز میں کراچی سے لاڑکانہ گئے تھے۔ پران سبروال بعض بین الاقوامی امور پر پاکستان کے موقف کو جائز اور بھارت کے موقف کو غلط قرار دیا کرتے تھے۔ اور برملا اس کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے پاس اس کے لیے دلائل و شواہد بھی تھے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب ہمارے ہم عصر اخبار نویس میدان میں کم رہ گئے ہیں۔ نئی نسلیں آگئی ہیں۔ اس استقبالیے میں بھی نئی نسل کا غلبہ ہے۔ ایک کرکے کنٹیال نظر آرہے ہیں۔ جو ’دی نیوز‘ کے کنسلٹنگ ایڈیٹر ہیں یہ بھی بڑے سینئر صحافی ہیں۔ ادھر جھنگ سے تعلق رکھتے تھے۔

مشروبات کا دور چل رہا ہے۔ محفل اپنے زوروں پر ہے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار بھارت کی وزیر اطلاعات شریمتی سشما سوراج آرہی ہیں۔ استقبالیے کے فوراً بعد عشائیہ ہے۔ یہ اس کی میزبان ہیں۔ ان سے تعارف ہوتا ہے تو میں انھیں کہتا ہوں کہ پاکستان میں تو حکومت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وزیر اطلاعات کے بغیر زیادہ بہتر انداز میں کام ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں کیا تجربہ ہے۔ وہ کہنے لگیں۔ بھئی میں تو یہی کہوں گی کہ وزیر اطلاعات بہت زیادہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر سرکاری کارکردگی جنتا تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔

وہ برق کی طرح کوندتی۔ ایک زمانے کو اپنے جلو میں لیے فرداً فرداً سب میزوں پر مہمانوں سے کھانے کا پوچھ رہی ہیں۔ پنجابی میں بھی بے تکلفی سے گفتگو کر لیتی ہیں انگریزی، اردو، پنجابی سب زبانیں چل رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کے صحافیوں کی دو تین نسلیں بیک وقت مصروف سخن ہیں۔ سب کو انتظار ہے صدر جنرل پرویز مشرف کی بھارت آمد کا۔

14 جولائی 2001ء

دہلی کی صبح موریہ شیریٹن کے پردوں سے جھانک رہی ہے۔ سارے ٹی وی چینل پاکستان کے صدر پرویز مشرف کی آمد آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ پالم ایئر پورٹ بار بار دکھایا جا رہا ہے۔

صبح کے اخبارات کے فرنٹ پیج پر پاکستان کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف کی آمد کی خبریں ہیں۔ آج کی پوری مصروفیات بتائی گئی ہیں۔ دہلی کی مختلف بلڈنگوں پر بھارت کے ترنگے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بھی لہرا رہا ہے۔ ان تاریخی سرکاری مقامات کی تصویروں کے رنگ سب اخباروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کہیں تو بہت زیادہ امیدیں ہیں۔ کہیں ساتھ خدشات بھی۔ کہیں احتیاط کے مشورے بھی۔ انڈین ایکسپریس نے شاعری کی ہے۔ تاریخ میں ایک ممکنہ دن کی صبح بخیر۔ دی پائنیر نے صدر پرویز کا یہ بیان شہ سرخی کے طور پر دیا ہے۔ شملہ، لاہور، بند گلیاں، ٹائمز آف انڈیا نے صدر پرویز کے ترجمان سے فون پر بات کی ہے۔ ترجمان نے کہا ہے کہ صدر پرویز، واجپائی دونوں مستقبل کی بصیرت رکھتے ہیں۔ فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے اخبارات میں پورے ایک ایک صفحے کے اشتہارات چھپوائے ہیں۔ جن میں وزیراعظم واجپائی اور صدر پرویز کی تصویروں، پاکستان بھارت کے جھنڈوں کے ساتھ یہ عزم شامل کیا ہے۔ آئیے رکاوٹیں دور کرنے کے لیے ہاتھوں میں ہاتھ دیں۔ انڈین فیڈریشن کے صدر اور پاکستان



نہرو کی سمادھی کی ایک جھلک

فیڈریشن کے صدر موجودہ اور سابقہ بھی تصویروں میں ہیں۔

اداریوں میں، کالموں میں توقعات زیادہ ہیں۔ کہیں کہیں خدشات ہیں۔ پاکستان ہائی کمیشن کی طرف سے چائے پارٹی میں آل پارٹیز حریت کانفرنس کو دعوت پر بھی اخبارات میں خوب تنقید کی گئی ہے۔

ایک اخبار نے بتایا ہے کہ راشٹرپتی بھون (ایوانِ صدر) میں گارڈ آف آنر کے لیے جس کمانڈر کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا قد اتنا بلند ہے کہ صدر مشرف کو اجازت دینے کے لیے اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھنا پڑے گا۔ کیسی کیسی الجھنیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر برادریوں، خاندانوں، قبیلوں میں ایسے ’شریکے‘ چلتے ہیں۔ مملکتوں اور قوموں کے درمیان ایسا ہونا نہیں چاہیے۔

صدر پرویز مشرف کے لیے حکومت بھارت نے جو وزیر مہمانداری مقرر کیا ہے۔ وہ بھی وزیر مملکت ہیں۔ مکمل وزیر مملکت برائے ریلوے ڈگ وجے سنگھ۔ ایک اخبار نے بتایا ہے کہ ان کے بند گلے کے نئے کوٹ آج ہی سل کر ان تک پہنچے ہیں۔

صدر پرویز دہلی ایئر پورٹ پر اتر چکے ہیں۔ پہلے یہ منظر صرف چند اخبار نویس دیکھتے تھے۔ یا فوٹو گرافر اور سرکاری ٹیلی ویژن کے اہلکار۔ اور اگلے دن اخبارات اپنی سطور میں منظر کشی کرتے تھے۔ سرکاری ٹیلی ویژن اپنے خبرنامے میں یہ منظر دکھاتا تھا۔ اب تو ملکی، غیر ملکی ٹیلی ویژن چینلوں کے ذریعے براہِ راست ساری دنیا میں اسی لمحے میں سب کچھ دکھایا جا رہا ہے۔ اخبار نویسوں کو اپنے قارئین پر سبقت حاصل نہیں رہی ہے۔ ایئر پورٹ پر وزیر مہمانداری نے استقبال کیا ہے۔ دنیا میں سربراہان مملکت ایک دوسرے کے ملک جاتے رہتے ہیں۔ ہمسایہ ملکوں میں بھی یہ تبادلے ہوتے رہتے ہیں لیکن بھارت اور پاکستان خاص ہمسایے ہیں۔ جہاں بعض سربراہان مملکت پڑوسی ملک میں گئے بغیر ہی رخصت ہو گئے ہوں گے۔ صدر ایوب نے بھی باضابطہ طور پر بھارت کا دورہ نہیں کیا تھا۔ صدر بھٹو جب آئے تو سفارتی تعلقات نہیں تھے۔ شملہ آئے تھے صدر جنرل ضیاء الحق کے دورے بھی باقاعدہ سرکاری دورے نہیں تھے۔ صدر جنرل پرویز مشرف اس اعتبار سے پہلے پاکستانی صدر ہیں۔ جنھیں دعوت دے کر بلایا گیا ہے۔ جن کا ایوان صدر میں باضابطہ طور پر استقبال ہوا ہے۔ گارڈ آف آنر کی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ بھارتی فوجی سلامی پیش کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینل، بھارتی اخبارات اس دورے کو اسی طرح اہمیت اور وقعت دے رہے ہیں جیسے امریکی صدر کلنٹن کے دورے کو دی گئی تھی۔ بعض اوقات تو معاملہ اس سے آگے بھی بڑھ جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جا کر پھولوں کی چادر چڑھانے والے بھی پہلے پاکستانی سربراہ شاید صدر پرویز ہی ہیں۔ سب کے چہرے تنے ہوئے ہیں۔ صدر پرویز کے چہرے پر متانت وقار کے تاثرات ہیں، تناؤ نہیں ہے۔ انھوں نے مہمانوں کی کتاب میں بھارت کے عوام کے لیے مہاتما گاندھی کے تدبر اور بصیرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ٹی وی چینل مناظر دکھانے کے وقفے میں ماہرین کو سامنے لے کر آتے ہیں۔ پاکستان کے ماہرین کو

بھی مختلف چینلوں نے باقاعدہ اخراجات کرکے بلایا ہے۔ ہوٹلوں میں ٹھہرایا ہے۔ ماہرین کا پسندیدہ موضوع صدر پرویز کی ''باڈی لینگویج'' ہے۔ اردو میں شاید اسے 'زبانِ حال' کہا جاتا تھا۔ ائیرپورٹ پر آمد سمادھی پر حاضری۔ پھر وزیر خارجہ، وزیر دفاع جسونت سنگھ۔ وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی۔ سونیا گاندھی سے ملاقاتوں کے دوران لباس کی تبدیلی۔ چہرے کے تاثرات، مسکراہٹیں۔ ماہرین کا موضوع ہیں۔

ملاقاتوں میں کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ باضابطہ مذاکرات تو آگرے میں ہوں گے۔ اس لیے ماہرین کا گزارا باڈی لینگویج زبان حال پر ہے۔ وزیراعظم واجپائی نے صدر پرویز کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام تاج پیلس میں کیا ہے۔ یہاں کی دعوت بھی ہمیں نہیں ہے۔ اس لیے اس کو بھی چینل پر ہی دیکھ رہے ہیں۔ شاہ رخ خان سے ملاقات سے محروم رہ گئے ہیں۔ یہاں صدر پرویز مستقل لوگوں میں گھرے رہے ہیں۔ کھانے کا موقع معلوم نہیں انھیں ملا ہے کہ نہیں۔ نہروالی حویلی کے دورے کا تذکرہ بھی اخبارات میں کئی دن سے تھا۔ پرانی دلی کے تنگ گلیوں والے علاقے میں دہلی کی انتظامیہ کو بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ سڑک کے درمیان نئے جنگلے لگائے گئے۔ مرمت، استرکاری کی گئی، نہروالی حویلی تک سرکاری مہمان پہنچنے کے لیے ایک کمرہ بھی گرادیا گیا۔ جس میں یتیم اور غریب دو بچے (بہن بھائی) رہتے تھے۔ اخبارات نے اس معاملے کو خوب اچھالا تھا۔ اپنے آبائی گھر کو کسی اور کے قبضے میں دیکھنے کا جو تجسس ہوتا ہے۔ دیکھنے کے بعد جو اذیت ہوتی ہے میں 27 برس پہلے اس سے گزر چکا ہوں۔ یادیں تو صدر مملکت کو بھی بہت آرہی ہوں گی۔ ان کی ممی نے بھی چلتے وقت تذکرے کیے ہوں گے۔ نہروالی حویلی کے اس دورے سے اس علاقے سے دلی اسمبلی کے رکن شعیب اقبال کو سیاسی طور پر ضرور فائدہ ہوگا۔ اس دورے کے لیے انھوں نے محنت بھی بہت کی ہے۔

پاکستان ہائی کمیشن کی طرف سے پاکستان ہاؤس میں استقبالیہ تو ایک عرصے سے اخبارات کا موضوع رہا ہی موسم جو صبح سے ہی کچھ بدلا تھا۔ اب کھل کر برسنے پر آگیا ہے۔ استقبالیہ کا اہتمام اس لیے بہت زیادہ احتیاط سے کیا گیا ہی۔ شامیانے قناتیں آپس میں ملی ہوئیں۔ مہمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، آل پارٹیز حریت کانفرنس کو دعوت دیے جانے کے سبب سرکار میں شامل سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں نے یہاں شرکت نہیں کی ہے۔ حریت کانفرنس کے وفد سے صدر پرویز اندر مل رہے ہیں۔ ملنے کے بعد باہر آتے ہیں تو باقاعدہ اعلان ہوتا ہے۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ پریذیڈنٹ آف اسلامک ری پبلک آف پاکستان'' ایک ہجوم ٹوٹ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ ہیں۔ سیاسی رہنما، سماجی رہنما، سابق وزیراعظم۔ سابق وفاقی وزیر لیکن بے صبر، بے ضبط۔ چائے کھانے کا سامان اُلٹ پلٹ ہورہا ہے۔ صدر پرویز کے ساتھ ہاتھ ملانے اور تصویر بنوانے کی خواہش بے چین کررہی ہے۔ بھارتی فلموں کے مشہور ہدایت کار مہیش بھٹ نے یہ دیکھ کر صدر پرویز کو سپراسٹار قرار دے دیا ہے۔

ملائم سنگھ یادیو کو ہم پہچان پاتے ہیں۔ فلمی اداکار راج ببر ہیں۔ ہمارے ٹریولنگ سیمینار کے ساتھی اور Peace Initiative کے کیرن ساہنی۔ سابق وزیراعظم وی پی سنگھ، حریت کانفرنس کے میر واعظ، علی گیلانی، شاہی مسجد کے امام بخاری۔ اور بہت سے شامیانوں اور قناتوں کا رنگ سبز اور سفید ہے۔ پاکستان کے پرچم کے رنگ بکھیرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

استقبالیے سے واپسی پر موسلا دھار بارش ہورہی ہے۔ مہمان گاڑیوں کے انتظار میں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ رش بڑھ گیا ہے۔ سانس لینے میں بھی دقت ہورہی ہے۔ بزرگ اور خواتین واپس لان میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ رش کم ہو تو آجائیں گے۔

واپس میڈیا سینٹر بھی جانا ہے۔ کچھ خبریں وغیرہ بھیج کر صدر جمہوریہ ہند کی سرکاری ضیافت میں ہم مدعو ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وزیراعظم واجپائی کی طرف سے ظہرانہ تو غیر رسمی تھا۔ یہ باضابطہ سرکاری ضیافت ہے۔ جسے انگریزی میں Banquet کہا جاتا ہے۔

اور راشٹر پتی بھون میں ہے۔ جسے انگریزوں نے اپنے وائسرائے کے لیے بنایا تھا۔ مغلوں کی بلند و بالا عمارت کے حسن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بلڈنگیں بنائی گئی تھیں۔ ہوٹل سے ایوانِ صدر تک کا راستہ طویل ہے۔ بارش بھی کہیں ہورہی ہے کہیں نہیں۔ ہم جب ایوان صدر میں داخل ہوتے ہیں تو بلند قامت چوکیدار ہمارے منتظر ہیں۔ یہیں بھارت کے سخت گیر شعلہ بیاں وزیر خارجہ۔ اور آج کل وزیر دفاع بھی' جسونت سنگھ اکیلے کھڑے نظر آتے ہیں۔

''ہیلو'' مصافحہ۔

''یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہیں۔''

''سگریٹ پینے کی عادت نے اکیلا کردیا ہے۔ اندر سگریٹ پینا منع ہے۔''

وہ بھی سگریٹ ختم کرکے ہمارے ساتھ داخل ہورہے ہیں۔ ایوانِ صدر کے اس بلند و بالا ہال میں شوکت بھی' شکوہ بھی ہے۔ مہمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ پہلے تو ہم وزیراعظم واجپائی سے ملتے ہیں۔ انٹرویو میں طویل ملاقات رہی ہے۔ اس لیے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

''خبریں کیسی جارہی ہیں''

''وہ ہم سے پوچھ رہے ہیں۔''

ہم کہتے ہیں ''بھرپور''

ہم ان سے پوچھ رہے ہیں۔ صدر پرویز سے ملنے کے بعد اب آپ کا کیا خیال ہے۔ بات آگے بڑھے گی۔

''امید تو ہے لیکن مشکل ہے۔''

میں ان سے عرض کررہا ہوں کہ پاکستان چلتے وقت میرے نواسے عدیل نے آپ سے آٹوگراف لینے کا کہا تھا۔ جو میں انٹرویو لیتے وقت بھول گیا تھا۔ اب آپ بُرا نہ مانیں تو یہ عنایت کردیں۔''

میں نے ایوان صدر کا دعوت نامہ ہی آگے بڑھادیا ہے۔ اپنا قلم بھی دے دیا ہے۔

انھوں ازراہِ کرام اپنے آٹوگراف عنایت کردیے ہیں۔

ایک اور ہمارے اور پاکستانی صحافی بھی یہاں مدعو ہیں۔ وہ بھی وزیراعظم بھارت سے دستخط لیتے ہیں۔

پھر ہم بھارت کے معمر صدر آر کے نارائن سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ وہ کسی چھوٹی ذات کے ہیں۔ بھارت والے اپنے آپ کو سیکولر دکھانے کے لیے کبھی کسی مسلمان کو صدر بناتے ہیں کبھی کسی سکھ کو۔ اور کبھی چھوٹی ذات کے لوگوں کو۔ لیکن ان کوششوں سے نہ تو ہندوؤں کا تعصب ختم کرسکے۔ نہ ذات پات کے تصور کو، بہرحال کوشش تو کرتے رہے ہیں۔ یہاں یوسف خان (دلیپ کمار) بھی اپنی بیگم سائرہ بانو کے ہم راہ موجود ہیں۔ شبانہ اعظمی اور جاوید اختر بھی ہیں۔ وزیر داخلہ، وزیر خارجہ سے بھی گپ شپ رہتی ہے۔ اپنے وزیر خارجہ جناب عبدالستار بھی ہیں اور میجر جنرل راشد قریشی بھی۔

چند لمحوں بعد بینکویٹ ہال میں جانے کی دعوت مل رہی ہے۔ نشستیں باقاعدہ مخصوص ہیں۔ ہال کے باہر نقشہ لگا ہوا ہے۔ اپنی سیٹ پہلے ہی دیکھ لیں۔ تاکہ زیادہ تردد نہ ہو۔ صدر پرویز کے ساتھ صدر نارائن کی بیگم کو جگہ دی گئی ہے۔ صدر نارائن کے ساتھ پاکستان کی خاتون اول ہیں ایک ہی بڑا ٹیبل ہے۔ جس میں مدعوئین آمنے سامنے بیٹھے ہیں میز کی درمیان میں دونوں ملکوں کے صدر آمنے سامنے ہیں۔ ایک مہمان بھارتی اور ایک پاکستانی۔ ایسی ضیافتوں کے لیے وزارت خارجہ کا شعبہ مہمانداری۔ بڑی محنت کرتا ہے۔ یہ کوشش ہوتی ہے کہ میزبان اور مہمان ایک دوسرے سے قریب ہوں۔ اجنبیت ختم کریں۔ میرے ساتھ ایک خوبرو بھارتی خاتون تلینی سنگھ ہیں۔ جو دیکھنے میں ماڈل، ٹیلی ویژن اسٹار لگتی ہیں۔ تعارف ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ ٹی وی کے لیے پروگرام بناتی ہیں اور یہاں کی مشہور کمپیئر ہیں۔ ان کے پروگرام بہت دلچسپی سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ بھی جاننا چاہتی تھیں کہ آگرہ مذاکرات سے ہماری کیا توقعات ہیں۔ پاکستان میں کیا ہورہا ہے۔ جہادی تنظیموں سے انھیں بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ ان ضیافتوں میں تمام مہمان اس وقت تک ایک دوسرے سے معروف سخن رہتے ہیں جب تک جام صحت تجویز نہ

کیے جائیں۔ اور تقریریں نہ ہونے لگیں۔

موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنیں ابھر رہی ہیں۔ کچھ دھنیں سمجھ میں آتی ہیں کچھ نہیں۔ کارڈ پر دھنوں کے نام یہ بتائے گئے ہیں۔ ''دیش راگ۔'' ''راگ ہم سادھوائی'' پیار ہوا۔'' ''اقرار ہوا'' ''میری آواز سنو'' چلتے چلتے۔''

یہ دھنیں ہلکی ہلکی بج رہی ہیں۔100 مہمانوں میں سے کتنے سن رہے ہیں۔ کتنے نہیں۔ اپنی بات چیت پر زیادہ زور ہے۔

چلتے چلتے شملہ میں بھی سنی تھی۔ یونہی کوئی مل گیا تھا۔

میزبان صدر تقریر کے لیے کھڑے ہورہے ہیں۔ خیر مقدم کرتے ہوئے یاد دلا رہے ہیں کہ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ دہلی نے اپنے ممتاز ترین فرزندوں میں سے ایک کا نصف صدی کے بعد پہلی بار آمد کس طرح پرجوش استقبال کیا ہے۔ یہ تاریخی دن یقیناً جنوبی ایشیا میں امن خوشحالی اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے آزادی کے بعد کہا تھا۔ یہ بھارت کے فائدے میں ہوگا کہ پاکستان ایک محفوظ اور خوشحال مملکت ہو۔ جس سے ہم قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم کریں۔''

قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا۔''اب چونکہ دو ڈومینین کے درمیان ایک مخلصانہ معاہدے کے تحت ہندوستان کی تقسیم ہوچکی ہے۔ ہمیں ماضی کو دفن کردینا چاہیے۔ اور یہ طے کرنا چاہیے کہ جو کچھ ہوگا اس کے باوجود ہم دوست رہیں گے۔''

سیکولرازم کا عہد کرتے ہوئے۔ شہنشاہ اکبر کو یاد کرتے ہوئے بھارتی صدر آگرے تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کل جب آپ اور بھارت کے وزیراعظم مذاکرات کے لیے اکٹھے بیٹھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ برصغیر میں ایک غریب ترین فرد کا چہرہ آپ کے سامنے ہوگا اور آپ سوچیں گے غور کریں گے کہ اس غریب اور نادار کو آپ کے فیصلوں اور گفتگو سے کس طرح فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ہر شعبے میں تعاون اور اشتراک کا ذکر کرتے ہوئے سارک کو ایک فعال تنظیم بنانے کی توقع کی جارہی ہے۔ شملہ معاہدوں اور اعلان لاہور کی یاد دلائی جارہی ہے۔ شہر آگرہ جہاں کل سے مذاکرات شروع ہوں گے۔ شہر محبت بھی ہے اور شہر رواداری بھی۔ اس کے ساتھ ہی سکندرہ ہے۔ جہاں اکبر دفن ہے کاش اس کا جذبہ کانفرنس پر غالب رہے۔

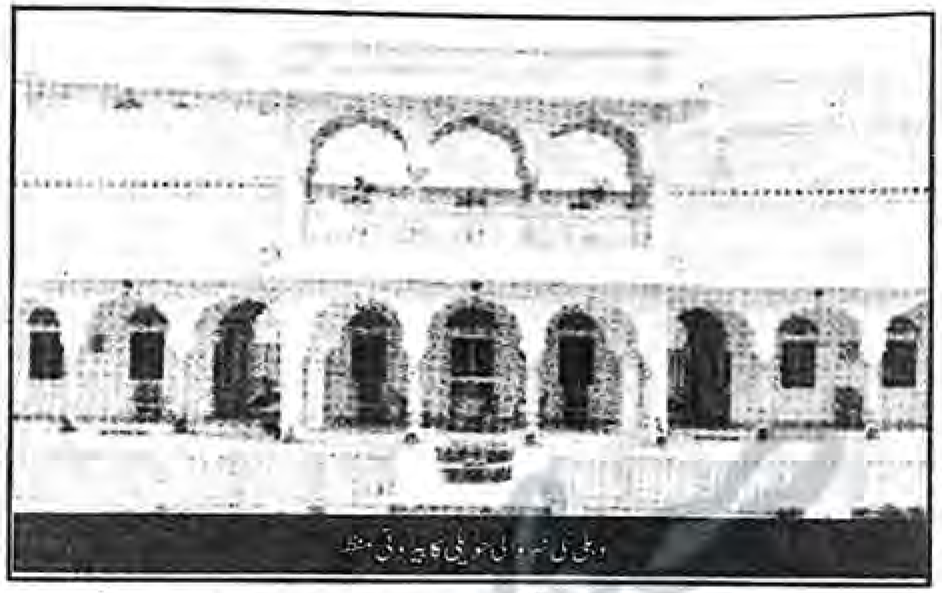
شہنشاہ اکبر۔ ہندوستان کا پسندیدہ بادشاہ رہا ہے۔ کیونکہ ان کے بقول اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہت قربت پیدا کی۔ نیا دین ایجاد کیا۔

آخر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تعاون دوستی کے قیام۔

پاکستان کے عوام کی ترقی اور خوشحالی صدر پاکستان اور بیگم مشرف کی صحت اور مسرت کے لیے جام تجویز کیا گیا ہے۔ یہ خالص شربت سے بھرا جام ہے۔ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مسلمان ملک کے مہمان ہیں۔

ان کے لیے کوئی ممنوعہ مشروب یا کھانا نہ پیش کیا جائے۔

بھارتی صدر کی تقریر تو چھپی ہوئی کتابی شکل میں ملی ہے۔ صدر پاکستان کی تقریر کے ہمیں نوٹس لینے پڑ رہے ہیں۔ صدر پاکستان اس گرمجوشی اور محبت کا شکریہ ادا کررہے ہیں جس کا اظہار ان کے خیر مقدم میں کیا گیا ہے۔ صدر بھارت کے جذبات کو سراہتے ہوئے وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اس خلیج کو پاٹنا چاہیے۔ جو دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں۔ پاکستان اور بھارت دونوں کو ہمت اختیار کرنی چاہیے۔ مسئلہ کشمیر کا سامنا کرنا چاہیے۔ اسے حل کرنا چاہیے۔ تاکہ سود مند دوطرفہ تعلقات کا نیا باب کھل سکے۔ اس مسئلے کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں ہے۔ یہ پرامن طریقے سے ہی حل ہونا چاہیے۔ یہ مسئلہ ہماری ترقی اور تعلقات کو معمول پر لانے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ نئی صدی ہماری صلاحیتوں اور ذمہ داریوں سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم عداوت اور ایک دوسرے پر شکوک وشبہات کا راستہ



چھوڑ دیں۔ ہمیں اجازت نہیں دینی چاہیے کہ ماضی ہمارے مستقبل پر حاوی رہے۔ نئی نسلیں ہم سے خوشحالی اور تعاون مانگتی ہیں۔ ایٹمی حیثیت نے دونوں ملکوں پر مزید ذمہ داریاں عائد کردی ہیں۔ ہمیں تاریخ کا قرض اتارنا چاہیے۔ دوسری قوموں نے ایسا کیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگیں ہوئی ہیں۔ خون بہا ہے۔ قیمتی زندگیاں ضائع ہوتی رہی ہیں۔

وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے بچوں کو تصادم کے مستقل سائے میں زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں۔ راستے کھلیں۔ تجارت بڑھے۔ ذہنی رویے بدلیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان قیام امن۔

بھارت کے عوام کی ترقی۔ بھارت کے صدر اور ان کی بیگم کی صحت کے لیے جام تجویز کررہے ہیں۔

تقریریں ہوچکیں۔ اب کھانے کے دور چل رہے ہیں۔ گفتگو ہورہی ہے۔

ہم راشٹر پتی بھون سے رخصت ہورہے ہیں۔ یوسف خان، سائرہ بانو ساتھ ہیں۔ لاہور۔ کراچی کا ذکر ہورہا ہے۔ قتیل شفائی کے انتقال سے انھیں دکھ پہنچا ہے۔ ان سے ان کا بہت طویل ساتھ رہا ہے۔

مجھے پہلے ہوٹل پہنچنا ہے۔ وہاں سے پرانی دلی میں مشاعرے میں جانا ہے۔ یہ امن دوستی کے نام ایک شام ہے۔ پہلے خبریں۔

پرانی دلی۔ یہاں صبح صدر پاکستان اپنی آبائی حویلی دیکھ کر گئے ہیں۔ وی پی سنگھ مشاعرے میں شرکت کرکے جاچکے ہیں۔ وہ اپنی خرابی صحت کے باعث زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ میں ایوان صدر میں ضیافت کے باعث سب سے آخر میں پہنچا ہوں۔ اس لیے اکثر شعراء کا کلام سننے سے محروم رہا ہوں۔ بدقسمتی میری ہے مشاعرے کے مہمان خصوصی سابق وزیراعظم وی پی سنگھ جو خود بھی شعر کہتے ہیں۔ بھارت کی تاریخ میں وی پی سنگھ اپنی شرافت، حلیم الطبعی کے باعث بہت زیادہ محترم ہیں۔ مشاعرے کی صدارت پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی کررہے ہیں۔ وہ اردو کے عشاق میں سے ہیں۔ بھارت سے حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر بشیر بدر، محمود سعیدی، ساغر سعیدی، حیات لکھنوی، رفعت سروش، افضل منگلوری اور پاپولر میرٹھی۔ نور جہاں ثروت، غالب رامپوری، طاہر فراز، نعمان شوق، مظفر ازلی، کفیل آذر، ریحانہ شاہین شامل ہیں۔ پاکستان سے احمد فراز ہیں۔ اظہر جاوید اور منور سلطانہ۔

سب سے بڑے معتبر نام ہیں۔ قابل احترام۔ سامعین بھی باذوق ہیں۔ میں غالب، ومیر کی دلی میں پہلے مشاعرے میں شریک ہورہا ہوں۔ ویسے تو جب بھی آیا ہوں۔ نشستوں میں تو کلام سنایا ہے۔ اردو کے مرکز۔ ثقافت تمدن کے گڑھ دلی میں شعر سننا۔ سنانا یقیناً ایک سعادت ہے۔ شعیب اقبال صاحب، اس شام کے میزبان ہیں۔ دن میں وہ صدر پاکستان کے میزبان تھے۔

☆☆☆☆

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اِس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

میرے اپنے



حنا بشریٰ

اُس شخص کا فسانہ عبرت، جسے اپنے بیٹوں پر بہت مان تھا

زندگی میں رشتوں کا ہونا جتنا لازم ہے اتنا ہی لازم ہے رشتوں کی محبت ہونا۔ زندگی میں من چاہے رشتوں کی محبت شامل نہ ہونے کی جو اذیت ہوتی ہے۔ وہ میں اس اولڈ ہوم میں گزارے ایک ایک پل میں محسوس کرتا ہوں۔ اس جگہ گزارا ایک ایک لمحہ مجھے اپنی ناانصافیاں، اپنے گناہ اور اپنی ناجائز چاہتوں کی یاد دلاتا ہے۔ اور میں ندامت سے زمین میں گڑ سا جاتا ہوں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھار میں سوچنے لگتا ہوں کہ مجھ جیسے انسان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اس سے بھی برا۔ مجھے اپنی ناانصافیوں کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میں نے جو رشتوں سے بلاوجہ نفرت کی، انہیں ہر پل اذیت میں رکھا۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ سچ ہے جو آج میں اذیت میں ہوں۔ مگر میں کیوں اذیت میں ہوں؟ یہ سوال اور اِس کا جواب میرے لیے تو انجان نہیں مگر آپ کے لیے ہے۔ اِسی لیے تو آپ کو اپنے اس سوال کا جواب بتانا چاہتا ہوں تا کہ آپ وہ غلطی نہ دہرائیں، آپ وہ گناہ نہ کریں جو مجھ سے سرزد ہوا تھا۔ آج سے تیس سال پہلے......

......☆☆☆......

آج سے تیس سال پہلے میں چوبیس پچیس سال کا ایک نوجوان تھا۔ مجھے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کیے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اور پچھلے ڈیڑھ سال سے میں ایک نجی ادارے میں ملازمت کر رہا تھا۔ جب سے میری نوکری لگی تھی، میرے گھر والے میری شادی کے خواہش مند ہو گئے تھے۔ میں انہیں ٹالتا رہتا مگر جب نوکری کرتے ہوئے ڈیڑھ برس ہو گیا تو مجھے لگا کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے گھر والوں کو اجازت دے دی اور اس کے بعد گھر والوں نے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ میری اماں چاہتی تھیں کہ لڑکی کسی بہت اونچے گھر سے ہو۔ ابا اپنی بھتیجی کے خواہش مند تھے۔ لیکن تایا کے گھر کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ میری دو عدد شادی شدہ بہنیں بھی امی کی ہم خیال تھیں اور بھائی اس سارے قصے سے لاپرواہی رہتا تھا۔ میرے اپنی ہونے والی بیوی کے بارے میں کوئی خاص خیال نہ تھے۔ مجھے اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لڑکی امیر ہو یا غریب۔ بہرحال تقریباً آٹھ نو مہینوں کے بعد سب گھر والے ایک لڑکی پر متفق ہو ہی گئے۔ لڑکی والے نہ تو بہت زیادہ امیر تھے اور نہ ہی زیادہ غریب۔

چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور صائمہ میری بیوی بن کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری بیوی اچھی تھی، اچھے خیالات کی مالک اور کافی خوب صورت تھی۔ وہ کافی فرمانبردار قسم کی بیوی تھی۔ میری ہر بات مانتی تھی۔ مجھ سے بہت ڈرتی تھی۔ میں اُس پر غصہ بھی کر لیتا تو چپ رہتی تھی۔ جوابی وار نہیں کیا تھا اس نے۔ شادی کے کچھ عرصے کے بعد جب میری ملازمت چلی گئی تو میں اُن دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی غصہ کرنے لگتا تھا۔ میرا سارا غصہ، ساری تلخ مزاجی کا نشانہ میری بیوی ہی بنتی تھی۔ اُن ہی دنوں میں اس خبر کا ملنا کہ میں باپ بننے والا ہوں، مجھے



سرشار کر گیا۔ میں نے آنے والے وقت کے کئی سپنے دیکھ ڈالے۔ مجھے بیٹے کا بے حد شوق تھا۔ اور میں ہر بار اپنی بیوی کو کہتا کہ مجھے بیٹا چاہیے۔ میرا پہلا بیٹا ہوگا۔ تو میرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔ میں بھی اپنے ماں باپ کا پہلا بچہ تھا۔ اور میری پیدائش نے میرے ماں باپ کو جس فخر میں مبتلا کیا تھا اُس فخر سے انہوں نے مجھے اچھی طرح واقف کروا رکھا تھا۔ اسی لیے میری دلی خواہش تھی کہ میرا پہلا بیٹا ہو۔ بلکہ پہلا ہی کیوں میں تو چاہتا تھا میرے صرف بیٹے ہی ہوں۔

ان دنوں میں چند چھوٹی موٹی ملازمتیں میں کرتا رہا۔ میری تنخواہ بہت کم تھی۔ لیکن میں اپنی خواہش کے زیر اثر اکثر اوقات آنے والے بچے کے لیے کھلونے لے کر آتا۔ ایسے کھلونے جن سے صرف لڑکے ہی کھیل سکتے ہیں۔ میں ننھے منے کپڑے بھی لے آتا۔ اِن کپڑوں اور کھلونوں کو دیکھ کر جب کبھی میرے گھر میں سے کوئی کہتا کہ اگر میرے یہاں پہلی بیٹی ہوگئی۔" تو میں ناراض ہو جاتا۔ میری خفگی کا کوئی عالم نہ ہوتا کیونکہ مجھے بیٹا چاہیے تھا۔ بیٹے کے لیے میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ ایک دن میری خواہشات کا محل زمین بوس ہو گیا۔ میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔

پہلے پہل تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد میں نے وہ ہنگامہ کیا کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اپنی بیوی کو بے بھاؤ کی سنائیں اور اپنی بیٹی کو اک نظر دیکھا تک نہیں اور سارے کھلونوں، سارے کپڑوں کو جو میں وقتاً فوقتاً لے کر آتا رہتا تھا آگ لگا دی۔ میری بیوی دم بخود تھی۔ میرے جنون سے واقف تھی مگر اُسے شاید مجھ سے اس دیوانگی اور اس بے رحمی کی اُمید نہیں تھی۔ بہر حال بیٹی پیدا ہونے کے دو دن بعد مجھے اچھی نوکری مل گئی۔ لیکن میں نے پھر بھی احساس نہ کیا کہ بیٹی جیسی رحمت جونہی میرے گھر میں آئی مجھ پر خدا کا خاص کرم ہو گیا۔ میری بچی جس کا نام بھی میں نے رکھنا گوارا نہ کیا تھا۔ وہ جب بھی روتی تو میں گھر سے نکل جاتا۔ مجھے اُس کی آواز سے چڑ ہونے لگی۔ میں بیٹی ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی کو ذہنی طور پر ٹارچر کرتا، اُسے طعنے دیتا، کئی بار میں نے اُس پر ہاتھ بھی اُٹھایا۔ جس بات پر آج تک میں پچھتا رہا ہوں۔

خیر فضا (میری بیٹی) جب کچھ مہینوں کی تھی۔ شاید تب میں دوبارہ باپ بننے والا تھا۔ میں نے ان دنوں کسی قسم کی کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ میرے اندر بس عجیب سا خوف تھا۔ اگر میری دوسری بیٹی ہوگی تو میرا سر اور نیچے ہو جائے گا۔ لیکن اس بار میری سوچوں اور میرے خیالوں کے برعکس بیٹا ہوا۔ جونہی مجھے خبر ملی میں خوشی سے جیسے پاگل سا ہو گیا۔ میری خوشی کا کوئی عالم ہی نہ تھا۔ میری خواہش پوری ہو گئی تھی۔ میں بے چین تھا کہ کب میں اپنے بیٹے کی شکل دیکھ سکوں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے یہ خبر ملی کہ میری بیوی اس دنیا میں نہیں رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کو اندھیرا آیا۔ کافی دیر میں گم سم سا رہا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ کافی دنوں سے میری بیوی کی طبیعت انتہائی خراب رہتی تھی۔ لیکن میں نے توجہ ہی نہیں دی۔ ابھی میں ان سوچوں میں ہی غلطاں تھا کہ نرس نے آ کر مجھے میرا بچہ تھما دیا۔ بچے کو دیکھتے ہی میں جیسے ہر بات بھول گیا۔ میں بس اُسے پیار سے تکتا رہا۔ اُس کا ہر نقش مجھے اپنے جیسا لگتا۔

پھر میری بیوی کے گھر والے آ گئے تو مجھے مجبوراً اپنے بچے کو اپنی ماں کو دینا پڑا۔ میری بیوی مر چکی تھی۔ مجھے پھر سے یاد آ گیا۔ اپنی بیوی کی آخری رسومات کے وقت بھی اپنے بچے کی فکر میں ہلکان رہا۔ میری بچی اپنی ماں کی آغوش کے لیے کس طرح بلک رہی تھی مجھے احساس ہی نہ تھا۔ وہ معصوم سی بچی ماں کے لمس کے لیے بے قرار تھی اور مجھے نہ تو اُس کا کوئی خیال تھا اور نہ ہی اپنی بیوی کے مرنے کا کوئی خاص دُکھ۔ میں نے اپنی زندگی میں اُسے کوئی خاص اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ ہر وقت تو طنز کے تیر چلاتا تھا۔ اور اس کو بے وقعت کر دیتا تھا۔ وہ مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے گئی تھی۔ اس سے بڑی میرے لیے اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ میری بے پروائی اور سنگ دلی کو دیکھ کر میرے سسرال والوں نے بات کی لیکن میں نے اُن کو خاموش کروا دیا۔

☆......☆......☆

زندگی معمول پر آنے لگی۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام دانیال رکھا۔

میں اُس کے لیے ہر قسم کے کھلونے، کپڑے وغیرہ لاتا۔ لیکن میری بیٹی میرے پیار کے ساتھ ساتھ ان

چیزوں سے بھی محروم رہتی۔ میری ماں نے مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ انہیں لگتا تھا شاید دوسری شادی کے بعد میرے مزاج میں کوئی فرق پڑے اور دوسرے بات یہ کہ آنے والی میرے بچوں کو بھی سنبھال لے گی۔ میں نے ان کی دوسری بات پر غور کیا، اور ان کے مجبور کرنے پر میں نے دوسری شادی کر لی۔ لیکن دوسری شادی نے میرے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی۔

میری دوسری بیوی ذرا تیز مزاج کی تھی۔ آئے دن میری اور اُس کی تلخ کلامی ہوتی۔ میری پہلی بیوی کی بہن کبھی کبھار دوسرے شہر سے ہمارے گھر آتی اور میری بیٹی کو تحائف وغیرہ دے جاتی۔ وہ بے اولاد تھی۔ وہ فضا کے ساتھ میرے سلوک سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک بار وہ آئی تو اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ فضا کو گود لینا چاہتی ہے۔ پہلے پہل تو مجھے سمجھ نہ آئی کہ میں کیا جواب دوں۔ پھر میں نے سوچ بچار کر کے اُس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اور فضا کو اُس کے حوالے کر دیا۔ فضا اس وقت تین سال کی تھی۔ وہ فضا کو لے کر دوسرے شہر چلی گئی۔ جہاں اُس کا سسرال تھا۔ اور میرے گھر میں صرف میرا فخر، میرا غرور میرا بیٹا دانیال رہ گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میری دوسری بیوی کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ اُن کے نام بھی میں نے رکھے۔ بڑے کا صمد اور چھوٹے کا اشعر۔ دو اور بیٹوں کو پا کر میرے غرور میں تھوڑا اور اضافہ ہوا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی اور بیٹے میرے پاس ہی چھوڑ گئی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ ازدواجی زندگی کا سکھ میرے نصیب میں نہیں تھا۔ تبھی میں نے آگے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس تین تین بیٹے تھے۔ تینوں بیٹے ہی میرے بہت لاڈلے تھے۔ میں اُن کے لاڈ اٹھاتا، ان کی ہر جائز اور ناجائز خواہشات پوری کرتا۔ میں اکثر اوقات ان کو باہر گھمانے لے جاتا۔ وہ مجھ سے کوئی بھی فرمائش اگر کر لیتے تو میں اس بات کی بھی پروا نہ کرتا کہ میں کتنا تھکا ہوا ہوں۔ فوراً سے اُن کی فرمائش پوری کرتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میرے بچے بڑے ہوتے گئے۔ میرے تینوں بچوں میں بے حد یگانگت تھی۔ اور انہوں نے میرے معاملے میں بھی بے حد یگانگت ظاہر کی۔

میرا بڑا بیٹا دانیال جب چوبیس سال کا ہوا تو میں نے اُس کی شادی اپنی بھانجی کے ساتھ کر دی۔ اس کے نکاح کے وقت میں نے اپنے دوسرے بیٹے صمد کی منگنی اپنے دوست کی اکلوتی بیٹی سے طے کر دی۔ جس دن میرے بیٹے کی شادی تھی اس دن میری بیٹی مجھ سے ملنے آئی تھی۔ زندگی میں اتنے سالوں کے بعد وہ پہلے بار مجھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ اپنی شادی کا کارڈ اپنے باپ یعنی مجھے دینے آئی۔ اُس کی خالہ نے اس دن مجھے حقیقت بتائی کہ فضا سب کچھ جانتی ہے کہ اُس کا باپ کون ہے۔ اور وہ اُس کی خالہ ہے۔ اُس کے سسرال والوں نے فضا کے سامنے اس بات کو راز نہیں رہنے دیا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ نائمہ (فضا کی خالہ) بھی یہی چاہتی تھی۔ کہ فضا کو ساری حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔ بہر حال میں نے اس سے صرف چند منٹ بات کی، کارڈ لیا اور آنے کا گول مول سا وعدہ کر کے اٹھ گیا۔ کیونکہ دانیال کا نکاح ہونے والا تھا۔

اپنی بیٹی کی آنکھوں میں اُبھرتے آنسو مجھے اس وقت نظر تو آئے لیکن میں نے غور نہیں کیا۔ مگر آج کل اس اولڈ ہوم میں گزارتے ہر پل میں مجھے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو یاد آ جاتے ہیں۔ اور میں بے آواز روتا رہتا ہوں۔

اسی طرح دانیال کی شادی اور صمد کی منگنی ہو گئی۔ میرا خوشی سے برا حال تھا۔ میں خوش تھا بے حد خوش تین چار سالوں کے اندر اندر میرے دوسرے بیٹوں کی بھی شادی ہو گئی۔ تینوں بیٹے اور میں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے تینوں بیٹوں میں اتحاد تو تھا ہی لیکن کبھی کبھار ہلکی پھلکی نوک جھونک ہو جاتی تو میں صلح کروا دیتا۔

ان دنوں میری صحت گرنے لگی۔ میں نے نوکری چھوڑ دی۔ کیونکہ صحت کی خرابی کی وجہ سے اب مجھ سے کام نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جونہی نوکری چھوڑی میرے بیٹوں کا رویہ مجھ سے تبدیل ہوتا چلا گیا۔ وہ مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ اکثر اوقات وہ میرے منہ پر کہہ دیتے کہ میں نے نوکری چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اور مجھے دوبارہ سے کوئی نوکری ڈھونڈ لینی چاہیے کیونکہ وہ میرا خرچ نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن کے اپنے گھروں کا خرچہ ہی بہت زیادہ ہے۔

اُن کی اس قسم کی باتیں سُن کر میں حیرت زدہ سا رہ جاتا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کیا کہوں جن بچوں پر ساری عمر میں نے خرچ کیا وہ آج میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے تھے۔

میں ان دنوں چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ صحت کی خرابی اور بیٹیوں کی باتوں نے مجھے کافی حد تک خاموش کر دیا تھا۔ میرا وجود ایک بے کار چیز کی طرح گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ اور میں سوچوں میں گھرا رہتا۔ اُن دنوں مجھے اپنی مری ہوئی بیوی اور بیٹی اکثر یاد آنے لگیں۔ انسان کو جب وہ لوگ اکیلا چھوڑ دیں جن سے وہ محبت کرتا ہو تو اسے وہ لوگ یاد آنے لگتے ہیں۔ جن کو وہ چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ اور جو اُس سے محبت کرتے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی خسارے کا سودا کیا تھا۔ آگ میں ہاتھ ڈال کر یہ سوچا تھا کہ میرے ہاتھ نہیں جلیں گے۔

میری صحت گرتی جا رہی تھی۔ رات کو میں تکلیف سے اگر کسی کو آواز دیتا تو جس جھنجلاہٹ سے کوئی میرے پاس آتا تو میں خود ہی شرمندہ ہو جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف بھی ختم ہوگئی۔ اب میں آوازیں بھی دیتا رہتا تو کوئی میرے کمرے میں جھانکنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتا۔ اور پھر اُن لوگوں کو میرا وجود کھٹکنے لگا۔ اُن کو احساس ہونے لگا کہ میں نے گھر کے ایک بڑے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اسی سوچ کے زیر اثر کہ میرے وجود کی اس گھر کو کوئی ضرورت نہیں ایک دن میرے تینوں لاڈلے بیٹے، وہ بیٹے جن کی پرورش پر، میں نے دن اور رات ایک کر دیے تھے، جن کی خواہش میں، میں نے اپنی بیٹی کی بھی پروا نہیں کی۔ اُس کو بے عزتی سمجھا۔ وہی جان سے پیارے بیٹے مجھے شہر کے ایک اولڈ ہوم میں چھوڑ گئے۔ اُسی اولڈ ہوم میں جہاں میں آج کل اپنی زندگی کے بچے کھچے دن گزار رہا ہوں۔ جہاں ہر پل میں ہوں اور میرے ساتھ میرے ماضی کی تکلیف دہ یادیں۔

میں ماضی کی تلخ یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ مگر انسان اپنے گناہ سے کہاں پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ میں نے حقوق العباد میں کوتاہی کی تھی جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ میں نے خدا کی رحمت 'بیٹی' کو جانے کیا کیا سمجھا، اُسے اپنے لیے بے عزتی کا باعث جانا، اُسے اپنی عزت میں کمی کا باعث سمجھا اور جن کو میں نے اپنا غرور جانا وہ آج میرا سر نیچا کر گئے۔ میں نے اپنی بیوی کو جتنا آزار پہنچایا، جتنی تکلیف دی۔ اس اولڈ ہوم میں گزارے ہر پل میں مجھے وہ لفظ، وہ طعنے یاد آتے ہیں جو میں نے اپنی بیوی کو بیٹی ہونے کی پاداش میں سنائے تھے۔ میں نے اپنی دوسری بیوی سے مصالحت کی کوشش بھی نہیں کی اور اُسے طلاق دے دے۔ ایک قبیح فعل میں نے سر انجام دیا۔ میں حساب لگانا چاہتا ہوں مگر نہیں لگا سکتا کہ میں نے زندگی میں کتنے قبیح فعل، کتنے غلط کام کیے۔ میں نے اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھا۔ اپنی بیوی کو ذہنی اور جسمانی تکلیف دی۔ اپنی دوسری بیوی کو طلاق دی۔ اپنے بیٹوں کو ہر پل میں نے یہ احساس دلایا کہ وہ میرے لیے فخر کا باعث ہیں، وہ میرا غرور ہیں۔ وہ صحیح کریں یا غلط میں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہوں گا۔ اُن کا ہر کام میرے لیے صحیح رہے گا۔ کیونکہ وہ میرے بیٹے ہیں۔ وہ بیٹے کہ جن کی کوئی غلطی، کوئی گناہ، گناہ نہیں سمجھا جاتا مجھ جیسے ماں باپ کی نظر میں۔ اُن میں، میں نے اتنا فخر پیدا کر دیا کہ اُسی غرور اور فخر کے زیر اثر انہوں نے مجھے اس اولڈ ہوم میں داخل کرواتے ہوئے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کہ میں نے اُن کی پرورش میں دن رات ایک کر دیے تھے۔ اُن کی ہر جائز اور ناجائز خواہشات میں نے پوری کی تھیں۔ اور آج جب میں وہ ضروریات اور وہ خواہشات پوری کرنے کے قابل نہیں رہا تو انہوں نے ایک بے کار چیز کی طرح مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں نے ساری عمر جن لوگوں سے اندھی محبت کرنے میں گزار دی اُنہی لوگوں نے مجھے محبت تو کیا ہمدردی کے دو بول کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ اس اولڈ ہوم میں وقت گزارتے مجھ جیسے اور لوگ جب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مجھے یہاں کون چھوڑ گیا ہے۔ تو میں بس چپ چاپ اُن کے چہروں کو تکتا رہتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کو کیا جواب دوں۔ کیا یہ بتاؤں کہ وہ بیٹے مجھے اس اولڈ ہوم میں چھوڑ گئے ہیں جن کو میں نے اپنے سر کے اونچا ہونے کا سبب جانا۔ یا پھر یہ بتاؤں کہ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔

☆☆☆

دوسری ہرذ کہانی

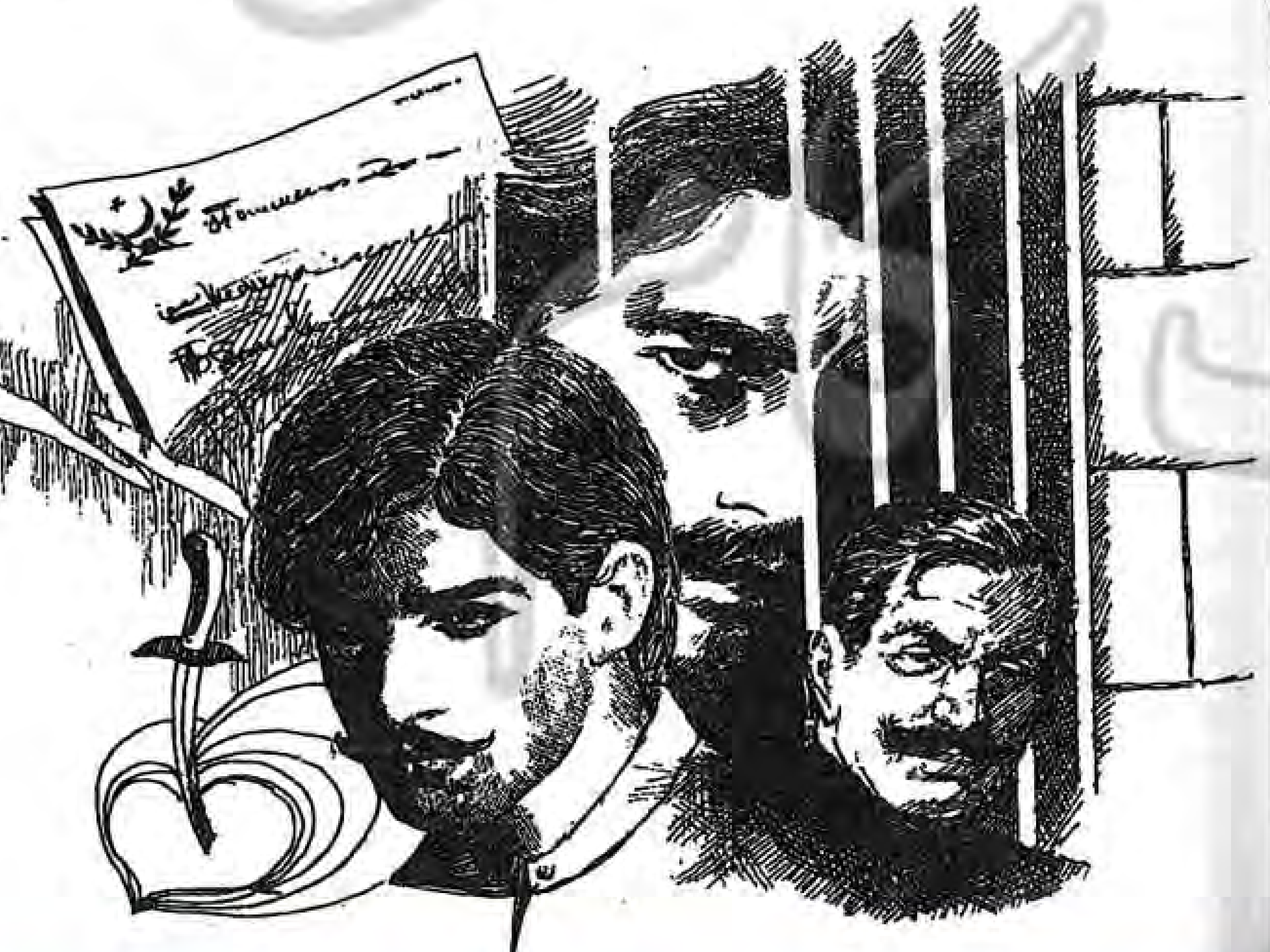
قاتل



مقصود احمد بلوچ

اُس بھائی کی کہانی جس نے محبت کرنے والے بھائی کی ہی جان لے لی

تنویر احمد پندرہ سال فوج کی نوکری کرنے کے بعد ریٹائرڈ تھا۔ تنویر بچپن ہی سے بہت نیک اور اچھا انسان تھا۔ تنویر کے علاوہ اس کے تین بھائی اور بھی تھے۔ دو بھائی جو بڑے تھے وہ کراچی میں رہتے تھے۔ اور تنویر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ تنویر کے اس چھوٹے بھائی کا نام کامران تھا۔ سب



سے حیران کن بات یہ تھی کہ تنویر کے تینوں بھائیوں نے شادی کرلی تھی۔ لیکن تنویر آرمی کی سروس مکمل کرنے کے بعد بھی اپنی شادی نہ کرسکا اور شاید وہ شادی کرنے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔ جب بھی تنویر کے دوست احباب پوچھتے کہ تنویر آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

چھوڑو یار شادی میں کیا رکھا ہے۔ آپ لوگوں نے تو کرلی ہے۔ بس مجھے نہیں کرنی شادی۔"

اس کی یہ بات سن کر اس کے دوست خاموش ہوجاتے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تو فارغ رہا۔ لیکن بہت ہی جلد اُسے پاکستان ٹیلی ویژن میں بطور سیکورٹی گارڈ کی نوکری مل گئی۔ تنویر وہاں پر اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔ وہ جو بھی پیسہ کماتا یا اس کو پنشن وغیرہ ملتی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی کامران کو دیتا۔ کامران کی شادی ہوگئی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔

تنویر اپنے بھائی کامران اس کے بیوی بچے سے بہت محبت کرتا اور ان کا ہمیشہ خیال رکھتا۔ اس کا چھوٹا بھائی کامران کوئی کام وغیرہ نہیں کرتا تھا۔ سارا سارا دن جُوا کھیلتا۔ تنویر نے اسے بہت سمجھایا کہ تم اپنے بیوی بچوں کا خیال رکھا کرو۔ یہ کام غلط ہے اُسے چھوڑ دو۔" لیکن کامران نے کسی کی بات پر بھی کوئی عمل نہ کیا۔ خیر وقت کی سوئیاں اپنی رفتار سے چلتی رہیں۔

اب تنویر کو سیکورٹی گارڈ والی جو نوکری ملی تھی۔ اس میں بھی اس کی سروس پوری ہونے والی تھی۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور اس نے شادی نہ کی۔ گاؤں کے لوگوں نے بھی اسے کہا مگر اس نے کسی کی بھی نہ مانی۔ کراچی میں جو اس کے دو بڑے بھائی رہتے تھے وہ بھی وقتاً فوقتاً گاؤں میں چکر لگا لیتے تھے۔ اور ان دونوں کی خیر خبر لیتے تھے۔

اب تنویر عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا تھا جس سے آگے وہ سروس نہیں کرسکتا تھا۔ ساٹھ سال عمر کے بعد اسے یہاں سے بھی پنشن مل گئی۔ نوکری ختم ہونے کے بعد تنویر کو بہت ساری رقم ملی۔ اور وہ پہلے بھی پنشن لیتا تھا۔ تنویر نے ساری رقم بینک میں جمع کروادی۔ اور تھوڑے سے پیسے اپنے پاس رکھ لیے۔ تنویر کے چند دوستوں نے تنویر کو مشورہ دیا کہ آپ کی جو جمع شدہ رقم ہے۔ اس میں سے آدھی رقم کا اپنا ایک اچھا سا گھر بنالو کیوں کہ شادی تو آپ نے کی نہیں ہے۔ چلو اپنے اور بھائی بھابی کے رہنے کے لیے ایک خوبصورت سا گھر ہی بنالو۔"

تنویر اپنے دوستوں کی بات پر عمل کرتے ہوئے ایک بہت ہی خوبصورت گھر بنوایا۔ اور اس گھر میں تنویر اس کا بھائی کامران اور اس کی بیوی رہنے لگے۔ زندگی بہت ہی اچھی طرح سے گزر رہی تھی۔ تنویر کا بھائی کامران انتہائی لالچی قسم کا انسان تھا۔ کامران نے اپنے بھائی تنویر سے کچھ پیسوں کا مطالبہ کیا۔ لیکن تنویر نے کہا میں اتنے زیادہ پیسے آپ کو نہیں دے سکتا ہوں کیونکہ اُسے پتا تھا کہ جُوا کھیلتا ہے۔ اس لیے تنویر نے اُسے کچھ بھی نہ دیا۔

کامران کی ضد ہر روز بڑھنے لگی۔ وہ ہر وقت تنویر کو تنگ کرتا رہتا۔ اور ہر وقت گھر میں لڑائی جھگڑا کرتا رہتا۔ ایک دن تنویر اپنے اس بھائی سے تنگ آکر اس کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے دوسروں بھائی کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا جو کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ تنویر اپنا گاؤں چھوڑ کر کراچی کی بس میں سوار ہوگیا تھا۔

جب تنویر کے بھائی کامران کو پتا چلا کہ اس کا بھائی گھر چھوڑ کر کراچی جارہا ہے تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور کچھ دیر میں لاری اڈا پہنچ گیا۔ اور وہ بس جس میں اس کا بھائی تنویر سوار تھا وہ آہستہ آہستہ لاری اڈا چھوڑ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ کامران نے جلدی سے بس میں بیٹھے ہوئے اپنے بھائی کو نیچے اتارا اور اسے کہا بھائی پلیز آپ کراچی مت جاؤ میں آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی رقم مانگوں گا۔ بس آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔"

کامران اپنے بھائی کو راضی کرکے واپس گھر لے گیا۔ لیکن تنویر کو کیا پتا تھا کہ اس کا بھائی اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ اس طرح دو سے تین دن گزر گئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایک رات تنویر اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اور دوسرے کمرے میں اس کا بھائی کامران اور اس کے بیوی بچے تھے۔ آدھی رات کا ٹائم تھا کامران اپنے بنائے ہوئے پلان کے مطابق اپنے کمرے سے اُٹھا اور تنویر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جس کمرے میں

اس کا بھائی سویا ہوا تھا۔ کامران نے اپنے سوئے ہوئے بھائی کا گلا دبا دیا۔ وہ بیچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس ظالم کو ذرا بھی ترس نہ آیا اپنے بھائی کو مارتے ہوئے۔ جب کامران نے اپنے بھائی کو مارا تو یہ ماجرا اس کی بیوی بھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے کافی روکا کہ آپ اس طرح نہ کرو تمہارے ساتھ تمہارا بھائی کتنا اچھا ہے۔ لیکن اس کے دل میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اس کے مارنے کے بعد میں ساری رقم کا مالک خود بن جاؤں گا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا اگر تم نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا نہ تو میں تم کو بھی جان سے ماردوں گا۔" بھائی کو مارنے کے بعد اسی گھر میں باہر صحن میں اس نے گہرا گڑھا کھودا اور اپنے مرے ہوئے بھائی کو اٹھا کر اس گڑھے میں دبا دیا۔ اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ سارا کام اس نے راتوں رات کیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اپنے گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی کہ اس کا بھائی گم ہوگیا ہے۔ اور ساتھ کراچی میں جو اس کے دو بڑے بھائی رہتے تھے ان کو بھی بتا دیا کہ تنویر گم ہوگیا ہے۔

وہ صبح سے بازار گیا تھا لیکن پھر وہاں سے لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے بھائی بھی یہ خبر سن کر کافی پریشان ہوئے کہ آخر تنویر کہاں چلا گیا۔ انہوں نے بھی کافی تلاش کیا اور ساتھ گاؤں والوں نے بھی اس بات کو تین مہینے بیت گئے۔ لیکن تنویر کو اس کے بھائی تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ کیونکہ تنویر زندہ ہوتا تو ملتا۔ وہ تو بے چارہ کب کی ابدی نیند سو گیا تھا۔ ان تین مہینوں کے درمیان اس کے گاؤں میں ہر طرح کا عذاب جاری رہا۔ ایک تو بارش اتنی ہوئی کہ لوگوں کے گھر تک گر گئے۔ پورے گاؤں کے لوگ بیمار ہوگئے۔ اس گاؤں کا چین سکون برباد ہوگیا۔ پورے گاؤں کے لوگ پریشان حال تھے۔ بڑی عمر کے بزرگ بار بار بس ایک ہی بات کرتے تھے کہ اس گاؤں میں جو عذاب چل رہا ہے اس عذاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس گاؤں میں کوئی ناحق قتل ہوا ہے۔ اور یہی بات سچ ہے۔ خیر جب اس بات کو تین ماہ سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تو کامران کی بیوی نے اپنے ماں باپ کے گھر جا کر یہ بات بتا دی کہ تنویر کو قتل کرنے والا اس کا اپنا ہی بھائی اور میرا شوہر کامران ہے۔ پھر اس نے یہ ساری تفصیل اپنے والد اور بھائی کو بتا دی۔ انہوں نے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کروا دی اور ساتھ ہی کراچی والے بھائیوں کو بھی اطلاع کردی کہ وہ ایک دفعہ گاؤں آجائیں۔

دوسرے دن پولیس کامران کے گھر پہنچ گئی۔ اور کامران سے پوچھا کہ تنویر کو کہاں قتل کیا تھا۔" وہ پہلے تو خاموش رہا۔ پھر کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس کی بیوی بول پڑی۔

"یہ کیا بتائے گا کہ اس نے کہاں اور کیسے قتل کیا۔ میں خود بتا دیتی ہوں۔ پورا گاؤں اور اس کے بھائی جو کراچی سے آئے تھے وہاں موجود تھے۔ کامران کی بیوی نے پولیس کو بتایا کہ تین ماہ پہلے رات کے وقت میرے شوہر نے دوسرے کمرے میں جا کر اپنے بھائی تنویر کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے اسے بہت منع کیا روکا۔ لیکن کامران نے مجھے کہا کہ اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں پہلے تجھے طلاق دوں گا اور ساتھ ہی گولی ماردوں گا۔ ڈر کے مارے اس وقت میں خاموش ہوگئی اور اپنے بچے کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔" کامران کی بیوی کی یہ بات سن کر سب لوگ حیران پریشان ہوگئے کہ کس طرح ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کردیا۔

اور ساتھ ہی اس کی بیوی نے اس جگہ کی نشاندہی کردی کہ وہ اس جگہ دفن ہے۔ پولیس والوں نے اس جگہ کی کھدائی کی تو تنویر کی لاش مل گئی۔ پولیس نے اسی وقت کامران کو گرفتار کرلیا۔ اور اس کے بھائی کی لاش نکال کر نماز جنازہ کروایا گیا۔ اور اس کے بعد تنویر کو اس کے آبائی گاؤں کے قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ جب کامران کو پولیس نے گرفتار کیا تو گاؤں کے لوگوں نے کہا کہ ہمارا غم و غصہ تب ختم ہوگا جب ہمارے سامنے اس کو کھڑا کرکے گولی ماردی جائے۔ لیکن پولیس والے اُسے گرفتار کرکے تھانے لے گئے۔ کامران آج جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔

افسوس کہ پیسوں کے لالچ میں اس نے اپنے سگے بھائی کا خون کیا تھا۔ آج وہ رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے۔ بہر کیف اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بھی معاف کردے۔

☆......☆......☆

تلاش

شانی خان

اُس مرد کی داستانِ عجب، جس نے ساری زندگی خود کو تلاش کرنے میں گزار دی

''دیکھو بیٹا فضول کی ضد نہ کرو، تمہارا کیا کام وہاں۔ میں، تمہیں لے کر جانے سے رہی۔ یہ ہم عورتوں کے معاملے ہیں تم ان سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔''

''پلیز اماں جانے دیں نا۔'' اسامہ ضد کرتے ہوئے بولا تھا۔ ''میں بس خاموشی سے بیٹھا رہوں گا۔ کچھ نہ بولوں گا۔ میں صرف انہیں دیکھنا چاہتا ہوں، ملنا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا، بیٹا خود تو باؤلے ہو ہی، مجھے بھی باؤلا کر دو گے۔'' امی زچ ہوتے بولی تھیں۔

''پلیز پلیز امی!'' وہ مرغے کی وہی ایک ٹانگ بیٹھا تھا۔

''اچھا بابا شام کو سکینہ آتی ہے تو چلتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں تم وہاں بھی کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلاؤ گے۔'' آخر کار ماں ہار مانتے ہوئے بولی تھیں۔

وہ بچپن ہی سے عام بچوں سے ہٹ کر تھا۔ عجیب سی بے چین طبیعت تھی اس کی، جب سارے بچے شرارتوں میں مگن ہوتے تو وہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا اور بہت سے ان کہے سوال اُس کے ذہن میں گردش کرتے رہتے۔ بڑا ہوا تو یہ سوال الجھن بن کر اسے ستانے لگے اور وہ ان سوالوں کے جواب کا متلاشی مارا مارا پھرنے لگا۔ اس کی بے چینی اسے اک پل چین نہ لینے دیتی تھی۔ اس کشمکش میں وہ اکثر حاضر کو غائب کر دیتا اور غائب کو دیکھنے کے لیے چل پڑتا تھا۔ اس کے گھر کا ماحول چونکہ بہت مذہبی تھا، ابا اس کے صوم وصلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ بچوں کی تربیت انہوں نے بہت ٹھیٹھ خطوط پر کی تھی۔ یوں تو ان کے سارے ہی بچے نیک اطوار و سلجھے ہوئے تھے مگر اچھی عادت و خیالات میں اسامہ سب سے بڑھ کر تھا۔ اسے نہ صرف مذہب سے گہرا لگاؤ تھا بلکہ بہت کچھ جاننے کی جستجو بھی تھی۔ خاص کر کسی اللہ والے جسے صرف علم میں ہم بابا جی کہتے ہیں وہ معرفت کی راہوں کے اسرار جاننا چاہتا تھا کہ کن کٹھن و پراسرار راہوں سے گزر کر انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں کسی عام انسان کی دسترس نہیں ہوتی۔

جہاں اسے کسی برگزیدہ ہستی کی سُن گُن ملتی وہ سچ کا متلاشی اُن کی کھوج میں چل پڑتا۔ ایڈونچر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہر بابا جی کی بابا گیری کی تہہ تک جانے میں وہ کوئی جھجک خوف محسوس نہ کرتا اور اکثر معرفت کی تلاش میں اس کا پالا منافقت سے

پڑ جاتا، جس پر وہ بہت افسردہ ہوتا۔

''یا خدایا! میں کہاں جاؤں'' وہ خود سے مخاطب رہتا تھا۔

''چلو اسامہ بیٹا سکینہ آگئی ہے۔ بابا جی کے آستانے پر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

''جی اماں آیا۔'' وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تھا۔

......☆☆☆......

شہر کے گنجان آباد علاقے کی ایک تنگ سی گلی کے چھوٹے سے گھر کے ایک تاریک تعفن زدہ کمرے میں بابا جی کا آستانہ تھا۔ سکینہ اماں کی خالہ زاد تھی۔ اسامہ جب اندر داخل ہوا تو کافی عقیدت مندوں کی تعداد موجود تھی۔ کمرے کے درمیان ایک میلا سا پردہ لگا ہوا تھا جو مرد وزن کی حد بندی کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ عقیدت مندوں کی تعداد چونکہ زیادہ تھی سو پردے کے دونوں اطراف بیٹھے خواتین و حضرات کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ اسامہ اس صورتِ حال پر کچھ حواس باختہ سا تھا۔ وہ خود کو سمیٹ سمیٹ کر ایک کونے میں جا گھسا تھا۔ اس کی باری چونکہ ابھی آئی نہیں تھی مگر وہ بہت گہرے مشاہدے و سوچ کے ساتھ سارا ماحول خود میں جذب کر رہا تھا۔ آخر کار خدا خدا کر کے ان کی باری آئی۔

بابا جی ایک شانِ بے نیازی سے اسامہ سے مخاطب ہوئے تھے۔

''ہاں بچے بول کیا چاہتا ہے تُو۔ ویسے تو ہمیں سب پتا ہے مگر ہم تیری زبانی سننا چاہتے ہیں'' وہ بارعب لہجے میں بولے تھے۔ اسامہ نے بابا جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں بہت گہری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''بابا جی میں آپ کی زبانی سننا چاہتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے میرا۔ کیا چاہتا ہوں میں۔'' اسامہ کی یہ الٹی بات سن کر بابا جی کچھ سٹپٹا سے گئے۔

''ہاں ہاں بچہ معلوم ہے ہمیں، تم فکر نہ کرو۔ تمہیں وہ مل جائے گی۔'' بابا نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''کون بابا جی۔'' اسامہ مزے لیتے ہوئے بولا تھا۔ بابا جی اسامہ کی اس بے خِنکی پر مزید سٹپٹا گئے۔



''دیکھو بیٹا مجھے معلوم ہے تم کیا چاہتے ہو، مگر تم خود بتاؤ تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''جی بابا جی مجھے اس کی کب سے تلاش ہے۔ بچپن ہی سے میں اس کے خواب دیکھ رہا ہوں۔'' وہ

ذو معنی لہجے میں بولا تھا۔

''اچھا بیٹا تم اس کی تصویر مجھے لا دو۔ وہ دو دن میں میں تمہارے قدموں میں ہوگی۔'' بابا جی فخریہ لہجے میں بولے تھے۔

''مگر بابا میں آپ کو اس کی تصویر کیسے لا سکتا ہوں کہ وہ کوئی لڑکی تو نہیں۔'' اسامہ بابا کو مزید تلملاتے ہوئے بولا تھا۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں لڑکی نہیں تو نوکری کی تلاش میں ہے۔'' وہ پینترا بدلتے ہوئے بات سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے تو اسامہ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اسامہ کی اس بے ساختہ ہنسی پر سارے عقیدت مند چونک اُٹھے۔

''ارے ارے کیا گستاخی کر رہے ہو بابا جی کی شان میں۔'' ایک عقیدت مند اسامہ کو تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں کیا گستاخی کر رہا ہوں مگر پہلے اپنے بابا جی سے اتنا تو پوچھ لو کہ اسلام میں کہاں لکھا ہے کہ نامحرم عورت اور مرد یوں ایک کمرے میں بیٹھیں کہ ان کے جسموں سے جسم مس ہوں۔ اس بدتہذیبی کی اجازت کیا ہمارا مذہب دیتا ہے۔'' اسامہ بھی غصے سے بولا تھا اور پھر جو اُسے صحیح لگا وہ بولتا چلا گیا۔

ایک بار پھر کسی اللہ والے کی تلاش میں ایک فریبی کا سامنا کر کے وہ ٹوٹ سا گیا تھا۔

......☆☆☆......

وہ گھٹنوں میں سر دیے کافی دیر سے بیٹھا تھا۔ اُسے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر امام مسجد اس کے پاس چلے آئے۔

''بیٹا کیوں اپنی جان ہلکان کیے رکھتے ہو۔ یہ دنیا ہے، فریبی دھوکے بازوں سے بھری۔ بس تم اپنی راہ سیدھی رکھو۔ کون کیا کر رہا ہے یہ نہ سوچو۔ تمہیں کیا کرنا ہے یہ دیکھو۔ تم اکیلے اس پورے معاشرے سے نہیں لڑ سکتے، بس خود پر اور خود سے وابستہ رشتوں اور رشتوں کے تقاضوں پر دھیان دو۔'' امام مسجد کیوں کہ اس کی کیفیت کا ادراک رکھتے تھے سو اسے سمجھاتے ہوئے بولے تھے۔

''جی امام صاحب میں بہت کوشش کرتا ہوں۔ خود کو سمجھانے کی مگر یہ میٹھی میٹھی سے کسک ہر آن مجھے تڑپاتی رہتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کسی جنگل بیابان میں نکل جاؤں اور معرفت کی راہوں کو تلاش کروں۔ مگر پھر مجھے لگتا ہے کہ میں غلط کروں گا کہ اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہیں۔ سب کچھ چھوڑ کر زندگی اور زندگی سے وابستہ رشتے اور رشتوں کے فرائض سب کو بالائے طاق رکھ کر صرف بندگی کا حصول کروں، تو یہ کام تو لاتعداد فرشتے ہر آن کیے رکھتے ہیں۔ یہ تو بہت آسان ہے کانٹوں سے دور جانا اور کانٹوں کے درمیان سے دامن بچا کر نکلنا ہی اصل امتحان اور مقصود زندگی ہے۔ حقوق اللہ میں معافی کی گنجائش نکلتی ہے مگر حقوق العباد میں نہیں، جن کو پوری طرح سے پورا کرنے کی تلقین میرا مذہب مجھے بار بار کرتا ہے۔ ان سے فرار میرے لیے ممکن نہیں۔''

''نہ سوچا کرو بیٹا اتنا۔ گھر جاؤ تمہاری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ جماعت ختم ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔''

''جی!'' وہ سعادت مندی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وقت گزرتا رہا مگر نہ تو اُس کی تلاش ختم ہوئی اور نہ ہی اُس کی زندگی کو قرار ملا......

......☆☆......

''بیٹا تم ناشتا کر لو تو ابو سے مل لینا۔ انہیں کچھ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔'' امی اسے ناشتا دیتے ہوئے بولی تھیں۔

ناشتا کر کے وہ فارغ ہوا تو سیدھا جمال صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔

''جی ابو آپ نے بلایا تھا۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''آؤ بیٹا بیٹھو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ دیکھو اسامہ تمہارے سب بھائیوں اور بہنوں کی شادی ہوگئی ہے اور سب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ میں اور تمہاری اماں اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہماری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اس لیے ہم اپنی زندگی میں تمہارے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دلاور سے میں نے بات کر لی ہے۔ اگر تمہاری منشا ہے تو میں ایمان سے تمہاری شادی

کی بات پکی کروں۔''

''ابو جی خدا آپ کو اور امی کو لمبی زندگی دے۔ زندگی کا بھروسا تو نہ بوڑھوں کا ہے نہ جوانوں کا۔ آپ نے کیسے یہ سوچ لیا کہ میں آپ کی مرضی سے اختلاف کروں گا۔ جو آپ کی خوشی، وہی میری خوشی ہے۔ میری پسند آپ کی پسند سے جدا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو آپ بہتر جانیں وہ کریں۔''

بیٹے کی اس کمال سعادت مندی پر جمال صاحب جھوم ہی اٹھے تھے۔ خوشی ان کے انگ انگ سے نمایاں ہونے لگی۔

''مجھے فخر ہے کہ خدا نے مجھے تم سا بیٹا دیا ہے۔ خدا تمہاری ہر مراد پوری کرے۔'' وہ خوشی سے بیٹے کو گلے لگا کر دعا دیتے ہوئے بولے تھے۔

......☆☆☆......

ایمان اس کی بے چین زندگی کا چین بن کر آئی۔ وہ صورت کی ہی نہیں سیرت کی بھی بہت اچھی ثابت ہوئی۔ اسامہ سونا تھا تو ایمان سہاگہ، اسامہ پوری طرح اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتوں میں مگن ہو چکا تھا۔ گویا اس کی تلاش ختم تو نہ ہوئی تھی مگر اس کی بے چینی کو اک قرار سا ضرور مل گیا تھا اس کے والدین کا فیصلہ اس کے حق میں خوب ثابت ہوا۔

خدا نے یکے بعد دیگرے اُسے چار خوبصورت بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا جن کی معصوم مسکراہٹیں اس کے آنگن کو ہر وقت کھلائے رکھتی تھیں۔

اور پھر بہت سارے موسم چپکے چپکے گزرتے چلے گئے یہاں تک کہ اسامہ کے کندھے فرائض زندگی و بندگی ادا کرتے کرتے جھک سے گئے۔ وہ ایک سعادت مند بیٹا اور پیار کرنے والا شوہر تو تھا ہی ایک بہترین باپ بھی ثابت ہوا۔ بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کی شادیوں تک اس نے اپنے سارے فرائض بہت خوش اسلوبی سے نبھائے کہ دوست تو دوست دشمن بھی تعریف کرنے سے نہ کتراتے۔

اس کی زندگی مثال بن چکی تھی اوروں کے لیے۔ ہر کوئی اس کا گرویدہ تھا۔ اچھائی کی روشنی اس کے وجود سے بڑھاپے تک آتے آتے ان کی تلاش آج بھی جاری تھی۔ زندگی کا اتنا سفر طے کرنے کے بعد ایک روز انہونی ہوگئی۔

......☆☆☆......

بے چینی چین میں بدل گئی کہ جسے وہ نجانے کتنے ہی زمانوں سے ڈھونڈ رہے تھے وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سر جھکائے خاموش گم صم، اس نے جو کہا اسے سن کر اسامہ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اس انہونی حقیقت کا ادراک بگولوں کی طرح اس کے اطراف رقص کرنے لگا۔ اس کے وہ چند جملے اس کی پوری زندگی کی تلاش کا حاصل نکلے وہ ان کے سارے سوالوں کا جواب سن کر گویا ہوا تھا۔

''بابا جی میں نے جب سے شعور کی سیڑھی پر قدم رکھا ہے اک بے چینی سی میرے اندر رقص کرتی ہے معرفت کا حصول کن کٹھن و پراسرار راہوں سے گزر کر آتا ہے، یہ کھوج مجھے آپ تک لائی ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ لہجے کی تاثیر نے کتنے ہی دکھی دلوں پر مرہم رکھا ہے۔ آپ کی دعا شفا بن کر لوگوں کو آپ کے قریب لاتی ہے۔ آپ کی عاجزی و انکساری میں عجیب سا جادو ہے۔ آپ کے اخلاق کی شیرینی کے چرچے آپ کے احباب، یار دوستوں سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکے ہیں۔ خدارا بابا جی بتائیں مجھے آپ یہاں تک کیسے پہنچے جہاں کوئی عام بندہ نہیں جا سکتا۔''

وہ اسامہ (جو ایک نورانی بزرگ کی صورت اس کے سامنے بیٹھا تھا) سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا تھا اور اسامہ کو یوں لگا اس کا سارا ماضی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ اس کے سارے سوالوں کا مجسم جواب بن کر۔

اس کی پوری زندگی تو حقوق اللہ و حقوق العباد کو تندہی سے ادا کرنے میں گزری تھی۔ معرفت کے حصول سے قطع نظر وہ نیکی و بھلائی کی راہ اپنائے کب راستے سے منزل بنا اسے خبر نہ ہوئی۔ زمانے ایک پل میں سمٹ آئے تھے۔ وہ گم صم سا سوچ رہا تھا۔

''کیا میں نے پوری زندگی خود کو ہی تلاش کرنے میں گزار دی یا میں خود کسی کی تلاش میں تھا۔

......☆☆☆......

توشہ خاص، رنگ رنگ حکایتیں

مختصر مختصر، خوش بیاں، فرحت ساماں، زہرکار، عبرت اثر حکایتیں

وادیٔ مہران سے پہلی حکایت

بلند بخت

نوشابہ صدیقی

وادیٔ مہران سے ایک اعلیٰ پائے کی تحریر، جس کا ترجمہ سندھ کی ایک بیٹی نے کیا

نوکرانی بیڈٹی لے کر، بیڈروم میں داخل ہوئی اور جیسے ہی معمول کے مطابق ریشمی گوڈڑی (رضائی) لحاف سرکایا تو حیرت میں پڑ گئی، لحاف کے نیچے تو صرف نائیٹ ڈریس اور گاؤن پڑا تھا۔ چپل بھی اپنی جگہ پر پڑی ہوئی تھی، باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا، اور اندر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ باتھ روم میں ایک نظر ڈال کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

لاؤنج بھی خالی ہی تھا۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف گئی، کوارٹر والوں کو صبح ہی چوکیدار اٹھاتا تھا، آج تو گیٹ بھی کھلا ہوا تھا۔

سرونٹ کوارٹر کا نوکر اٹھا اور بات سن کر حیران ہوگیا۔ چوکیدار وہاں موجود نہیں تھا یہ زیادہ حیران کن بات تھی۔ گیراج بھی خالی تھا، نئے ماڈل کی کار بھی موجود نہ تھی۔

نوکرانی نے واپس آ کر ایک بار پھر بنگلے کا اچھی طرح جائزہ لیا، اور خاص طور پر بلند بخت کے بیڈروم میں جا کر دیکھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر ویسے ہی موجود تھیں۔ ماسوائے خود بلند بخت کے۔

نوکرانی پچھلے پندرہ سال سے اس بنگلے میں لوگوں کو آتے دیکھا کرتی تھی، جو کہ ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ لکھ پتی لاکھوں بلند بخت کے قدموں تلے نچھاور کیا کرتے، پھر اس کے بعد ایک اور آتا، تو پہلا ہٹ جایا کرتا، جیسے کہ تھا ہی نہیں۔

نوکرانی نے کبھی بلند بخت کا اصل نام تو نہیں سنا تھا۔ لیکن اتنا ضرور اُسے پتا تھا کہ بچپن میں اس کا نام کچھ اور تھا۔ بلند بخت کی ابھرتی خوبرو جوانی دیکھتی آئی تھی اور وہ حیران تھی کہ جوانی میں وہ کار کے ساتھ ہی کہیں گم ہوگئی تھی۔

سردار صرف دو دن پہلے ہی اپنے ایک کاروباری کام کے سلسلے میں دبئی گیا تھا، نوکرانی اور دوسرے نوکروں کے لیے بلند بخت کا اچانک گم ہو جانا ایک مسئلہ بن گیا۔ پولیس کو بھی اطلاع نہ دے پا رہے تھے، اس ڈر سے کہ شاید بلند بخت سیر کے لیے نہ نکلی ہو۔ لیکن رات کو تو چوکیدار بھی ڈیوٹی پر نہیں تھا، وہ کہاں گیا۔

بلند بخت بچپن ہی سے ایک شرمیلی لڑکی تھی۔ والد بہت قدامت پسند شخص تھا۔ بہت مشکلات کا سامنا کرتے کرتے وہ اپنے بھائی اور بہنوں میں تعلیم میں کچھ زیادہ آگے نکل گئی تھی، پھر اسے نوکری کرنے کا شوق ہوا۔ بالآخر آفیسر بھی اسے اپنا ہی مل گیا کسی نے بلند بخت کے والد کو راضی کیا، والد مطمئن ہوگیا کہ آفیسر اچھا انسان تھا۔

ابھی مشکل سے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ آفیسر نے اسے کار میں ساتھ لیا، راستے میں لنچ پر لے گیا اور پھر گھر چھوڑتا ہوا گیا۔ بلند بخت گھر آ کر آفس اور آفیسر کے بارے میں سوچنے لگی۔ آفیسر کی نیت پر بھی



وہ غور کرتی رہی۔

پھر تو چند مواقعے اور بھی آئے اور بیچ کا سفر بھی طے ہوگیا۔ بلند بخت کی دنیا بدلتی رہی اور اس کے گھر کا نقشہ بھی بدلنے لگا۔ گھر قالین سے لے کر خوب صورت ۔۔۔۔ تک چمکنے لگا۔ لا دو ایک دکھائی اور پھر اس کے بعد ملاقاتی بڑھتے چلے گئے، گھر کے افراد بھی پھر عادی ہونے لگے، جو آ رہا تھا پیارا ہوتا چلا جا رہا تھا، اور جو ہٹ گیا تو وہ یاد نہ رہتا۔ پھر بلند بخت کی ملاقات سردار سے ہوئی، سردار اپنے قبیلے کا سردار تو تھا، لیکن نام بھی سردار ہی تھا۔ بلند بخت کی تو سانس کا سردار بن گیا، اس نے تجوریوں کے منہ کھول دیے۔

زمین اور کاروبار کا اکیلا مالک، پڑھا لکھا، کئی زبانوں پر عبور، لندن، پیرس، واشنگٹن اور دنیا کے ہر کونے میں ایسے آتا جاتا جیسے کوئی چند میلوں کا فاصلہ ہو۔ ہر سفر میں بلند بخت بھی ساتھ ہوا کرتی اور جہاز کے جہاز سامان سے بھر کر لے آتی، اور آج ان چیزوں یا کسی سامان سے کچھ اٹھا کر نہ لے گئی۔

کیا کوئی اُسے اغوا کر کے لے گیا تھا؟ چوکیدار تو کہیں نہیں لے گیا اُسے؟ یا وہ چوکیدار کو لے کر چلی گئی تھی!

☆......☆......☆

سے ہوش سنبھالا تھا تب سے وہ مردہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کی بے رنگ آنکھوں میں ایک دن اچانک ڈھیر سارے خواب بسنے لگے تھے۔ ناامید اور ویران آنکھیں آباد ہونے لگی تھیں۔ اس کا دل جو نجانے کب سے دھڑکنا چھوڑ چکا تھا۔ ایک دم سے دھڑکنے لگا تھا صرف اک شخص کو دیکھ کر۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کا نام کیا ہے؟؟ کرتا کیا ہے اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ پتا تھا تو صرف اتنا کہ وہ اپنے خوابوں میں اسے اپنا ہم سفر بنا چکی تھی۔

اس نے اسے پہلی بار مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ سفید شرٹ اور جینز پہنے آنکھوں پر سن گلاسز لگائے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتا وہ اس کے دل میں کب جا بسا اسے کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔

☆......☆......☆

میں آج پھر اپنے دوست جان کے فلیٹ میں گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح مجھے وہ لڑکی فلیٹ کے بالکل سامنے بنے پارک کے بینچ پر بیٹھی نظر آئی تھی۔ بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے بکھرے بالوں کی کچھ آوارہ سی لٹیں اس کے چہرے کے گرد طواف کر رہی تھیں۔ ان سے بے نیاز اس کی نظر آج بھی میری طرف تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں ایسی کوئی خاص بات تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ ہمیشہ ویران رہنے والی آنکھیں ایک دم مجھے دیکھ کر روشن سی ہو جاتی تھیں۔ میں جتنی دیر وہاں کھڑا رہا خود کو ایک سحر زدہ سا محسوس کرتا رہا۔ میں کوئی فلرٹ قسم کا لڑکا نہیں ہوں بلکہ آج کے اس جدید دور میں بھی لڑکیوں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔ مگر نجانے اس اداس پری میں ایسی کیا بات تھی جیسے میں اس کا دیوانہ ہوا جاتا تھا۔

کچھ دیر کھڑکی میں کھڑے رہنے کے بعد میں گھر چلا آیا۔ جان کا فلیٹ میرے گھر سے آدھے گھنٹے کی دوری پر تھا اور میں ہر روز اپنے کام سے وقت نکال کر وہاں ضرور جاتا تھا۔ وجہ وہی اُداس پری تھی میں اس کے نام سے واقف نہیں تھا۔ مگر میں اسے اُداس پری بلاتا تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میری نظر سامنے سے آتی لائٹ بلیو کلر کی ساڑی پہنے ڈائمنڈ کا ہلکا سا نیکلیس گلے میں پہنے ایک ہاتھ سے ساڑھی سنبھالتی ماما مجھے نظر آئیں۔ شاید وہ کہیں پر جا رہی تھیں اور ایسا تو روز ہی ہوتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک میں ماما کو ایسے ہی دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں جانے کے لیے تیار ہی رہتی تھیں۔

"ارے جوزف بیٹا۔ آپ اتنی جلدی کیسے آ گئے۔"

میں جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا جب وہ مزید بولیں۔

"اچھا چلو اب تم آرام کرو میں ایک ضروری پارٹی میں جا رہی ہوں۔ لیٹ ہو جاؤں گی۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئیں تو میں بھی اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ دروازے میں پہنچ کر پتا نہیں مجھے کیا ہوا میں، میں سیڑھیاں چڑھتا سیدھا بابا کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ نجانے کتنے سالوں کے بعد میں اس کمرے کی طرف آیا تھا۔ بابا ہمیشہ کمرے میں بند رہتے تھے اور خود سے نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا میری نظر بھی ساکت رہ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے کچھ کہہ رہے تھے۔

"اے اللہ مجھے معاف کر دے میرے مولا۔ میری ذرا سی غلطی کی سزا اتنی نہ دے کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔ مجھے میری ہوس کی سزا اتنی نہ دے جتنی سہنے کی مجھ میں طاقت نہ ہو۔ اے میرے رب! اب میں زندگی کے اس سفر میں تھک گیا ہوں۔ مجھ میں مزید کچھ اور سہنے کی طاقت نہیں۔"

وہ یہ کہتے کہتے زور زور سے رونے لگے اور میں ساکت سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ بائبل سے مانگنے کا یہ کون سا طریقہ تھا...... میں نے تو اسے کبھی اس نام سے نہیں پکارا تھا۔ میں ساکت سا واپس اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ مجھ میں مزید وہاں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی۔ بچپن سے میں نے ماما اور بابا کو لڑتے دیکھا تھا اور اس لڑائی کی وجہ تھی وہ لڑکی جسے ایک دن بابا روتے ہوئے ہمارے گھر لے کر آئے تھے اور جسے دیکھ کر ماما نے بہت شور کیا تھا۔ مسلسل تین دنوں تک گھر میں لڑائی ہوتی رہی تھی، اور پھر تیسرے دن جب میں اٹھا تو بابا اپنے کمرے میں بند تھے اور اس لڑکی کا گھر میں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد بابا کبھی بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلے۔ سارا بزنس ماما نے سنبھالا' مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا ہوں تو صرف مما کی وجہ سے۔ باپ کا پیار تو مجھے کبھی ملا نہیں۔

ماں کیا ہوتی ہے پتا نہیں یا پھر شاید ماں ضرورتیں پوری کرنے والی میم ہوتی ہے۔ میں ساری رات جاگ رہا تھا آ کر بابا مخاطب کس سے تھے۔ میں نے کبھی بابا کو چرچ جاتے یا پھر بائبل پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ ماما تو یہ دونوں کام لازمی کرتی تھیں۔ اکثر مجھے بھی اپنے ساتھ چرچ لے کر جاتی تھیں اور میں دل میں سوچتا تھا کہ میرے پاس تو سب کچھ ہے پھر میں کیا مانگوں۔ اسی وجہ سے میں بچپن سے ہی اپنے مذہب سے دور رہا تھا، اور اب اس اداس پری نے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ آج میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اُداس پری سے ضرور بات کروں گا۔ بس اسی لیے میں جان کے فلیٹ میں چلا آیا اور ہمیشہ کی طرح وہ اپنے اسی مخصوص بینچ پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا آیا اور اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"میرا نام جوزف ڈسوزا ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔"

اور اس کا دماغ تو اس کے پہلے ہی لفظ میں اٹک گیا تھا۔ جوزف ڈسوزا یعنی کہ وہ کرسچن تھا۔ اس کے ہزاروں دیکھے خواب پورے ہونے کے باوجود اُدھورے رہ گئے تھے وہ حیران سی بولی۔

"میں مسلمان ہوں اور آپ۔"

"واٹ!"

میں تقریباً اچھل ہی تو پڑا تھا۔ وہ مسلمان تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ "میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ اندر سے مر گئی تھی۔

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ ہمارا Sorry میرا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔"

ایک ہفتے بعد وہ اس سے مخاطب تھا دونوں کی حالت ایک جیسی ہی تھی۔ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے وہ دونوں۔

"تو تم ایسا کیوں نہیں کر لیتے جوزف؟"

وہ تڑپ کر بولی تو میں ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"چلو میرے ساتھ تم۔ میں نے آج تک بابا سے کبھی بات نہیں کی مگر آج میں ان سے پوچھوں گا میرے اور تمہارے مذہب میں کیا فرق ہے۔"

وہ اسے ساتھ لے کر جیسے ہی بابا کے کمرے میں داخل ہوا۔ بابا کی ساکت سی نظریں رابعہ پر پڑیں اور پتھر ہو گئیں۔ جبکہ میں اپنے ہی خیالوں میں گم بابا سے بولا۔

"بابا یہ ہے میری پسند رابعہ! میں اسے مما کے پاس اس لیے نہیں لے کر گیا کیونکہ وہ مجھے کبھی بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ بابا یہ مسلمان ہے اور میں کرسچن ہوں کیا ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

"شٹ اَپ جوزف ڈسوزا جسٹ شٹ اَپ۔"

وہ اتنے غصے سے دھاڑے کہ میں حیران رہ گیا۔۔ جبکہ وہ اتنا کہہ کر دھاڑے مار مار کر رونے لگے اور روتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لیے کسی زہر سے کم نہیں تھا۔

"یہ تمہاری بہن ہے۔ اذان یہ تمہاری بہن ہے۔ میری شادی تمہاری مما سے ہونے سے پہلے میرا نکاح اپنی کزن سے ہو چکا تھا اور ایک دن جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے غلط قدم اٹھا لیا اور وہاں سے بھاگ کر میں نے تمہاری مما سے دولت کی خاطر شادی کر لی؛ جس کے کچھ سال بعد مجھے پتا چلا کہ میری پہلی بیوی کی بیٹی پیدا ہوئی ہے اور اس کی پیدائش پر میری بیوی مر گئی ہے۔ میں اپنی بیٹی کو یہاں پر لے آیا مگر تمہاری مما نے مجھے اس قدر ذلیل کیا کہ حد نہیں اور پھر اسے کسی یتیم خانے میں دے آئی میری وہ بیٹی یہ ہے رابعہ اور جوزف سوزا تم مسلمان ہو تمہارے پیدا ہونے پر ہی میں نے تمہیں مسلمان بنا دیا تھا مگر تمہاری مما نے مجھے بتائے بغیر تمہیں کرسچین بنا دیا مگر تم پیدائشی مسلمان ہو۔"

ایک کے بعد ایک لگنے والے ان جھٹکوں نے مجھے ساکت کر دیا تھا اور وہ مزید کہہ رہے تھے۔

"صرف دولت کی ہوس نے اتنی ساری زندگیاں خراب کر دیں۔ مجھے ہمیشہ سے دولت پانے کی چاہ رہی تھی۔ اور میری اسی چاہ نے مجھے برباد کر دیا۔ آج میرے پاس بے حساب دولت ہے مگر سکون نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو تم دونوں۔ میری ذرا سی غلطی نے نجانے کتنی زندگیاں خراب کر دی ہیں۔"

☆☆☆

ایک چھوٹی سی نیکی

ربیعہ خالد

کبھی ایک چھوٹی سی نیکی بھی خوابوں کی تعبیر بن جایا کرتی ہے

کلکٹریٹ میں اُن دنوں اوپر سے نیچے تک ہر عملہ اپنے کاموں میں اس طرح منہمک تھا۔ جیسے وہ برسوں کے امبر کو آج ہی ختم کردے گا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ گیارہ بجے اسٹاف دفتر آتے حاضری بناتے اور ہوٹل اور چائے پینے جاتے۔ موکل تلاش کرتے، سودے بازی ہوتی، لین دین کا معاملہ طے کرتے، وکیلوں اور پیشکاروں سے اس جگہ ساری باتیں ہوتیں۔ جب سارا معاملہ طے ہوجاتا تو یہ حضرات لنچ سے کچھ قبل اپنی اپنی سیٹوں پر آبیٹھتے اور آپس میں گپ بازی شروع کرتے۔

لیکن اب معاملہ ہی کچھ اور ہوگیا تھا۔ دس بجے تمام اسٹاف اپنی اپنی ٹیبل پر حاضر ہوجاتا۔ کیا مجال کہ لنچ سے پہلے کوئی بھی اپنی جگہ سے اُٹھ سکے۔ سبھی حیران اور پریشان تھے کہ آخر اس D.C کا سارا عملہ کون سے چھوت کے عارضے میں مبتلا ہوگیا ہے۔ آخر یہ سارا عملہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس قدر سنجیدہ کیسے ہوگیا۔ پتا چلا کہ اس ذمہ داری کا احساس محض نئے تبدیل ہوکر آنے والے ڈپٹی کمشنر سے ہے۔ سب کو اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ نیا آنے والا کمشنر کسی طرح کی غیر ذمہ داری کو برداشت نہیں کرے گا۔ وہ اپنے ماتحت دفاتر میں کسی وقت بھی آکر وہاں کے کام اور کام کی ترقی کی رفتار کا معائنہ کرسکتا ہے۔ بجلی کس وقت اور کس کے سر پر گرے گی یہ کسی کو پتا نہیں۔ اسے تو کام سے مطلب تھا۔ وہ جس جگہ ٹرانسفر ہوکر جاتا وہاں کے عملے کا یہی حال ہوتا۔

وہ نہ خود حرام کھاتا اور نہ اپنے عملے کو کھانے دیتا۔ لوگ اس کے وہاں سے ٹرانسفر ہونے کی دل ہی دل میں دعائیں مانگتے، اور اس کے جانے کے بعد مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں۔ ان کے لیے پہلے کا سنہرا دور اب خواب بن کر رہ گیا تھا۔ پہلے پیسہ بنانے کے لیے کسی بھی کام کو مہینوں روکا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کمشنر کی ہدایت ہی نرالی تھی۔ اگر کسی کام میں ایک ہفتہ لگ رہا ہو تو اس کی خبر پہلے ہی اسے مل جانی چاہیے۔ ورنہ معائنہ کے دوران اگر اس طرح کا کوئی انکشاف ہوا تو اسے بدعملی سمجھا جائے گا۔ اور اس کی جواب دہی کلرک سے لے کر انچارج افسر تک برابر لازم ہوگی۔

ایک طرف جہاں کلکٹریٹ کا عملہ پریشان تھا تو دوسری طرف ٹیبل کے نیچے سے پیسہ دے کر کام نکالنے والے بھی کم پریشان نہ تھے۔ اس نئے کمشنر کے آنے کے بعد تو کچھ کرتے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ اگر کسی کو بھی شکایت ہو کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہورہا تو حصول انصاف کے لیے اسے D.C سے وقت مقررہ پر ملنے کا اختیار بھی تھا۔ رشوت ستانیوں اور بدعنوانیوں کا بازار ایک دم سرد پڑچکا تھا' کوئی کہتا یہ نیا کمشنر سنکی ہے کوئی کہتا کمونیٹ ہے۔ مگر سیدھے سادھے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ D.C اس دھرتی پر دیوتا بن کر آیا ہے۔ لیکن مسٹر ظفر یعنی ڈپٹی کلکٹر ان باتوں سے قطعی بے تعلق بے خبر اور اپنے اندر ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر بننے کی خوبیاں اکٹھا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انھیں یہاں آئے ہوئے ابھی چند مہینے ہوئے تھے۔ مگر ان کا عملہ چاہتا تھا اور دل سے دعائیں کرتا تھا کہ جلد سے جلد ان کا ٹرانسفر یہاں سے ہوجائے۔ تاکہ وہ اپنی من مانی کرسکیں۔

سروس کے آخری دنوں میں ان کا ٹرانسفر رانچی ہوگیا تھا جو اب جھارکھنڈ کا کیپٹل ہے۔ ان دنوں وہ بہار کا ہی ایک شہر تھا۔ وہیں وہ ریٹائر ہوئے اور پھر وہیں کے ہوگئے۔

زندگی کے مدارج طے کرتے ہوئے انھوں نے بہت عروج پایا۔ انگریزوں کے زمانے میں اعلیٰ سرکاری ملازمت، بڑے بڑے لوگوں سے ذاتی مراسم اور دولت کی ریل پیل ہو تو انسان کا دماغ خراب ہو ہی جاتا ہے۔ بہت بڑے زمیندار گھرانے کی اولاد ہونے کے باوجود ان میں ذرا بھی تکبر اور غرور نہ تھا۔ خدا جانے وہ اعلیٰ ظرفی کے کس مقام پر تھے کہ ان پر اس طرح کی کوئی چیز اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کرکے لوگوں کی خدمت کرنا' انھیں نوکریاں دلوانا اور جب تک پہلی تنخواہ نہیں مل جاتی انھیں اپنے گھر سے کھانا کھلانا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بہت سے ضرورت مندوں، بیواؤں اور یتیموں کو ماہانہ رقم بھیجتے، اور جب بھی کوئی مدد کے لیے آتا وہ کبھی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ زندگی بھر انھوں نے سلطان کی طرح راج کیا اور دوسروں کی بھلائی مانگ کر انھوں نے اپنے بچوں کی بھلائی مانگی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ وہ تو تھے ہی بے مثل، حسد کینہ جیسے لفظوں سے یکسر نا آشنا۔

شہروں میں لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ غیر متعلقہ باتوں پر دھیان دیں۔ اور نہ ان کے پاس وقت ہوتا ہے کہ کسی میں دلچسپی لیں۔ مگر مشینی انداز میں کام کرنے والوں کے اژدھام میں جب وہ آفس جانے کے لیے نکلتے تو اکثر انھیں ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا یا بیٹھا ہوا نظر آتا جس کے ہاتھ میں چند کتابیں ہوتیں۔ وہ صورت سے کسی اسکول کا طالب علم نظر آتا تھا۔ ظفر صاحب تقریباً روز ہی دفتر سے واپسی پر اسے اسی جگہ کھڑا دیکھتے۔ فٹ پاتھ سے لوگ گزر رہے ہوتے۔ یہ وقت چھٹی کا ہوتا ہے۔ لوگوں کے چلنے کے انداز سے ایسا لگتا جیسے کوئی ان کا تعاقب کررہا ہو۔



ایک دن آفس سے واپسی پر تیز بارش ہونے لگی۔ ظفر صاحب جب اس جگہ سے گزرنے لگے تو وہ بچہ انھیں بارش میں بھیگتا نظر آیا۔ شاید وہ بارش رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ظفر صاحب نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی روکو اور اس بچے کو بلا کر لاؤ۔ وہ آج کل کا زمانہ نہیں تھا۔ جب کسی کی ہمدردی مہنگی پڑ جاتی ہے۔ وہ گاڑی روک کر اسے بلانے چلا گیا۔ بچہ جھجکتا ہوا گاڑی کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔

ظفر صاحب نے کہا کہ تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ یہ بارش رکنے والی نہیں ہے۔ میں تمھیں تمہارے گھر پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اس روڈ پر بسیں بھی نہیں آتیں۔ تم کب تک بارش رکنے کا انتظار کرو گے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔" بڑی مشکل سے وہ گاڑی میں بیٹھنے کو تیار ہوا۔

اس کا کہنا تھا کہ میں پوری طرح بھیگ چکا ہوں۔ میرے بیٹھنے سے آپ کی گاڑی خراب ہو جائے گی۔ ظفر صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ اگرچہ اس کا گھر ان کے روٹ میں نہیں تھا لیکن انسانی ہمدردی کے تحت وہ اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

راستے میں اس لڑکے نے بتایا کہ وہ ایک غریب والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اُس کا باپ اُس کے بچپن میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ ماں لوگوں کے گھروں میں مزدوری کر کے اسے پال رہی ہے۔ لیکن وہ مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔ وہ چاہتی ہے کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی بہتر کام کروں۔ وہ جو کچھ کماتی ہے اس میں ہم دونوں کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی کھا لیتے ہیں۔ اس سال میں نے میٹرک پاس کر لیا ہے اور کالج جا رہا ہوں۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے اس لیے میں روز پیدل ہی گھر جاتا ہوں۔

آپ ابھی دیکھیں گے کہ ہمارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔ ہمارے پاس اپنا گھر بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک کمرے کے مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔ ہماری ماں ہمیں بہت محنت کر کے پڑھا رہی ہے۔ آج آپ نے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا ورنہ بارش رکنے پر میں پیدل ہی گھر چلا جاتا۔

ظفر صاحب نے کہا کہ تم بہت بہادر اور محنتی بچے ہو۔ انشا اللہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو گے، اور ایک دن اس سے بھی بڑی اور قیمتی کار تمہارے پاس ہو گی۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری محنت اور لگن ایک دن تمھیں بہت اونچے مقام پر ضرور پہنچائے گی۔ انھوں نے اس بچے کو اس کے گھر کے قریب اتار دیا۔ کچھ مہینوں بعد ہی ان کا وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا۔ اس طرح بہت سال بیت گئے اور ان کے ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا۔ جہاں ان کی آخری پوسٹنگ ہوئی وہیں انھوں نے اپنا گھر بنا لیا۔ گاؤں میں بھی ان کی بہت زمینیں تھیں۔ اس لیے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ آرام اور سہولت سے زندگی گزارتے تھے۔ ایک دن انھیں کچھ ضروری کام کے سلسلے میں D.C آفس جانا پڑا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنا کارڈ اندر بھیجا انھیں D.C صاحب سے ہی کام تھا۔ ابھی وہ چپراسی کے جواب لانے کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ ایک نوجوان کمرے سے باہر آیا اور ان کے پیر چھونے لگا۔ وہ حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور کیوں ان کے پیر چھو رہا ہے۔ اس نے انھیں حیران دیکھ کر کہا۔

"سر آپ مجھے پہچان نہیں رہے۔ میں وہی لڑکا ہوں جو ہمیشہ آپ کو ایک پیڑ کے نیچے کھڑا نظر آتا تھا۔ جیسے آپ نے آشیرواد دیا تھا کہ ایک دن تم پڑھ لکھ کر بہت بڑے آدمی بنو گے۔ تمہارے پاس اس کار سے بھی اچھی اور نئی گاڑی ہو گی۔ سر آپ کا آشیرواد میرے کام آیا۔ آج میں کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوں اور میرے پاس بالکل نئی اور قیمتی کار بھی ہے۔ سر میری خواہش ہے کہ آج میں آپ کو اپنی گاڑی پر آپ کے گھر چھوڑوں۔ وہ انھیں بڑے پیار سے اندر لے گیا۔ ان کی خوب خاطر مدارت کی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کے لیے کیا کرے۔

"سر میں بہت دنوں سے آپ کا پتا لگانا چاہ رہا تھا۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ آج میں کس قدر آپ کو دیکھ کر خوش ہوں بیان نہیں کر سکتا۔ آج میری برسوں کی خواہش پوری ہوئی ہے۔"

پھر اس نے ظفر صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیو کر کے ان کے گھر لے گیا۔ اور جب تک رانچی میں اس کی پوسٹنگ رہی وہ برابر ان سے ملنے آتا تھا۔ ان کی ایک چھوٹی سی نیکی نے اس آفیسر کے دل میں ان کے لیے کتنی جگہ بنا دی۔ بڑے لوگوں کے دل میں اتنی جگہ اور فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ غیر متعلقہ باتوں میں دلچسپی لیں۔

☆☆☆

کراچی سے پہنچی حکایت

اپنا ہو گیا سپنا

الماس فاطمہ ارمان

قسمت کی بدبختی اور خوش بختی سے جڑی حکایت خاص



آپا صنوبر محلے کی سب سے قابل تعریف خاتون تھیں۔ ہر ایک کے دُکھ درد، خوشیوں میں خوش رہتی، ان کے شوہر ولی محمد بھی ان ہی کے جیسے تھے۔ خدا نے دو خوب صورت بیٹے بھی عطا کیے۔ یہ لوگ صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے تھے۔ صنوبر اور ولی محمد بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ ولی محمد بجری کا ٹرک چلاتا تھا۔ نماز، روزے کا پابند، شرافت کا بہترین نمونہ تھا۔ پھر پتا نہیں اُسے کس کی نظر لگ گئی۔

ٹرک بجری سے لوڈ تھا کہ کھائی میں جا گرا۔ ولی محمد موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ صنوبر پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پردیس میں دو چھوٹے چھوٹے بچے ...... چند دن تو محلے والوں نے ساتھ دیا مگر پھر سب اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔

گاؤں سے صنوبر کے بھائی اور بھابی آئے تھے۔ انھوں نے صنوبر سے کہا تم یہ گھر فروخت کر کے گاؤں آ جاؤ۔" مگر صنوبر نہ مانی۔

اُس نے کہا کہ یہ میرے ولی محمد کی محنت سے بنا ہوا گھر ہے۔ میں اس کو کیسے نیلام کر دوں۔" صنوبر نے بھائی کے ساتھ جانے کے بجائے اپنے ہی گھر

میں رہنے کو ترجیح دی۔

صنوبر آپا کے دونوں لڑکے بالا اور لالا محنت مزدوری میں لگ گئے۔ بالا بڑا تھا، اُس نے گاڑیوں کے کام کے ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی سیکھ لی اور ماہر ڈرائیور ہوگیا۔ بالا بڑی کوچ چلانے لگا اور لالا لوڈ ٹرک۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر گزر جاتا ہے۔ ماں نے دونوں بیٹوں کی محنت کی کمائی جوڑ جوڑ کر اپنے گھر کو بہتر سے بہتر بنایا۔ قسمت ایک بار خراب ہوجائے تو پھر یہ ستم ظریفی زندگی میں بار بار آزماتی ہے۔

بالا دوستوں کی بُری صحبت میں پڑ گیا وہ نشہ کرنے لگا۔ شروع میں چرس اور شراب کی حد تک تھا پھر ہیروئن بھی پینے لگا۔

جب صنوبر کو پتا چلا تو اُس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اُس نے لالا سے کہا کہ فوراً اس کو ہسپتال میں داخل کراؤ۔''

بالے کا چھ ماہ تک منشیات کے اسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ اس چھ مہینے کے عرصے میں اُس نے نشے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ دوبارہ سے صحت مند ہوگیا۔

صنوبر نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی شادی کردی جائے اس لیے وہ اُسے لے کر گاؤں پہنچ گئی۔

☆......☆......☆

گاؤں کی آب وہوا نے بالے کو اور بھی خوب صورت بنادیا۔ صنوبر نے گاؤں میں بالے کے لیے لڑکی تلاش کرنا شروع کردی۔ وہ بالے کے ساتھ لالا کی شادی بھی کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی خالہ زاد بہن کی لڑکیاں پسند آگئیں۔ دونوں بہنیں بہت سگھڑ اور خوب سیرت تھیں۔ لالا نے ماں کے فیصلے کے آگے کچھ نہ کہا اور شادی کرلی۔ مگر بالے کو ماموں کی لڑکی روشنی پسند تھی۔ وہ بہت ہی حسین ہونے کے ساتھ چلبلی اور اکڑ میں رہنے والی لڑکی تھی۔ بالے نے آہستہ آہستہ اپنے پیار سے اُسے اپنا گرویدہ بنالیا۔

جب صنوبر کو پتا چلا تو اُس نے اُسے سمجھایا کہ بالے تیرا ماموں تجھ سے اُس کی شادی نہیں کرے گا۔ کیوں کہ روشنی اس کی بہت ہی لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ اُسے پیسے والے لوگوں میں دے گا۔ جو اُس کے معیار پر پورے اُتریں گے۔''

''اماں تم بات تو کر کے دیکھو۔'' بالے کی بے حد ضد پر صنوبر نے بھائی سے بات کی مگر انھوں نے صاف انکار کردیا۔

بالے نے روشنی سے کہا کہ تم میرا انتظار کرنا، میں کراچی جاکر کماؤں گا اور پھر سے اماں کو لے کر آؤں گا۔''

☆......☆......☆

کراچی آکر اُس نے دن رات ایک کر کے پیسہ کمایا۔ اُس کا ساتھ لالا نے بھی دیا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ بھائی کی خواہش پوری ہوجائے۔

انھوں نے اپنی کوچ خریدی، مکان کو نئی آرائش سے سجایا، کار بھی خریدلی، اُسی کار میں وہ ماں کو لے کر گاؤں گیا اور پھر ماموں کے آگے دستِ سوال کرو۔

مگر اُس کے ماموں نے پھر سے انکار کردیا۔

بالے نے روشنی سے بات کی تو اُس نے بھی اُسے روکھا سا جواب دے دیا۔

''میرے بابا نے میرے لیے جو فیصلہ کرنا ہوگا وہ مناسب ہوگا۔ تم گاؤں کی کسی غریب لڑکی سے شادی کرلو یا پھوپی نے جو لڑکی تمہارے لیے پسند کی ہے اس سے شادی کرلو۔'' وہ مایوس ہوکر واپس ماں کو لے کر کراچی آگیا۔

اُس نے پھر سے نشہ کرنا شروع کردیا کیونکہ وہ روشنی کی بے وفائی برداشت نہ کرسکا تھا اور اپنے آپ کو نشے میں غرق کرلیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اُس کی صحت خراب ہوتی رہی، ماں اور لالا نے بہت کوشش کی کہ وہ دوبارہ نشے سے چھٹکارا پالے مگر وہ کسی قیمت پر بھی اسپتال جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بس نشے کے لیے باہر جاتا ورنہ سارا دن گھر میں پڑا رہتا۔ صنوبر ماں تھی، زبردستی اُسے پھل فروٹ کھاتا اور دودھ وغیرہ دیتی مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔ لالا کو وہ الگ پریشان کرتا اور بار بار نشے کے لیے پیسوں کا مطالبہ کرتا۔ اگر وہ نہیں

دیتا تو وہ گھر کی چیزوں کی توڑ پھوڑ شروع کردیتا۔

لالا کی بیوی اور صنوبر جھگڑا کر کے لالا کو پیسے دینے پر مجبور ہوجاتے۔

اس طرح چار سال گزر گئے۔ روشنی کو بالا اب تک نہیں بھول پایا تھا۔

☆......☆......☆

اُدھر روشنی کی جس شخص سے شادی ہوئی وہ روشنی سے بھی زیادہ ضدی، اور سر پھرا انسان تھا۔ اُس کا اور روشنی کا روز لڑائی جھگڑا ہوتا۔ روشنی اُس پر شک کرتی کیونکہ وہ ہر وقت لڑکیوں سے فون پر باتیں کرتا رہتا۔ بیرون ملک سے لڑکیوں کے فون آتے کہ تم واپس آجاؤ۔''

روشنی کی ضد تھی کہ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ وہ امریکہ تو نہ جاسکی البتہ اُس کے شوہر نے اُسے طلاق دے کر اُس کے گھر واپس بھیج دیا۔

☆......☆......☆

بالے کو اس بات کا پتا بہت دیر سے چلا۔ وہ بھی اُس وقت جب روشنی کے ساتھ ایک بڑا حادثہ رونما ہوا۔ وہ کسی سہیلی سے ملنے گاؤں سے شہر گاڑی خود چلا کر جارہی تھی کہ طوفانی بارش شروع ہوگئی۔ ماں نے پہلے ہی منع کیا تھا مگر وہ نہ مانی۔ تیز رفتاری سے گاڑی چل رہی تھی کہ اچانک سامنے سے آتی ہوئی سوزوکی سے ٹکرا گئی۔ موقع پر لوگ ہسپتال لے گئے جان تو بچ چکی تھی مگر شیشے ٹوٹ کر اس کی آنکھوں اور منہ پر جگہ جگہ اپنے نشان چھوڑ چکے تھے۔ سرجری سے منہ تو ٹھیک ہوگیا تھا مگر وہ خوب صورتی نہیں رہی جس پر روشنی بڑا غرور کرتی تھی۔ آنکھوں کا بھی آپریشن ہوا مگر آنکھیں بہت ہی ویک ہوچکی تھیں۔ اُسے ہائی پاور والا چشمہ لگ چکا تھا۔ بغیر عینک کے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے بالے کو روشنی کے بارے میں پتا چلا تھا وہ بے چین ہوگیا تھا۔ اور پھر گاؤں پہنچ گیا۔ روشنی سے ملا...... روشنی کا بھی غرور خاک میں مل چکا تھا۔ وہ بھی ملنے کو تیار ہوگئی۔ اُس نے بالے سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ دونوں میں پھر سے وہ پہلی جیسی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ محبت جاگ اُٹھی۔

بالے نے روشنی سے پھر وعدہ لیا کہ مجھے چھ مہینے کا ٹائم چاہیے۔ میں پھر سے تیرے لیے پہلے جیسا بالا بننا چاہتا ہوں۔

''مگر بالے اب وہ روشنی نہیں جس کی خوب صورتی پر تجھے ناز تھا۔''

''دیکھ روشنی محبت روح سے ہوتی ہے، جسم یا اس کی خوب صورتی سے نہیں۔'' اُسے تسلیاں دے کر نئے وعدے اُس کی دامن میں ڈال کر وہ شہر واپس آگیا اور خود ہی اپنا علاج کرانا شروع کردیا۔ نشہ کرنا پھر سے چھوڑ دیا، گھر اور کاروبار میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ اماں اور لالا خوش تھے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ پھر ٹھیک ہوجائے۔

ماں اور چھوٹے بھائی لالا نے اُس کا اس بار بھی بھرپور ساتھ دیا اور اُس کی صحت بہتر سے بہتر ہوگئی۔

ماں نے ایک بار پھر بھائی کے آگے دستِ دراز کردیا۔

بھائی کے ہاں کہنے سے پہلے روشنی نے ہاں کردی۔

'' پھوپو میں بالا سے شادی کے لیے راضی ہوں۔ مجھے محبت چاہیے جو صرف مجھے بالا ہی دے سکتا ہے۔''

دونوں کی شادی ہوگئی۔

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ روشنی نے اپنے آپ کو بدل لیا۔ وہ پھوپی اور دیور سب کے ساتھ مل جل کر رہتی۔ بالا بہت خوش تھا۔ واقعی اُس نے روشنی کو سچے دل سے چاہا تھا ورنہ اُس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے نشہ بالکل ترک کردیا تھا۔ اللہ نے انھیں ایک سال کے اندر دو جڑواں بیٹوں سے نوازا۔

بالا خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کا نام زین اور نین رکھا ہے۔ اُسے دنیا کی ساری دولت مل گئی ہے اور قسمت کی خوش بختی نے ایک بار پھر سے آپا صنوبر کا گھر دیکھ لیا ہے۔

☆☆☆

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جزیرے کا سفر کرائے گا۔

(پہلا حصہ)

دور افق پر آسمان، سمندر کے نیلے پانی سے لپٹا محسوس ہوتا تھا۔ اس سے سمندر کا پانی بھی اتنا ہی پر سکون تھا جتنا کہ نیلا آسمان۔ تختے پر کھڑے ملاح نے ایک آسودہ سی نظر چاروں اور ڈالی۔ طمانیت کے احساس کو مزید تقویت ملی تھی۔ یہ ایک مسافر بردار بحری بیڑہ تھا۔ جو سیاحت کے شوقین لوگوں کو اس خوبصورت جزیرے پر لے کر جا رہا تھا جس کی خوبصورتی کے چرچے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ اس بیڑے کا ملاح تھا۔ تمام لوگوں نے اس پر بھروسہ کیا تھا کہ وہ انہیں بحفاظت خوبصورت جزیرے تک پہنچائے گا۔ ملاح کو اپنی ذمہ داری کا خوب احساس تھا۔ اور وہ اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھا رہا تھا۔

بیڑے کی ظاہری وضع قطع بے حد دلربا تھی۔ صاف ستھرے بیڑے کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کا بادبان تھا۔ ہوا کے دوش سے لہلہاتا بادبان بیڑے کو درست سمت لے جا رہا تھا۔ آسودہ چہرے والا ملاح مطمئن ہو کر ابھی اندرونی حصے میں جانا ہی چاہتا تھا کہ اسے عقبی حصے سے اسے دھم دھم کی آوازیں سنائی دیں، ایسے جیسے کوئی چھلانگیں لگا رہا ہو۔ اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا اور وہ فوراً؟ سے بیشتر تیز قدموں سے عقبی حصے کی طرف آیا۔

عقبی حصے میں آ کر اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ بیڑے کی گرل پھلانگتے اندر آ رہے ہیں اور عقبی حصے میں موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھے ہوئے مسافر خوف و ہراس سے ایک طرف ان لوگوں کو بیڑے میں داخل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

ملاح کو اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دینے لگی۔ یہ اس سمندری راستے کے قزاق تھے۔ انہی قزاقوں کی وجہ سے لوگ اس جزیرے کا رخ کم ہی کرتے تھے۔ مکروہ چہرے والے قزاقوں نے آن کی آن میں بیڑے کو لوٹنا شروع کر دیا۔ لوگ دہشت سے چیخیں مارتے ادھر ادھر دوڑنے لگے اور قزاق، لوگوں کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے قہقہے لگانے لگے۔ بلند و بانگ قہقہے۔

بیڑے کے نااہل محافظ بے بسی سے لوگوں کو لٹتا دیکھتے رہے۔ مسلح قزاقوں سے الجھنا انہیں پُرخطرہ لگا اور پُرخطر معاملات سے متعلق ان کی تربیت ناکافی سی تھی۔

ملاح رنج و الم سے نڈھال ہونے لگا۔ اس نے لوگوں کو بحفاظت جزیرے تک پہنچانے کا عزم لیا تھا۔ اب لوگوں کا خوف و ہراس اور انہیں لٹتے ہوئے دیکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ

دیا۔ ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اس نے ایک نظر آسمان کی وسعتوں کو کھو جاتا تھا۔ کمینے چہرے والے قزاقوں کے سردار نے بلند و بانگ قہقہے لگاتے ہوئے ملاح کو باندھنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے پکڑ کر باندھا جاتا اسے ایک کونے میں رسی کے موٹے گچھے کے ساتھ درانتی پڑی نظر آئی۔ اس نے درانتی اٹھالی اور ملاح دوڑ کر سامنے آیا، اچھل کر درانتی سیدھ میں پھینکی۔ درانتی بادبان کو چیرتی دوسری طرف سے سمندر کا رزق بن چلی۔

قزاقوں کے گروہ نے ملاح کی حرکت کو حیرانگی سے دیکھا اور پھر بیک وقت سردار کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ نگاہوں میں سوال تھا کہ اگلا حکم کیا ہے۔ سردار نے ایک اور قہقہہ لگایا اور قزاقوں کو واپسی کا حکم دیا۔ قزاق اس مختصر وقت میں جس قدر سامان لوٹ سکے تھے، سنبھالتے جس طرح آئے تھے اسی طرح چلے گئے اور ملاح بے یقینی سے پھٹے ہوئے بادبان کو دیکھنے لگا۔ اس نے تو بادبان میں اس لیے شگاف کیا تھا کہ قزاق بدحواس ہو جائیں گے اور فرار کا سوچیں گے۔ قزاق بدحواس تو نہ ہوئے البتہ انہوں نے فرار کا راستہ ضرور مانا۔

لیکن بادبان کو پھاڑتے ہوئے ملاح کے ذہن میں یہ کیوں نہ آیا کہ بعد میں بیڑے اور بیڑے کے مسافروں کا کیا ہوگا۔ لٹے پٹے لوگوں کا مجمع بھی پھٹے ہوئے بادبان کو دیکھ کر چہ میگوئیاں کرنے لگا اور کچھ لوگ آگے بڑھ کر ملاح سے الجھنے لگے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔'' ملاح کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھا۔ بیڑہ بے سمت ہو چلا تھا۔

☆......☆......☆

اب وہ وقت چلے گئے جب راتوں کو شہر سو جاتے تھے۔ نیا زمانہ تھا اور نئے زمانے کے نئے انداز۔ شہر کی آنکھیں اب نیند سے بوجھل ہوتی تھیں اور نہ اسے اب سونے کی تمنا ہوتی تھی۔ شہر لاہور کی مشہور سڑک



تھی۔ موسم میں نرمی تھی۔ ہوا کے جھونکے خوشگوار محسوس ہوتے تھے۔۔ فٹ پاتھ پر ٹہلتے وجود کا انتظار ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ وہ چار لڑکیاں آج ادھر آکھڑی ہوئی تھیں اور اب وہ اکیلی تھی۔ اور تھوڑی جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔ انتظار ہمیشہ اسے جھنجھلاہٹ کا شکار کیا کرتا تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنے سراپے کو جانچا تھا۔ سنہری پلو اور سرخ بلاؤز والی ساڑھی، پاؤں میں سنہرے تلے والی چپل اور ہونٹوں پر لگائی سرخ لپ اسٹک سب کچھ تو بہترین تھا پھر اتنا انتظار کیوں کرنا پڑ رہا تھا۔ ابھی ملک میں ساڑھی مقبول عام لباس نہ تھا۔ اب ساڑھی والی نوجوان لڑکی سبھی کی توجہ کا مرکز تو بنے گی۔ اس لیے اس نے ساڑھی باندھ لی اور چپل بھی جچ رہی تھی۔ یوں تو اسے اونچی ہیل والی سینڈل کا شوق تھا لیکن وہ دراز قد تھی ہیل پہن کر تو اور زیادہ لمبی لگتی۔ زرافے جتنی لمبی، اسی لیے وہ اپنا شوق کم ہی پورا کرتی۔

پرس سے اس نے آئینہ نکال کر دیکھا۔ لپ اسٹک ہونٹوں کی بناوٹ کے حساب سے ہی تھی۔ ابھی وہ آئینہ واپس رکھ ہی رہی تھی کہ ایک سرخ گاڑی جھٹکے سے پاس آن رکی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے اسے اشارے سے بلایا۔ انداز دلربا سے چلتی وہ گاڑی کے قریب آئی۔ لڑکے نے شیشہ نیچے کیا۔ وہ جھکی، ساڑھی کا پلو کھسکا۔ اس نے سنبھالنے میں جان بوجھ کر دیر کی۔ دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ سیدھی ہوئی۔ چکر کاٹ کر دوسری طرف سے آئی اور دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ فٹ پاتھ خالی رہ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' نوجوان نے پوچھا تھا۔

''نام میں کیا رکھا ہے سرکار'' وہ بلاوجہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ 'ایک تو ان عورتوں کا اندازِ گفتگو کس قدر خراب ہوتا ہے۔' نوجوان نے سوچا تھا۔ اسے لڑکی میں واحد کمی اس کا پنجابی لب ولہجہ اور گفتگو کا انداز لگا تھا۔

''پھر بھی......'' نوجوان نے اصرار کیا۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کو گول شکل میں سکیڑا۔ ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر اپنا نام بتایا۔

''چنبیلی''

چنبیلی اپنا نام بتانے میں تامل سے کام نہیں لیتی تھی۔ نام چھپا کر اس نے کیا کرنا تھا۔

''ہم م م گڈ......گڈ نیم!'' مونچھوں تلے لب مسکرائے تھے۔

☆......☆......☆

یوں تو اس گھر کا آنگن کافی بڑا تھا لیکن آس پاس کے سبھی گھر دو منزلہ اور سہ منزلہ تھے اس لیے بھری دوپہر میں بھی دھوپ تمام آنگن کا احاطہ نہ کر پاتی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ شام کی اداسی میں ایک طمانیت سی تھی۔ ماحول ساکن سا تھا۔ کڑاہی سے شوخ شوخ پکوڑے نکالنے کے بعد چندا نے چولہا بند کیا۔ کتنے دنوں سے اس کا دل خود اپنے ہاتھ کے بنے پکوڑے کھانے کا چاہ رہا تھا۔ سو آج بنا بھی لیے۔ جار پکوڑوں سے لگ بھگ بھرا ہی ہوا تھا۔ جار کو ڈھکن لگا کر ائر ٹائٹ کرتے ہوئے چندا نے سیفی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''سیفی......سیفی کہاں مر گیا؟'' اور چند لمحوں میں ہی سیفی باورچی خانے کی چوکھٹ تھامے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے چندا! کیوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی ہو، ساتھ والے کمرے میں ہی تھا۔ آرام سے پکارتی تو بھی سن لیتا۔'' سیفی کی حیثیت اس گھر میں دوسرے درجے کے شہری کی سی تھی اور اس حیثیت کا تعین خود بخود ہی ہو گیا تھا۔ اسی لیے چندا، چنبیلی اور دیگر تمام لڑکیاں سیفی کو بے دھڑک کام کا کہتیں اور یہ اس گھر کا بغیر کیا بغیر سنا اصول ہی تھا کہ سیفی نے سب لڑکیوں کے کام کرنے ہیں۔

''اچھا......اچھا باتیں مت بنا جا کر دیکھ چنبیلی اٹھی کہ نہیں۔ نہ اٹھی ہو تو اٹھا دینا۔ آٹھ گھنٹوں سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں سوتے ہوئے۔''

سیفی نے جواباً کچھ نہ کہا اور وسطی کمرے کی طرف چلا گیا۔ چہرے مہرے سے مرد لگنے والے سیفی کے انداز و اطوار میں نسوانیت یہاں رہائش پذیر لڑکیوں سے بھی زیادہ بھری تھی۔ دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی بتا دیتا کہ اس کا تعلق درمیانی صنف سے ہے۔ چنبیلی نیند سے تو بیدار تھی پر کسلمندی سے چارپائی پر لیٹی کروٹیں لے رہی تھی۔

''چنبیلی منہ ہاتھ دھو لو، چندا نے آج بطور خاص سب کے لئے پکوڑے تلے ہیں۔'' سیفی نے اٹھلا کر کہا اور مزید کچھ کہے سنے واپس چلا گیا۔

چنبیلی کچھ دیر یونہی لیٹی رہی اور ہاتھ سے پاؤں میں چپل پھنسائی غسل خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گرمیوں کے پانچ بجے سمجھو ابھی دن کا کافی حصہ رہتا ہے۔ لمبے دن اور چھوٹی راتیں چونکہ ان کا کاروبار تو رات کو ہی چلتا ہے۔ اس لیے مختصر راتوں والے اس موسم میں انہیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

چنبیلی غسل خانے کے باہر لگے واش بیسن پر منہ دھو رہی تھی جب چندا نے کمرے سے جھانک کر چنبیلی کو آواز دی۔

''چنبیلی بس کر اب، آجا، تیرے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ قسم سے پیٹ میں چوہے دوڑ دوڑ کر تھک چکے ہیں۔''

''تو شروع کر میں آتی ہوں۔'' بیسن کے ساتھ ہی میلا سا تولیہ ٹنگا تھا، چنبیلی تولیے سے منہ پونچھنے لگی۔

☆......☆......☆

یہ شریفوں کا محلہ نہیں تھا بیشتر گھروں میں کئی کہانیاں پوشیدہ تھیں۔ اس لیے کسی کو روک ٹوک نہ تھی یوں تو ملک کا دستور اس طرز ماحول کی ہرگز اجازت نہ دیتا تھا۔ لیکن ایوان میں بیٹھے لوگوں سے لے کر نچلے طبقے کے تمام اہلکاروں کو معاشرے میں موجود شر کو ختم کرنے میں نہ ہونے کے برابر دلچسپی تھی اسی لیے تو جو تھا، جیسا تھا بس چل رہا تھا۔

دراز قد چنبیلی اسی محلے کی پہلی گلی کے چوتھے گھر میں رہتی تھی۔ کھلے آنگن اور دو کمروں پر مشتمل گھر۔ پتا نہیں ان کی رہائش گاہ کے لیے گھر کا لفظ درست تھا بھی کہ نہیں، بہرحال چنبیلی سمیت نصف درجن لڑکیاں اور سیفی اسے گھر ہی کہتے تھے۔ گھر کا نقشہ کچھ قدیم طرز کا تھا۔ دو کمرے آمنے سامنے، آنگن کے ایک کونے میں باورچی خانہ، دوسرے کونے میں بیت الخلا اور



غسل خانہ۔ گھر کی عمر لگ بھگ نصف صدی سے زیادہ تھی۔ اور وہ درودیوار سے اپنی عمر خود ہی بتاتا تھا۔ اس خستہ حال گھر نے شاید مزید شکستگی کا سفر ہی طے کرنا تھا۔ کیونکہ اس کی تعمیر نو کرانے والا کوئی نہ تھا۔

جب نوید اچنبیلی کو یہاں لایا تھا تب پہلے سے ہی ادھر چار لڑکیاں اور ایک سیفی موجود تھا۔ چنبیلی اس گھر میں آنے والی آخری لڑکی ثابت ہوئی بقول نوید۔

ابھیڑ بکریوں کی طرح لڑکیوں کا مجمع جمع کرنے سے بہتر ہے بندہ چند ہیرے ہی رکھے اور ان کی تراش خراش کا کام ہمہ وقت کرے۔ ان سب کے علاوہ ایک عورت بھی گھر میں رہتی تھی۔ جو نویدے کی بیوی تو نہ تھی لیکن بیوی جیسی ضرور تھی۔ نویدے کی بیوی کو مرے ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ کالے یرقان کے مریض نویدے کو اس بیماری کی پیچیدگیوں نے آلیا۔ شاید وہ تھوڑا مزید جی لیتا اگر اسے بیماری کے دوران طبی امداد دی جاتی لیکن نویدے کے ساتھ ہمدردی کسی کو نہ ہوئی۔

یہاں تک کہ جس دن نوید امرا اس دن بھی لڑکیاں معمول کے مطابق بن ٹھن کر شام کو گھر سے نکل گئیں۔ سیفی نے ہی بارے باندھے کسی خیراتی ادارے کو بلا کر نویدے کی تدفین کا کام کروایا۔ ایک چھت تلے رہنے والی لڑکیوں میں چنبیلی کی چندا سے گاڑھی دوستی تھی۔ ایک دوسرے سے باتیں شیئر کرتیں۔ دکھ سکھ تو زندگی میں تھے ہی نہیں، زندگی ایک سیدھی لکیر جیسی تھی۔ اگر دکھ سکھ ہوتے تو شائد وہ بھی بانٹ لیتیں۔

یوں تو آج بھی چنبیلی کا کل والی ساڑھی پہن کر ہی باہر جانے کا دل تھا لیکن جب اس نے پہننے کی نیت سے بلاؤز اٹھایا تو پچھلے حصے میں ایک سوراخ نظر آیا۔ یہ سگریٹ کے جلنے کا نشان تھا اور کس قدر نمایاں تھا۔ یقیناً گزشتہ رات کا ہی تحفہ تھا۔ چنبیلی منہ ہی منہ میں اس لڑکے کو گالیاں دینے لگی۔ ''سالا رات کتنا کہا دھیان، دھیان مگر کہاں سنتے ہیں'' چنبیلی کے منہ سے ایسی ایسی گالیاں نکلیں کہ کسی شریف مرد نے بھی کبھی نہ سنی ہوں گی۔

''چنبیلی کتنی دیر ہے تجھے! دیکھ میں تیار ہوگئی'' چندا کی آواز باہر سے آئی۔ یہ تو جیسے ایک معمول تھا۔ چندا ہمیشہ کام پہلے نمٹا لیتی اور پھر چنبیلی کا انتظار کرتی۔

''صبر کر آتی ہوں'' بلاوز ضائع ہونے کا قلق چنبیلی کے لہجے کی کڑواہٹ میں گھلا تھا اور جب ایک گھنٹے بعد رات کی تاریکی میں لڑکیاں بنی ٹھنی گاڑیوں والوں کے انتظار میں سڑک کنارے کھڑی تھیں تو چندا قدرے دھیمے انداز میں چنبیلی سے مخاطب ہوئی۔

''چنبیلی کبھی تم نے سوچا کہ آئندہ زندگی کیسے گزاریں گے۔'' جب سے نوید امرا تھا چندا کو وسوسے سے ہونے لگے تھے۔ ایسی باتیں اب وہ اکثر و بیشتر کرتی رہتی۔

''نہیں سوچا اور نہ میرا سوچنے کا ارادہ ہے۔ تُو یہ ایک سوال مجھ سے ایک مہینے میں کم از کم سو بار پوچھ چکی ہے، تھکتی نہیں ایک ہی بات سوچ سوچ کر'' چنبیلی نے بے رُخی سے جواب دیا۔ چندا نے اس بے رُخی کی پروا نہ کی۔

''پھر بھی......'' چندا بولنا چاہتی تھی لیکن چنبیلی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''دیکھ چندا تُو دماغ صبح ہی چاٹ لینا ابھی کام ڈھونڈنے دے۔ ان کمینوں کے ساتھ مسکرا کر نہ بات کرو تو ان سالوں کی جیب سے پیسے ہی کم نکلتے ہیں۔ اسی سے ایک سیاہ گاڑی رکی۔ بڑھی ہوئی توند والے گنجے نے تمام لڑکیوں کو نگاہوں میں تولا اور پھر چنبیلی کو اشارے سے بلایا۔ محض تین فقروں کے تبادلے کے بعد چنبیلی آدمی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ آدمی گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ میک اپ سے لتھڑے ہوئے چہرے والی باقی لڑکیاں اپنی اپنی قسمت کا انتظار کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

یہ شہر کے بہترین اسکولوں میں سے ایک تھا۔ اس سکول نے ملک کو کئی ڈاکٹرز، انجینئرز، فنانسر اور یہاں تک کہ ایک عدد وزیراعظم بھی دیا تھا۔ سکول کی ساکھ غیر معمولی تھی۔ فیس بھی غیر معمولی تھی۔ اسی لیے ایلیٹ کلاس کے بچے اس سکول میں پڑھنے اور زندگی کے امور سیکھنے آسکتے تھے۔

بریک کے دوران دسویں جماعت میں ایک غل غپاڑہ مچا تھا۔ پونی ٹیل والی یونیفارم میں ملبوس

لڑکیاں بلاوجہ ہنستے ہوئے دانستہ طور پر اپنی پونی ہلاتی تھیں۔ نوعمر لڑکے بھی بلاوجہ گتھم گتھا تھے۔ بالیدگی کی سیڑھیاں چڑھنے والے دسویں جماعت کے یہ طلباء اب صنف مخالف میں کشش محسوس کرتے تھے۔ اور ان کے اطوار سے یہ بات جھلکتی بھی تھی۔

سبھی لڑکے لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھے بیشتر بچے سنیکس لمکٹ ٹائپ کی چیزیں کھا بھی رہے تھے۔ ایک اسفر ہی تھا جو خاموش سر جھکائے بیٹھا میتھ کی کتاب کو تکے جا رہا تھا۔ نہ کسی سے بات اور نہ ہی کچھ کھانے کی خواہش۔ حالانکہ اس کی ہم جماعت جڑواں بہن سدرہ خوب چہک رہی تھی اور لڑکیوں کے گروہ میں سب سے نمایاں تھی۔ کلاس کا پوزیشن ہولڈر چاہے جہاں بھی ہو اور جو کچھ بھی کر رہا ہو نمایاں ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے سدرہ کا نمایاں پن کوئی زیادہ اچنبھے کی بات نہ تھی۔

جواد نے ایک بھرپور نظر سدرہ پر ڈالی اور پھر ایک نظر سر جھکائے بیٹھے اسفر کو دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور جا کر اسفر کے ساتھ اس کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

''سفر۔''

''ہوں۔'' سفر نے ایک نظر ساتھ آکے بیٹھنے والے لڑکے کو دیکھا اور پھر سے نظریں کتاب پر جمالیں۔

''کیا کر رہے ہو؟''

پڑھ رہا ہوں...... جواد نے مسکرانے لگا۔

''بھلا کوئی میتھ بھی پڑھتا ہے۔ میتھ تو پریکٹس کرنے والا سبجیکٹ ہے۔'' سفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ نظریں کتاب پر جمائے بیٹھا رہا۔

''اتنے چپ کیوں رہتے ہو میرے یار۔'' عموماً جواد 'یار' جیسے القابات نہیں استعمال کرتا تھا لیکن اسفر سے اپنائیت دکھانا مطلوب تھی۔

''ایسی بات نہیں۔'' اسفر کا جواب حسب توقع نپا تلا تھا۔

''اچھا اسفر ایک بات کہنا تھی تم سے۔'' جواد نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولا۔ اسفر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا جواد کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

''مجھ سے دوستی کرو گے اسفر۔'' جواد نے کہا۔ اداس آنکھوں والے اسفر نے بے یقینی سے جواد کو دیکھا تھا۔

''کیوں؟'' حیرانگی بے وجہ نہ تھی۔

''کیونکہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔''

اسفر آنکھوں میں حیرت لیے جواد کو دیکھتا رہ گیا۔ بھلا وہ بھی کسی کو اچھا لگ سکتا ہے، کتنی حیران کن بات تھی۔

دور لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی دعا نے ایک نظر اسفر پر ڈالی تھی۔ جو ایک کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھا جانے کیا باتیں کر رہا تھا۔ دعا کو یقین تھا کہ باتیں بنیادی طور پر جواد کی طرف سے ہی ہو رہی تھیں۔ ایک بھرپور مسکراہٹ دعا کے لبوں پر آن ٹھہری اپنا یہ خالہ زاد پچھلے کچھ عرصے سے اس کو اچھا ہی لگے جا رہا تھا۔ اپنی کیفیت وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆......☆......☆

روشنیوں کا ایک جہان تھا۔ بڑی اسکرینز پر لڑتے کردار، جوش و جذبے سے بٹن دباتے نوجوان۔ سنسنی خیز میوزک۔ زور زور سے بٹن دبانے کی آواز۔ جگمگاتی لائٹس، منہ سے نکلے اضطراری نعرے۔ ہر چیز پر نوجوانی کا رنگ چھایا تھا۔ جواد کا خیال تھا سحر زدہ ماحول یقیناً اسفر کے جوش جذبے کو ہوا دے گا مگر اس کے برعکس اسفر مرعوب ہوا اور بے حد ہوا۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اَن فٹ محسوس کرنے لگا۔

''کیا ہوا اسفر؟ تمہیں اسٹوڈیو پسند نہیں آیا۔'' گیم اوور ہوئی تو جواد نے پیچھے کھڑے اسفر سے مخاطب ہوا۔

''نہیں۔'' اسفر نے زبان پھیر کر اپنے ہونٹ تر کیے۔ ''نہیں اچھی جگہ ہے۔ لیکن بس اب چلیں۔'' گھبراہٹ اسفر کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ جواد نے تھوڑی جھنجھلاہٹ محسوس کی لیکن ظاہر نہ کی چلو چلتے ہیں یوں تو جواد ابھی مزید کچھ دیر گیم کھیلنا چاہتا تھا لیکن اسفر کے کہنے پر گیم اسٹوڈیو سے واپسی کا ارادہ باندھا۔

''یہ چھوٹی گاڑیاں مجھے پسند تو نہیں لیکن ابو ابھی بڑی گاڑی دینے پر راضی نہیں ہوتے۔ لیکن دیکھ لینا کالج میں بڑی گاڑی پر ہی جایا کروں گا۔''

Cultus ڈرائیو کرتے ہوئے جواد کہہ رہا

تھا۔ اسفر خاموش بیٹھا ونڈ و اسکرین سے باہر دیکھتا رہا ۔یوں بھی اس جیسا متوسط گھرانے کے لڑکے کو چھوٹی بڑی گاڑی کے فرق سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ یہ باتیں اس کی ذہنی استعداد سے آگے کی باتیں تھیں۔ بلاشبہ متوسط گھرانے کے لڑکے بھی آگے کا سوچتے ہیں لیکن اسفر جیسے لڑکے کے لیے یہ باتیں بعید از قیاس تھیں۔

"خاموش کیوں بیٹھے ہو اسفر کچھ تو بولو۔ میں ہی بولے جارہا ہوں۔" جواد نے گیئر بدلتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا بولوں، سمجھ نہیں آتا۔" اسفر گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔

"کچھ بھی...... گھر کی باتیں، کلاس کی باتیں۔ اِدھر کی باتیں، اُدھر کی باتیں، کچھ تو بولو دوستوں سے تو ہر بات شیئر کی جاتی ہے۔" جواد کی بات کے جواب میں بھی اسفر کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اب کے بار جواد نے بریک ایک آئسکریم پارلر کے سامنے لگائی۔

"بس یار کچھ کھانے کا موڈ نہیں۔ مجھے گھر ڈراپ کر دو۔" اسفر کی نظر سامنے پارلر کے بورڈ پر پڑی تو اس نے کہا۔ "آئسکریم ایسی چیز نہیں جس کے کھانے کے لیے موڈ بنانا پڑے، تم اترو تو، یہاں کی اسٹرابری فلیور آئسکریم میری پسندیدہ آئسکریم ہے۔"

چاروناچار اسفر کو اترنا ہی پڑا۔

"تم کوئی اور فلیور لینا پسند کرو گے یا تمہارے لیے بھی اسٹرابری فلیور ہی منگواؤں۔" مینو کارڈ اسفر کی طرف کھسکاتے ہوئے جواد نے کہا تھا۔

"اسٹرابری فلیور ہی منگوالو۔"

جواد نے اشارے سے ویٹر کو پاس بلایا۔ آرڈر نوٹ کروایا۔

"جواد ایک بات کرنی ہے تم سے۔"

"کرو۔" جواد نے کہنی میز پر ٹکادی اور غور سے اسفر کو دیکھا۔ اضطرابی طور پر نچلا لب چباتا خود اعتمادی سے محروم لڑکا کہیں سے تو سدرہ کا بھائی نہیں لگتا تھا۔

"میں۔" "تم برا مت منانا، اسفر میز کی سطح کو کھرچتے ہوئے ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"دوستوں کی باتوں کا برا نہیں منایا جاتا۔ کروبات۔"

"میں تم سے دوستی برقرار نہیں رکھ سکتا۔"

"کیوں ؟" جواد کے لیے یہ بات خلافِ توقع نہ تھی۔

"تم میں اور مجھ میں کچھ مشترک نہیں اور یہ کہ تم اور میں اگر دوست ہیں تو پھر یہ سب......" اسفر سے بات ہی نہ بن پائی۔

"اسٹیٹس کے فرق کی بنا پر تم دوستی نہیں رکھنا چاہتے۔ جواد نے وہ بات بڑے آرام سے کہہ دی جو بات حقیقت ہونے کے باوجود اسفر کبھی نہ کہہ پاتا۔

اسفر خاموش رہ گیا۔

دوستی ایک خالص جذبہ ہے۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ دوستی کے لیے یہ ایک بات ہی اہم ہے اور دوستی کی ٹھوس وجہ بھی معاشرتی فرق کی بنا پر دوستی نہ کرنا بے وقوفی ہے۔ ہاں البتہ میں تمہیں ناپسند ہوں یا پھر میری کوئی بات تمہیں ناپسند ہو جس کی بنا پر تم دوستی نہ کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔" جواد نے بات پوری کی۔ حسبِ معمول کچھ کہنے سے پہلے اسفر کچھ دیر سوچتا رہا۔

"تم اچھے لڑکے ہو لیکن یار اس طرح گھومنا پھرنا ،مہنگے گیمز، سٹوڈیوز، آؤٹنگ ،میری پاکٹ اجازت نہیں دیتی تو پلیز......"

"چپ کر کے بیٹھو اور فضول کی باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔" جواد نے تھوڑا ڈپٹ کر کہا تو اسفر چاہنے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکا۔ آئس کریم آگئی اور دونوں آئسکریم کھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جواد گویا ہوا تو اس نے حتی المقدور کوشش کی کہ اس کے لہجے میں کوئی غیر معمولی پن نہ ہو۔

یار ایک بات بتاؤ! تم اور سدرہ جڑواں بہن بھائی ہو۔ تم دونوں میں اچھی دوستی بھی ہوگی۔" اسفر کا منہ کی طرف چمچ لیتا ہاتھ لمحے بھر کو رکا تھا۔

"ہاں۔ مم دھیما سا ہاں تھا۔

"بڑی ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔ یونہی تو فرسٹ پوزیشن نہیں لیتی۔ تم بھی اس سے ہیلپ لیا کرو نا۔ اچھے گریڈز کے لیے۔ اسفر چپ چاپ آئسکریم کھاتا رہا۔ بڑی مشکل سے تو جواد نے سدرہ کا ذکر چھیڑا تھا لیکن اب سمجھ نہ آرہا تھا کیا بات کرے۔ چاہ کر بھی وہ سدرہ سے متعلق مزید کوئی بات پوچھ سکا اور نہ کہہ

سکا۔ آئسکریم ختم ہوئی تو انہوں نے واپسی کا قصد کیا۔

اسفر کو اس کے محلے کی گلی پر اتارنے کے بعد جواد گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ آج کا دن جیسے ضائع ہی گیا بس للو سے بات کرنا کتنا مشکل ہے اور سدرہ تک کیسے رسائی حاصل کروں...... جواد کو تاؤ آرہا تھا۔

☆......☆......☆

تمھارا ناشتہ ختم نہیں ہوا ابھی تک۔ زوار کی ساری عادتیں بدرجہ اتم تم میں موجود ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم صرف اکیلے زوار کے ہی بیٹے ہو۔"

فاخرہ کا لہجہ حسب معمول تیر تھا۔ فائلیں سمیٹنے کے بعد اب وہ آئینے میں اپنے چہرے کا ناقدانہ جائزہ لے رہی تھی۔ اسفر نے بقیا توس یونہی پلیٹ میں چھوڑ دیا اور کرسی دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہوگیا ناشتہ ختم تو جلدی باہر آؤ۔ سدرہ کب سے تیار ہو کر گاڑی میں جا بیٹھی ہے۔"

فاخرہ نے فائلیں سنبھالیں اور باہر جانے کو مڑی اسفر نے اپنا بیگ سنبھالا اور تیزی سے ہال کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ ہال کمرے میں زوار قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ روزانہ کئی کئی گھنٹے قرآن پڑھتے تھے، کئی بار اسفر کا دل چاہا باپ سے پوچھے کہ آپ اس قدر قرآن مجید پڑھتے ہیں، اب تو یقیناً آپ کو حفظ ہو چکا ہوگا لیکن وہ کبھی پوچھ نہ پایا۔

"اللہ حافظ۔" ابوزوار نے ایک محبت بھری نظر بیٹے پر ڈالی۔ (اللہ حافظ) یوں تو زوار بھی کبھی کبھا رہی محبت کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن اسفر عہد جدید کی ماں کی نسبت باپ کو دل کے زیادہ قریب محسوس کرتا تھا۔ گاڑی میں ماں کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر سدرہ تھی۔ ڈیڑھ سال ہو چکا تھا گاڑی لیے ہوئے اسکول جاتے ہوئے۔ فرنٹ سیٹ پر ہمیشہ سدرہ ہی بیٹھی تھی، یہاں تک کہ کبھی فاخرہ نے بھی سدرہ کو نہ ٹوکا تھا کہ بھائی کو آگے بیٹھنے دو۔

"کہاں رہ گئے تھے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔" فاخرہ نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ اسفر نے دو منٹ کے دیر کی وجہ نہ بتائی۔

اسفر تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہیں سدرہ سے پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں وہ تو ہے ہی اتنی انٹیلی

جنٹ۔ تم اپنا ساؤ میٹرک کے نمبر ساری زندگی بندے کے ساتھ رہتے ہیں۔ تھوڑی محنت دکھاؤ کم از کم کلاس کے ٹاپ ٹین میں تو آجاؤ۔ تمہارا تو اے گریڈ ہی مشکل سے آتا ہے۔

"میں کوشش کروں گا۔" اسفر کا لہجہ مدہم تھا۔ ساری کوشش تو وہ کر چکا تھا۔ سارا سارا دن پڑھ کر بھی دیکھ لیا تھا ٹی وی اور دوسرے مشاغل ترک کر لیے تھے، تمام لائحہ عمل اختیار کرنے کے باوجود وہ اے گریڈ سے آگے کبھی نہ بڑھ پایا تھا۔ ماں کی نصیحت کے جواب میں اس نے کوشش کرنے کا تو کہہ دیا تھا لیکن اب وہ جاننے لگ گیا تھا کہ تمام کوششیں بے کار ہیں وہ ایک متوسط طالب علم تھا اور اس نے متوسط ہی رہنا تھا۔

"کچھ بہن سے ہی سیکھ لو۔ اس سے تھوڑی مدد لے لیا کرو کبھی تو وہ دن لاؤ جب مجھے تم پر بھی فخر ہو۔" سدرہ چہرے پر ایک مسکراہٹ لے آئی اور پیچھے مڑ کر بھائی کو دیکھا تھا۔ اس سے سدرہ اسفر کو کس قدر بری لگی تھی یہ اسفر ہی جانتا تھا۔ فاخرہ نے اسکول کے گیٹ کے سامنے دونوں کو اتارا۔ دونوں بہن بھائی آگے پیچھے سکول میں داخل ہوئے تھے۔ جب وہ کلاس روم میں داخل ہو رہے تھے اسی وقت دعا باہر جارہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو ؟" سدرہ نے دعا سے پوچھا تھا۔

"اسٹیشنری شاپ تک، تم نے کچھ لینا تو نہیں۔"

"ہم دونوں نے کیمسٹری کی نوٹ بک لینی تو ہیں۔ لیکن اسفر لے آئے گا۔ ویسے بھی کیمسٹری کا لیکچر تو بریک کے بعد ہے۔

"تو آجاؤ اسفر لے آتے ہیں، یوں بھی مس عمارہ عموماً لیٹ آتی ہیں۔" اسفر دعا کے ساتھ جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہ کر پایا اور جانا ہی پڑا۔

اپنی یہ خالہ زاد اور ہم جماعت بھی اسفر کو زیادہ پسند نہ تھی۔ سدرہ کا ہی دوسرا ورژن تھی۔ سو جہاں تک ہوتا وہ احتراز ہی کرتا۔

"اتنے پریشان کیوں ہو؟" دعا کا پہلا فقرہ یہی تھا۔ نہیں تو اسفر کا جواب مختصر تھا پتہ نہیں کیوں وہ لوگوں

کو پریشان محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کی حتی المقدور کوشش ہوتی کہ نارمل نظر آئے۔

''ایگزامز تو سمجھو سر پر آ گئے ہیں۔ دس پندرہ دنوں تک پریپ لیو بھی مل جائے گی۔ اسفر اچھے سے پڑھنا۔ میری بڑی خواہش ہے کہ سکول کی طرح ہم تینوں کالج میں بھی کلاس فیلوز ہوں۔ اب تو مقابلہ اتنا زیادہ ہے۔ کم مارکس والے طلباء کو اچھے کالج لفٹ ہی نہیں کرواتے۔ دعا کی اس عام بات میں کیا خاص خواہش پوشیدہ تھی وہ دعا ہی جانتی تھی۔

''اچھا۔ اچھا اسفر چڑ سا گیا۔'' ہر وقت ایک ہی بات...... اگر وہ فطین نہیں تھا تو ہر کوئی اسے کیوں جتاتا تھا۔ اور دعا اسفر کے اچھا کہنے کے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو بات ہی تو کر رہی ہوں۔''

☆......☆......☆

رات کی تاریکی میں ایک اسرار پوشیدہ تھا۔ لیکن چنبیلی کی اس اسرار سے پرانی دوستی تھی۔ بے فکر انداز میں چیونگم چباتی وہ کسی قیمتی گاڑی کا اپنے پاس رکنے کا انتظار کر رہی تھی۔ یوں تو موٹر سائیکلوں والے اور بعض اوقات پیدل لوگ بھی اس کے پاس آ کر رکتے لیکن چنبیلی کو اپنی جوان خوبصورتی کا احساس تھا اسی لیے موٹر سائیکل والوں اور پیادہ لوگوں کو کبھی لفٹ کرانے کی اس نے زحمت محسوس نہ کی۔ ہمیشہ گاڑی والے کا ہی انتظار کیا، چاہے کتنی دیر ہو جائے اسے پروا نہ تھی۔

آج ہفتے کی رات تھی پچھلے تین مہینوں سے ایک ناغے کے ساتھ ایک لڑکا ہر ہفتے کی رات کو چنبیلی کو اپنے ساتھ لے جاتا سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ اچھے سے ہوٹل میں لے جاتا۔ الٹی سیدھی فرمائشیں بھی نہ کرتا بعض اوقات تو اشتہا انگیز خوشبو والا کھانا بھی کمرے میں منگوا لیتا۔ کیسا مزیدار کھانا ہوتا اور دام بھی اچھے دیتا۔

چنبیلی کی دلی خواہش تھی کہ آج بھی وہی لڑکا آ جائے۔ شعوری، لاشعوری طور پر چنبیلی اسی لڑکے کا انتظار کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر ٹہل رہی تھی۔ جب سرخ گاڑی پاس آن رکی۔ گاڑی کو چنبیلی نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ سوال جواب کا تکلف کیے بغیر چنبیلی دھڑلے سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

''قسم سے صاحب آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' چنبیلی گویا ہوئی تو تیز پان مسالے کی خوشبو بدر کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

''چنبیلی یار پلیز یہ ہفتے کی رات کو یہ گھٹیا پان مسالہ نہ کھایا کرو۔'' یار بدر کا تکیہ کلام تھا۔

''جو حکم صاحب۔'' چنبیلی نے کہتے ہوئے اپنے دانتوں کو نمائش کی تھی۔

''صاحب کہنے کی بجائے اگر تم مجھے میرے نام سے پکارنا چاہو تو پکار سکتی ہو ویسے تمہیں شائد میرا نام نہ پتا ہو میرا نام بدر ہے۔

بدر نے مونچھوں کے کونوں کو بل دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے لیے آپ، صاحب ہی ٹھیک ہو۔ نام کا کیا کرنا ہے۔ ویسے مجھے آپ کا نام پتا ہے۔ آخر اتنا وقت ساتھ گزارا ہے۔'' چنبیلی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی اور بدر کو اپنے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

صبح پانچ بجے بدر نے ہینگر پر لٹکی شرٹ اتار کر جسم کی زینت بنائی۔ والٹ سے کچھ نیلے نوٹ نکال کر چنبیلی کے پاس رکھے اور شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے لیٹی ہوئی چنبیلی کے ساتھ آن بیٹھا...... چنبیلی ہنوز لیٹی رہی۔

چنبیلی اگلے ہفتے گوجرانوالہ چلو گی میرے ساتھ میرے دوست کا ڈیرہ ہے۔ ہم دوست اکٹھے ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تم چلو گی تو تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

چنبیلی نے بدر کی بات خاموشی سے سنی لیٹی سے اٹھ بیٹھی اور گویا ہوئی۔

نہ صاحب نہ میں کمرے میں روشن ہونے والی شمع ہوں محفلوں کی سجاوٹ نہیں بنتی۔ میری طرف سے معافی قبول کرو۔

''بلاوجہ مت ڈرو چنبیلی! میرے سارے دوست بہت اچھے ہیں۔'' بدر نے حتی المقدور دلاسے اور تسلیاں دیں اور ممکنہ طور پر ملنے والی کثیر رقم کے بارے میں بھی بتایا لیکن چنبیلی کا جواب ایک ہی رہا۔

''نہیں۔''

☆......☆......☆

''بالکل ٹھیک کیا تُو نے انکار کر کے، انجانا بندہ ایسے پرائے شہر میں لے جانے کی بات کر رہا ہے۔ وہاں جا کر چاہے جان سے مار ڈالے اور مرا ہوا جسم جانوروں کی خوراک بننے کے لیے کسی ویرانے میں ڈال آئے۔'' چندا کی بات سن کر چنبیلی کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''تیرا تو دماغ خراب ہے۔ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔'' چنبیلی اٹھ کر جانے لگی تو چندا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بیٹھا دیا۔

''ٹھیک سوچتی ہوں! اپنی حفاظت کے لیے سوچنا تو پڑے گا نا۔ جانے کیوں چندا کی چھٹی حس کو پچھلے کچھ عرصے سے عجیب و غریب تحفظات درکار تھے۔

''حفاظت۔'' چنبیلی قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ ''میری بہن تجھے وہم کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ بلاوجہ کے وہم نہ پال، پاگل ہو جائے گی۔'' چنبیلی لاڈ بھرے انداز میں چندا کے سر پر چپت لگائی کمرے سے باہر چلی آئی۔

''سیفی۔ سیفی!!'' آنگن میں پڑی چارپائی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے سیفی کو آوازیں دینے لگی تھی۔ ''سیفی باہر گیا ہے۔ میں نے سگریٹ لانے کو بھیجا ہے۔'' رانی نے کمرے سے ہی آواز لگائی۔ اور کچھ لمحوں بعد کمرے سے نکل کر چنبیلی کے ساتھ چارپائی پر آن بیٹھی اور بالوں کی چٹیا کھولنے لگی۔

''تیرے تو اچھے خاصے بال سفید ہو چکے ہیں رانی۔ چنبیلی نے رانی کے بالوں کی سیاہی سے جھلکتے ہوئے بے شمار سفید بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ رانی یہاں رہائش پذیر لڑکیوں میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ بلکہ لڑکی نہیں پکی عمر کی عورت تھی۔ جس کی جوانی ڈھلنا شروع ہو چکی تھی۔

''ہاں چنبیلی ٹھیک کہتی ہے۔ بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں۔ گاہکی بھی کم ہو گئی ہے۔ اب تو بالوں کو پکا کالا رنگ کروانے کا سوچ رہی ہوں۔'' رانی کے لہجے میں پریشانی کی جھلک تھی چٹیا کھول کر رانی نے بال پورے پھیلا لیے اور روکھے بالوں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ روکھے سوکھے چوہیا کی دم جیسے بال۔

''تو اداس کیوں ہوتی ہے یہ تو ہونا ہی ہے عمر تو ڈھلنی ہی ہے۔ پریشانی فضول ہے۔'' مجھے سمجھ نہیں آ رہا سب لوگ اداس و پریشان کیوں ہیں۔ اندر چندا کو یہ وہم لاحق ہے کہ کوئی گاہک اسے مار ڈالے گا اور اس کی لاش کو چیل کووں اور گیدڑوں کے لیے جنگل میں چھوڑ آئے گا اور تجھے بوڑھے ہونے کا غم، غم پالنے کا کیا فائدہ۔ زندگی جیسی ہے بس مزے سے گزارو۔ چنبیلی کی بات کا رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بس اب روکھے سوکھے بالوں کو ہی الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

''سیفی سے کتنی بار کہا ہے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے جانے سے پہلے پوچھ لیا کرے پر اس نے کہاں دھیان دینا ہے۔ میں نے بھی سگریٹ منگوانے تھے۔

''سگریٹ۔ کیوں چنبیلی ابھی صبح ہی تو تُو نے پوری ڈبی منگوائی تھی۔'' رانی کے لہجے میں استعجاب آن ٹھہرا۔

''ختم ہو گئی وہ......'' چنبیلی نے بے پروائی سے جواب دیا کر۔

''چنبیلی تو کچھ زیادہ ہی تللے کرنے لگی ہے۔ کل بھی تُو نے مہنگی شراب منگوائی تھی۔ اگر زیادہ کمائی ہو رہی ہے تو کچھ سنبھال لے، محفوظ کر لے۔ کچھ مجھ سے ہی سبق لے لے۔ بڑھاپا گزارنے کے لیے بندے کو واقعی جمع کرنا چاہیے۔ میری طرح پیسہ جتنا کمایا اتنا لٹایا کے حساب سے چلی تو میری طرح بیٹھی افسوس کر رہی ہو گی۔'' رانی نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ چنبیلی نے ان بیزار کن باتوں پر کان دھرنے کی زحمت ہی نہیں کی اور ناک سے ان دیکھی مکھی اڑاتے ہوئے بولی۔

''تم سب لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔''

☆......☆......☆

یہ بہار کا خوشگوار موسم تھا۔ سہ پہر کے چار بجے کا وقت تھا۔ پیلی دھوپ کھڑکی سے جھلکتی کمرے کو تازگی بخش رہی تھی۔ زوار آرام کرسی پر بیٹھے قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ ایک منزل ختم ہوئی تو انہوں نے کلام شریف کو بند کیا، کچھ دیر کتاب مقدس کو

یونہی گود میں لیے بیٹھے رہے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، لمبی دعا مانگی۔ پھر اٹھے اور کتابِ مقدس کو اونچے رحل میں رکھ دیا۔

زندگی کی بے ثباتی پر تو ہر انسان کو ایمان ہے لیکن زوار کا ذہن زندگی کے اس پہلو کو خوب سوچتا۔ ان کو زندگی سے دلچسپی بھی جیسے نہ ہونے کے برابر تھی۔ رخسار کے بعد فاخرہ کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کے لیے نئے بندھن میں بندھے تو ضرور تھے۔ لیکن ذہنی طور پر وہ اسی دور میں رہتے تھے جب رخسار زندہ تھی اور سونی کی قلقاریاں گھر کے آنگن میں چہکا کرتی تھیں۔

سونی...... ایک کسک لاحاصل سی تھی جو دل میں دبی تھی۔

پیاری سونی...... زوار نے آنکھیں موندلیں آرام کرسی کی پشت سے لگالیا۔ کتنی دیر وہ اسی انداز میں بیٹھے سوچنے نا سوچنے کی درمیانی کیفیت میں رہے تاوقتیکہ موبائل کی آواز نے انہیں اٹھنے پر مجبور نہ کردیا۔

موبائل چارجنگ پہ لگا تھا جب تک وہ موبائل تک پہنچے کال مسڈ کال میں تبدیل ہو چکی تھی۔

موبائل پر راشدہ آپا کا نام دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ایک سادہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔ موبائل ہاتھ میں لیے وہ دوبارہ آرام کرسی پر آن بیٹھے اور راشدہ آپا کو کال بیک کرنے لگے۔ دوسری طرف راشدہ نے فون دوسری گھنٹی پر اٹھالیا۔

''زوار کیسے ہو؟ کتنے عرصے بعد تمہاری آواز سن رہی ہوں۔'' راشدہ کے لہجے کا خلوص زوار کے کانوں میں امرت کے رس کی طرح ٹپکا۔

''آپا میں اچھا ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' زوار تم تو مجھے بھول ہی گئے ہو مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ کبھی خود تم نے مجھے کال کی ہو۔ ہر دفعہ میں ہی کال کرتی ہوں۔ مانا کہ میں تمہاری سگی بہن نہیں چچا زاد ہوں مگر رضائی بہن...... اور بچپن میں میں نے تمہارے بچپن کے سارے لاڈ سگے بھائی کی طرح اٹھائے ہیں اور ایک تم ہو......''

زوار پانی پانی ہو گئے۔ ہر سال چھ مہینے بعد جب بھی راشدہ آپا کی کال آتی۔ وہ اسی طرح محبت بھرے شکوے کرتیں اور ہر دفعہ ہی زوار یونہی شرمندہ ہوتے۔

کیسا عجب سا چکر تھا، کیسی خلوص بھری محبت تھی جو ان دودھ شریک بہن بھائی میں تھی۔

''بس آپا میری نااہلی ہے آپ شرمندہ نہ کریں۔'' زوار کے پاس ایسے الفاظ نہ تھے جو بطور تلافی پیش کیے جاتے لیکن پھر بھی انہوں نے معذرت کرلی۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو یہ کونسی نئی بات ہے۔ تم کال کرو یا نا کرو تمہاری بہن تمہیں کبھی نہ بھولے گی۔''

راشدہ ہنسنے لگیں حالانکہ ہنسنے والی بات نہ تھی جب بندہ محبت سے جڑے رشتوں سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ عام باتیں بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں۔

''اچھا زوار میں نے تمہیں خاص دعوت کے لیے فون کیا ہے۔ اس مہینے کا آخری عشرہ تم نے بیوی بچوں سمیت ادھر گاؤں میرے پاس گزارنا ہے۔ بچوں کے سکول کا بہانا ہرگز مت بنانا۔ میٹرک کے امتحان ختم ہو چکے ہیں۔ اسکول سے کالج شفٹ ہوتے وقت دو مہینوں کا وقفہ ہوتا ہے۔ میٹرک کے امتحان کا انہیں یوں پتا تھا کہ ان کی اپنی بیٹی میٹرک میں تھی۔

''خیریت تو ہے آپا! آپ بے حد خوش محسوس ہو رہی ہیں۔'' زوار نے بہن کے لہجے میں چھپی خوشی محسوس کرلی تھی۔

''ہاں زوار میں خوش ہوں۔ جب ماں بیٹے کی شادی کرتی ہے تو بے حد خوش ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ارسلان کی شادی طے کردی ہے اگلے مہینے کی پچیس تاریخ کو ہے۔'' زوار ایک لمحے کے لیے چپ سے ہو گئے لیکن اگلے لمحے وہ کہہ رہے تھے۔

''آپا بڑی خوشی کی بات ہے اپ کو پیشگی مبارک ہو۔''

''اوہو یہ خالی مبارک تم اپنی وہنی جیب میں سنبھال رکھو۔ تم بس میرے ارسلان کی شادی پر آ رہے ہو اور بیوی بچوں سمیت آرہے ہو، وعدہ کرو۔ دیکھو زوار اگر تم مجھے رنجیدہ کرنا چاہتے ہو تو ضرور جواز تراش لو۔ لیکن یہ سوچ لو تمہاری آمد مجھے

بے پایاں خوشی دے گی۔ راشدہ کے لہجے میں آس آن ٹھہری۔ ماں بھری آس...... اور زوار لوگوں کی آسوں کو یاسوں میں تبدیل کرنا برا سمجھتے تھے اور یہ تو پھر راشدہ آپا تھیں۔

''تو پھر زوار تم آرہے ہو نا۔ وعدہ......'' راشدہ ایک بار پھر پوچھ رہی تھیں۔

''جی آپا میں وعدہ کرتا ہوں آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ فاخرہ اور بچے بھی انشاء اللہ آئیں گے۔''

اور پھر کچھ دیر مزید باتیں ہوئیں۔ راشدہ نے سمدھنوں سے متعلق تفصیل سے بات کی اور ان کی بے تحاشا تعریف کی یہ تو زوار راشدہ کی ہر بندے میں خصوصیات ڈھونڈنے کی صفت سے واقف تھے کوئی اور ہوتا تو انہیں یقیناً ماورائی دنیا کے نیک کرداروں سے جاملاتا۔

فون بند کرنے کے بعد زوار کچھ دیر فون کو گھورتے رہے۔ انہیں راشدہ کی برسوں پہلے کی بات یاد آنے لگی جب سونی پیدا ہوئی تھی۔

''لو زوار تمہاری بیٹی ہی نہیں بلکہ میری بہو بھی پیدا ہوئی ہے۔ تم ابھی اپنی بیٹی کو میرے ارسلان سے منسوب سمجھو۔ بچی کو میری امانت سمجھ کر پالنا اور خبردار بچوں کے بڑے ہونے پر اس رشتے سے انحراف کیا تو۔'' راشدہ کے لہجے میں استحقاق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

''آپ بھی نا آپا۔ بس کمال کرتی ہیں۔'' زوار نے بیٹی کا ماتھا چوما تھا۔

اور آج ارسلان کی کہیں اور شادی کی نوید ملی تھی۔ کہاں ارسلان اور کہاں سونی۔ کہاں ہو سونی؟ زوار کے لہجے میں تھکن اتر آئی اور انہوں نے آنکھیں موندلیں۔

☆......☆......☆

میٹرک کے امتحانات کے لیے اس نے اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کی تھی۔ لیکن وہ زیادہ پُرامید نہ تھا۔ یہ آج تک نہ ہو سکا کہ وہ سدرہ سے سبقت لے جاتا تو اس بار کیسے ہو جاتا۔

امتحانات کے بعد کی چھٹیوں میں آسودہ سی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ سدرہ مطمئن و شاداں ٹی وی کے پروگرامز دیکھا کرتی۔ کوکنگ چینلز نے اسے بھی کوکنگ کی طرف راغب کرلیا۔ چند دن تو وہ صبح شام ہی کچن میں گھسی رہی۔ لیکن کوکنگ چینلز پر سکھانے جانے والے کھانوں کی ریسی پیز ذرا ٹیڑھی ہوتیں اشیاء مارکیٹ میں دستیاب نہ ہوتیں اور اگر دستیاب ہو جاتیں تو ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتیں۔ چنانچہ وہ چند دنوں میں ہی اکتا گئی۔ اور پھر اسے ناول پڑھنے کا شوق چرایا۔ صبح شام ناول پڑھتی نظر آتی۔

آس پاس کی سہیلیوں سے اس قدر ناول برآمد ہو گئے کہ ایک ڈھیر ہی لگ گیا۔

''اسفر اگر تمہارے گریڈز زیادہ اچھے نہ آئے تو پھر تم کس کالج میں داخلہ لو گے؟'' اس دن سدرہ ناول پڑھ پڑھ کر بھی بیزار ہو گئی تھی جب اس نے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھے بھائی سے پوچھا تھا۔

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' اسفر نے گول مول سا جواب دیا۔ وہ سدرہ سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''پھر بھی کچھ تو سوچ رکھا ہو گا تم نے۔'' سدرہ نے پاس پڑے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پاؤچ نکالا اور پاؤچ میں سے ببل گم نکال کر چبانے لگی۔

''نہیں کچھ خاص نہیں سوچا۔'' اسفر کا جواب اس بار بھی پہلے جیسا تھا۔

اب بتا بھی دو، میں تمہاری بہن ہوں دشمن نہیں جو تم مجھ سے باتیں چھپاتے ہو سدرہ ببل گم چباتے ہوئے ٹانگ جھلا رہی تھی۔ اسفر نے ایک نظر بے فکری بہن کو دیکھا تھا۔ جو اس کے مستقبل کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ الفاظ سے زیادہ لہجہ اپنائیت سے خالی تھا۔ ایک خواہ مخواہ کی اداسی اسفر کے گرد ہالہ سا بنانے لگی۔ سدرہ کو مزید کوئی جواب دیے بنا اس نے پاس چارپائی پر پڑا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کرلیا۔

سدرہ کو اسفر کا یہ نروٹھا سا انداز برا لگا اس لیے تو دل جلانے کے لیے مزید باتیں کرنے لگی۔

''ویسے اسفر تم نے محنت بڑی کی۔ کیا دن، کیا رات بس پڑھتے ہی رہے۔ میں تو کبھی ایسا نہ پڑھ پاؤں لیکن دیکھ لینا مجھ سے زیادہ نمبر نہیں لے پاؤ

گے۔" اسفر نے بس ایک نظر بہن کو دیکھا اور پھر سے ٹی وی سکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا حالانکہ ضرورت نہ تھی۔

"کیا ہے اسفر کچھ بولو تو سہی ایسی بھی کیا بے رخی۔" سدرہ کو تھوڑی چڑ سی ہونے لگی۔

"کیا بولوں سدرہ تم ٹھہریں ذہانت کا مرصع مجسمہ اور میں ایک لڑکا میں تو تمہارے اسٹینڈرڈ کی باتیں کر ہی نہیں سکتا۔" اسفر کے ان الفاظ میں ایک شکوہ تھا لیکن سدرہ کو اس شکوے کی نسبت وہ طمانیت عزیز تھی جو اسفر کی ایسی باتوں سے اسے ملتی تھی۔

"نہیں اب ایسی بات بھی نہیں۔" منہ سے یہ الفاظ ادا کرنے والی سدرہ انداز سے یہ جتا رہی تھی ہاں بالکل ایسی بات ہی ہے۔ یہ دنیا کے انوکھے بہن بھائی ہی تھے۔ بہن برتر ہونے کے زعم میں مبتلا اور بھائی احساسِ کمتری کا شکار حالانکہ ابھی تو دونوں میٹرک سے فارغ ہوئے تھے لیکن ابھی سے عجیب و غریب سے جذبات کا شکار تھے۔

ان دونوں کی یہ بے ڈھب بات چیت مزید چلتی اگر زوار کمرے میں نہ آتے۔ زوار عموماً اپنے کمرے تک ہی محدود رہتے۔" کھانا بھی اپنے کمرے میں کھاتے، ہال کمرے کا رخ کبھی کبھار ہی کرتے۔

"آئیں ابو بیٹھیں۔" اسفر نیم دراز انداز سے اٹھ کر بیٹھا اور ٹی وی کا والیوم بھی کم کیا تھا۔ سدرہ بھی ببل گم چباتے ہوئے تھوڑا سیدھی ہو بیٹھی۔ ٹانگ ہنوز جھلاتی رہی۔

"کیسی جا رہی ہیں تمہاری چھٹیاں۔" اسفر نے ٹی وی کا ریموٹ باپ کی طرف بڑھایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹی وی بند کرنے کا اشارہ کیا۔

"بور سارا دن گھر میں پڑے ان چونا اتری دیواروں کو دیکھتے رہو۔" سدرہ نے سر جھٹکتے ہوئے نخوت سے کہا تھا۔

"اور اسفر تم سناؤ تم بھی بیزاری سے تنگ ہو؟" زوار نے مسکرا کر کہا بیٹے کو دیکھا تھا۔ بیٹی کی نسبت بیٹا ان کے دل کے زیادہ قریب تھا۔

"نہیں ابھی کچھ زیادہ نہیں، بلکہ مجھے تو یہ فرصت اچھی لگ رہی ہے۔ ساری زندگی تھوڑا ایسے آرام سے بیٹھنا ہے ادھر رزلٹ آیا اور ادھر ہم کالج میں ایک بار پھر سے زندگی کی دوڑ شروع۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا، زندگی مقابلے کا ہی تو نام ہے۔" ببل گم سے تنگ آ کر سدرہ نے منہ سے نکالا اور پاس پڑی ڈسٹ بن کی نظر کیا۔ زوار نے دونوں بچوں کی بات سنی اور پھر گویا ہوئے۔

"بچوں کل تمہاری پھوپو راشدہ کا فون آیا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے کی شادی ہے۔ انہوں نے پوری فیملی کا مدعو کیا ہے۔ تم لوگ ویسے فارغ ہو۔ تمہاری ماں سے کہہ دیتے ہیں وہ بھی سکول سے دو تین دن کی چھٹیاں لے لے تو کیوں نہ گاؤں کا چکر لگا لیا جائے۔"

زوار مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اوہ نہیں ابو میں نے گاؤں نہیں جانا۔ کس قدر عجیب لوگ ہوتے ہیں وہاں۔" سدرہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"لیکن بیٹا شادی کا فنکشن ہے۔ تم انجوائے کرو گی اور یہ عجیب لوگوں سے کیا مراد ہے تمہاری، بھئی گاؤں کے لوگ بلاشبہ کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن دل کے معاملے میں بہت اچھے ہوتے ہیں۔" زوار بیٹی کو ٹوکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ بیٹی کا منہ پھٹ انداز انہیں پسند نہ تھا لیکن زیادہ کچھ کہتے بھی نہ تھے۔

"اوہوں......" سدرہ کے چہرے سے بیزاری عیاں تھی۔

ابو مجھے گاؤں پسند نہیں۔ جب ہم سکس اسٹینڈرڈ میں تھے تب بھی تو گئے تھے۔ بچی بڑے برے دن گزرے۔" سدرہ جھرجھری لے کر بولی۔

اس قطعیت بھرے انداز پر زوار کو سمجھ نہ آیا کہ کیسے بیٹی کو قائل کریں یوں بھی خاموش طبع فطرت انہیں کہاں بحث کی اجازت دیتی تھی۔ آج پھر بھی انہوں نے طبیعت کے برخلاف تھوڑا بہت قائل کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

اسفر چند لمحے باپ بیٹی کا مکالمہ سنتا رہا پھر اس نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

ابو سدرہ نہیں جانا چاہتی تو کوئی بات نہیں وہ اکیلی

ادھر ہی رہے گی۔ میں امی اور آپ چلیں گے۔ بچی بہت مزہ آئے گا۔ مجھے تو گاؤں کی سادگی بہت پسند ہے۔" اسفر کا لہجہ چڑاتا ہوا تھا۔ سدرہ نے بھی لمحے سے بیشتر اسفر کی ٹون پہچان لی لیکن پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "امی بھی نہیں جائیں گی دیکھ لینا۔"

☆......☆......☆

ہائی ایس جھٹکے سے رکی تو زوار چونکے باپ بیٹا گاڑی سے اترے اپنا سامان اٹھایا اور پگڈنڈی پہ چل دیے۔ سدرہ نے ٹھیک کہا تھا۔ فاخرہ نے بھی گاؤں جانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ یوں بھی راشدہ کے ساتھ رشتہ داری انہیں غیر ضروری لگتی تھی، شوہر کی رضاعی بہن غیر ضروری رشتہ ہی ہوتا۔

فاخرہ نے منع کیا تو زوار نے بھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اب بھلا وہ بیوی اور بیٹی کو اکیلے چھوڑ کر جانے سے تو رہے۔

"زوار تم کس صدی کی باتیں کر رہے ہو۔ تم میرے اور سدرہ کے لیے اپنا ٹرپ مس مت کرو۔ میں اکیلے پن سے نہیں ڈرتی اور اپنا خیال بہتر انداز میں رکھ سکتی ہوں۔" فاخرہ کا لہجہ اعتماد سے بھرا تھا۔ زوار شش و پنج میں مبتلا ہو گئے۔ راشدہ آپا نے کئی بار فون کر کے تاکید بھی تو کی تھی۔ آخر انہوں نے یہ سوچا کہ اسفر گھر رہ جاتا ہے آخر اب وہ چھوٹا نہیں سولہ سال کا مرد بچہ تھا۔ لیکن یہاں گنگا کا رخ الٹی سمت تھا۔ اسفر نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔

"ابو دو دن کی بات ہے میں گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ امی بہت بہادر ہیں۔ کچھ نہ ہوگا۔" یوں بھی ان مردانہ شان والی عورتوں کی نگہبانی اسفر نے کیا کرنی تھی۔ چنانچہ باپ بیٹا ہی آئے۔ ایک رات اور دو دن گزارنے کے لیے۔

یہ گاؤں لاہور شہر سے لگ بھگ سو کلو میٹر دور تھا۔ ہائی ایس نے اڑھائی گھنٹوں میں پہنچایا۔ اسفر کو گاؤں ویسا ہی لگا جیسا کہ چار سال پہلے تھا۔ راشدہ کے گھر اندر داخل ہونے کی نسبت زوار نے دستک دے کر انتظار کو ترجیح دی۔ دستک کے جواب میں راشدہ کا دوسرے نمبر والا بیٹا ذیشان آیا۔

والہانہ انداز سے ملنے کے بعد۔ ذیشان اندر چلنے کو کہہ رہا تھا۔

"بیٹا شادی کا گھر ہے اور تمہارے گاؤں میں پردے کا رواج ہے۔ تم مہمان خانہ کھلوا لو۔" ذیشان کے اصرار کے باوجود زوار اندر جانے کو راضی نہ ہوئے۔ ذیشان نے جا کر ماں کو بتایا۔ راشدہ خود دروازے پر آ گئیں۔

"زوار تم اندر آتے ہو یا پھر میں باہر آؤں۔" راشدہ کا لہجہ مصنوعی خفگی لیے ہوئے تھا۔ زوار نے دہلیز پار کی، اسفر نے باپ کی پیروی کی۔

سالوں بعد تم سے مل رہی ہوں۔" راشدہ نے بھائی کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ "بیٹا تمہارا ابھی بھی بچہ لگتا ہے کچھ کلایا پلایا کرو۔ اسفر اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ اس کے گال کھینچے جاتے لیکن پھوپو نے گال ہی کھینچے۔

"بیوی بچی کو کیوں چھوڑ آئے۔ تمہاری بچی آتی تو خوب خوش ہوتی۔ یہاں تو اس کی ہمجولی بھی ہے بھئی تمہارے یہ جڑواں بچے میری خولہ سے بس سال ہی تو چھوٹے ہیں۔ راشدہ جیسے ساری باتیں ابھی کر لینا چاہتی تھیں۔ زوار اس عجلت بھرے انداز پر مسکرا دیے۔

خولہ! اسفر کے ذہن میں چھم سے وہ شرارتی لڑکی آ گئی جو اس قدر شرارتی تھی کہ اس کے لیے شرارتی سے زیادہ جامع مفہوم والا لفظ ہونا چاہیے تھا۔

اسفر کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆......☆......☆

"کٹ، کٹ، کٹ، کٹ......" مرغیاں آگے بھاگتیں اور خولہ پیچھے۔ پہلے اسفر سمجھا کہ وہ مرغیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن جب صحن کا چوتھا چکر پورا ہونے کو تھا تب اسفر کو اندازہ ہوا کہ نہیں وہ ان مرغیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔

"ہو ہو ہو، ہرا......" لمحے بھر کو وہ رکی اور پھر منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتی مرغیوں کے پیچھے دوڑنے لگی۔

"کیسی عجیب مصروفیت ہے۔ مانو بندہ سولہ سال کا نہیں بلکہ چھ سال کا ہے۔" برآمدے میں چارپائی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے اسفر نے اکتائے ہوئے انداز میں سوچا تھا۔

بڑے سے احاطے کے وسط میں کھجور کے تین درخت یوں ساتھ ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے، جیسے قریبی دوست باہم گلے مل رہے ہیں۔ ایک طرف نیم کا گھنا درخت تھا۔ وہ درخت اس قدر گھنا تھا کہ احاطے کا بڑا حصہ اس کی چھاؤں میں تھا۔ ایک طرف کچھ بھینسیں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ ان کے بیٹھنے کے انداز میں اس قدر اطمینان اور بے فکری تھی کہ اسفر کو ان پر رشک آنے لگا۔ ''ہم انسانوں سے زیادہ بے فکر تو یہ جانور ہوتے ہیں۔ کھایا، پیا، آرام کیا۔'' اسفر نے کہنی ٹکائے ہوئے سوچا تھا۔

اسی وقت راشدہ باورچی خانے سے نکلیں۔ جا تو وہ ہال کمرے کی طرف رہی تھیں لیکن خولہ کو یوں صحن میں دوڑیں لگاتے دیکھ کر لمحے بھر کو رک گئیں۔

''شادی والا گھر ہے اور اس لڑکی کو کوئی پروا نہیں۔ خولہ آکر ہاتھ ہی بٹادو۔ زردہ کے لیے پڑی ساری کشمش صاف ہونے والی ہے۔ جانے کب پڑی ہوگی'' راشدہ اب منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہی تھیں جو اسفر کی سماعت تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ خولہ نے مرغیوں کے پیچھے بھاگنے کا شغل چھوڑا اور منہ بناتی برآمدے کی طرف آنے لگی۔ ''اسفر بیٹے، تم کیوں اکتائے بیٹھے ہو۔ ذیشان بھی دیگیں پکوانے میں مصروف ہے۔ ورنہ وہی تمھیں وقت دیتا یا پھر تم ادھر ہی چلے جاؤ۔ جہاں دیگیں پک رہی ہیں۔'' راشدہ مصروف لہجے میں بولیں اور پھر ہال کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور خولہ باورچی خانے کی طرف جا کر کشمش صاف کرنے کی بجائے اسفر کے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''ہماری اماں بھی نا، کرفیو لگائے رکھتی ہیں اب ایسی بھی کیا جلدی'' چارپائی پر بیٹھ کر وہ پاؤں جھلانے لگی۔

''اچھا سدرہ کیوں نہیں آئی'' خولہ کا لہجہ سرسری سا تھا۔

''بس ویسے ہی'' اسفر کا جواب بھی سوال سے زیادہ سرسری تھا۔

کچھ دیر دونوں چپ ہی رہے۔ پھر اسفر بولا۔

''تمھارے پیپرز کیسے ہوئے تھے''

''پاس ہو جاؤں گی''

''اور پھر آگے کیا ارادہ ہے؟ کون سے سبجیکٹ لوگی؟''

''آگے......'' خولہ نے تحیر سے آنکھیں پھیلائیں اور سرنفی میں ہلایا۔ ''نا بابا، میں نے آگے نہیں پڑھنا۔ یہ دس جماعتیں ہی بہت ہیں۔ آگے پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ مفت میں خود کو ہلکان کرنا۔'' سادہ سی خولہ ہر محنت طلب کام کے معاملے میں چور تھی۔

اسفر دیکھ کر رہ گیا۔

''کاش میں بھی ایسے سوچ سکتا'' اپنی زندگی خود ہی مشکل بنانے والے اسفر کی سوچ ایسی ہی ہوئی تھی۔

''یہ مانو کہاں ہے۔ صبح سے غائب ہے۔ بہت آوارہ ہے۔'' خولہ کو اچانک یاد آیا تھا۔

''مانو کون''؟ اسفر مانو سے ناواقف تھا۔

''MyP e t'' خولہ نے منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں کہا تھا۔

اسفر نے برآمدے میں لٹکے پنجرے میں قید طوطے کو دیکھا تھا جو پنجرے کی دیواروں پر پنجے گاڑے کبھی اوپر تو کبھی نیچے جا رہا تھا۔ پھر صحن میں گھومتی مرغیوں کو دیکھا تھا جو نظر نہ آنے والی چیزیں چگ رہی تھیں۔ عین سامنے ایک کبوتروں کا چھجا بھی تھا جہاں ایک کھوکھے میں بے شمار کبوتر تھے۔ اور غٹرغوں کرتے نہ تھکتے تھے۔

''طوطے، کبوتر اور مرغیوں کے علاوہ تم نے بلی بھی پال رکھی ہے'' اسفر کو دوچند حیرت ہوئی۔

''نہیں میں نے بلی تو نہیں پالی مجھے بلیاں اچھی نہیں لگتیں۔ کبوتروں اور طوطوں کو کھا جاتی ہیں''۔ خولہ نے پاؤں جھلانا بند کیا اور بلیوں سے متعلق ناپسندیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''ابھی تو تم نے کہا مانو تمہاری Pet ہے۔''

جواباً خولہ نے آنکھیں میچ کر ایک تیز نگاہ اسفر پر ڈالی تھی۔

''دنیا کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ مانو بلی کا ہی نام ہوتا ہے......'' ابھی خولہ مزید کچھ کہتی لیکن اسے داخلی دروازے سے مانو اندر آتا دکھائی دیا۔

''لو آ گیا مانو'' کہتے ہوئے خولہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں گیا تھا مانو کس قدر آوارہ ہو گیا ہے۔ مجھے ایسی آوارگیاں پسند نہیں'' خولہ اس گیم شحیم بھورے کتے سے مخاطب تھی جو دور سے ببر شیر لگ رہا تھا۔

''یہ مانو ہے'' کتے کو دیکھتے ہوئے اسفر کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہ لڑکی تو بالکل پاگل ہے۔'' سوچتے ہوئے اسفر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔

اور خولہ مانو کو ابھی تک ڈانٹے جا رہی تھی اور جناب مانو لاتعلقی سے دم ہلائے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

شادی ویسی ہی سادہ سی تھی جیسی عموماً دیہاتوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ بارات کو کھانا لڑکی والوں نے کھلایا اور اگلے دن گھر سے باہر احاطے میں دیگیں تیار ہوئیں۔ شامیانے لگوا کر ولیمے کا کھانا کھلا دیا گیا۔ شام کو زوار اور اسفر واپسی کے لیے تیار تھے۔

''اتنی بھی کیا جلدی زوار کچھ دن رک جاتے۔ تم کون سا روز روز آتے ہو؟ راشدہ جانتی تھیں کہ زوار مانے گا تو نہیں۔ لیکن اپنی طرف سے انھوں نے پوری کوشش کی کہ کیا پتا کامیاب ہو ہی جائیں۔

''نہیں آپا، شادی میں شرکت کر تو لی ہے۔ بس اب اجازت دیں۔ وہاں لاہور میں فاخرہ اور سدرہ اکیلے ہی ہیں''

''ان کے اکیلے پن کا خوب کہا۔ جب دو دن کے لیے آرہے تھے تو ساتھ ہی لیتے آتے''۔ راشدہ کا گلہ بے جا نہ تھا۔

''بس آپا فاخرہ کو سکول سے چھٹی نہ مل سکی۔'' زوار نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ سرکاری اسکول کی استانی کو سکول سے دو دن کی چھٹی نہ مل سکی کیسا بودا بہانہ تھا۔

راشدہ آپا نے بھی بھرم رکھنے کو اس بارے میں مزید کچھ نہ کہا۔

''اچھا چلو کل صبح صبح چلے جانا'' راشدہ نے کم از کم آج رات کے لیے روکنا چاہا۔

ساتھ کھڑے اسفر نے جب دیکھا کہ باپ اور پھوپو کی یہ گفتگو ابھی مزید کچھ دیر جاری رہے گی تو اس کے دل میں ایک بار خولہ سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ باپ کو ''ابھی آیا'' کہتے ہوئے اٹھ آیا۔

''آپا کیا صبح کیا رات، بس اجازت دیں چلتے ہیں'' زوار کا لہجہ دھیما تھا۔

''تم آئے اور اب اتنی جلدی چل دیے تم سے کتنی باتیں کرنی تھیں۔ اب جانے کب موقع ملے۔ شادی کے ہنگامے میں تمھارے ساتھ بیٹھ بھی تو نہ سکی۔'' راشدہ کے لہجے میں قلق آن ٹھہرا۔

زوار دھیمی مسکراہٹ لیے چپ بیٹھے رہے۔

''اچھا زوار بہت ساری باتیں نہ سہی لیکن چند باتیں تو کر سکتی ہوں۔ اب آدھا گھنٹہ تو تم میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہو یا پھر آدھے گھنٹے کی تاخیر بھی نہیں کر سکتے۔'' راشدہ نے کہا تو بے اختیار زوار بولے۔

''آپا شرمندہ تو نہ کریں''۔

الفاظ ترتیب دینے اور بات شروع کرنے میں راشدہ نے کچھ وقت لگایا۔

''زوار تم میرے بھائی ہو۔ اب میں تم سے یہ باتیں نہ کروں گی تو کون کرے گا۔'' راشدہ ہچکچا رہی تھیں۔

زوار کی پہلے آنکھیں جھکیں اور پھر آہستہ آہستہ سر جھکتا جھکتا اس قدر جھک گیا کہ ٹھوڑی سینے سے آن لگی۔

''اتنے سال گزرنے کے بعد بھی میں تمھارے اور فاخرہ کے درمیان کی دوری محسوس کر رہی ہوں۔ یہ اچھا تو نہیں...... کب تک ماضی میں جیو گے۔ تمھیں احساس نہیں کہ تمھارا ماضی تمھارے حال کو خراب کر رہا ہے۔''

زوار کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔

راشدہ خاموش ہوئیں تو کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''تم سونی کو ابھی تک نہیں بھولے نا۔ یہ فرض کیوں نہیں کر لیتے رخسار کے ساتھ سونی بھی مر گئی تھی۔''

زوار نے سر اٹھا کر بہن کو دیکھا۔ آنکھوں میں ایسا

درد پنہاں تھا کہ راشدہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''آپا میری جگہ آپ ہوتیں تو آپ کیا کرتیں؟''

میں تو مر ہی جاتی۔ راشدہ کے ذہن میں سوچ ابھری تھی۔ زبان سے انھوں نے کچھ نہ کہا۔ زوار نے ان کی خاموشی کو ہی معانی پہنا لیے۔

''آپا ہر درد کہاں سہا جاتا ہے۔ میں کوشش تو کرتا ہوں'' انھوں نے طویل سانس خارج کی تھی۔

''زوار سدرہ اور اسفر کا ہی سوچو۔ کیا یہ تمھارے بچے نہیں ہیں۔''

''آپا ان ہی کی وجہ سے تو آج زندہ ہوں۔ یہ نہ ہوتے تو شائد میں زندہ بھی نہ رہتا۔'' زوار کا لہجہ شکستہ سا تھا۔ راشدہ چاہنے کے باوجود بھی مزید کچھ کہہ سکیں، نہ تردید کرسکیں۔ کہنے سننے کے لیے جیسے کچھ بچا ہی نہ تھا۔ ایک درد بھری خاموشی کمرے میں آن ٹھہری تھی۔

☆......☆......☆

باپ اور پھوپو کو کمرے میں باتیں کرتا چھوڑ کر اسفر کمرے سے نکلا تو خولہ برآمدے میں ہی چارپائی پر بیٹھی نظر آئی۔ ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ لیے طوطے سے بے سروپا باتیں کرتی۔ ویسے یہ عام النسل طوطا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا لیکن جو خولہ مرغیوں کے ساتھ برف پانی کھیل سکتی ہے۔ مانو نامی کتے کو ڈانٹ سکتی ہے وہ نہ بولنے والے طوطے سے باتیں کیوں نہیں کرسکتی تھی۔

''مٹھو کو شادی میں مزہ آیا۔'' طوطے صاحب پنجرے کی دیواروں سے چپکے اوپر سے نیچے آنے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھے اور خولہ کی باتیں جاری تھیں جب اسفر خولہ کے سامنے والی چارپائی پر آن بیٹھا۔

''اسفر تمھیں شادی میں مزہ آیا نا''۔ اسفر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خولہ نے اسفر کو مخاطب کرلیا۔

''ہاں'' اسفر نے حامی بھر لی حالانکہ اسے ایسا کوئی دلچسپی کا پہلو ملا نہ تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ'' اسفر نے ہاتھ میں پکڑا شاپر چارپائی پر پہلو میں رکھ دیا۔

''پوچھو'' خولہ اٹھی اور طوطے کا پنجرہ پنجرے کے لیے مخصوص الگنی پر ٹانگ دیا۔

''تمھارے طوطے کا نام مٹھو کیوں ہے ٹونی یا پپی کیوں نہیں؟'' اسفر مسکرایا تھا۔

''لو بھئی یہ کوئی کتا ہے جو اس کا نام ٹونی یا پپی ہو'' ابھی خولہ کا فقرہ مکمل نہ ہو پایا تھا کہ اسفر کہہ اٹھا۔

''جب تمھارے کتے کا نام مانو ہوسکتا ہے تو تمھارے طوطے کا نام ٹونی کیوں نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی کون سی کتاب میں لکھا ہے ٹونی اور پپی کتے کے نام ہوتے ہیں۔ طوطے کا نام نہیں ہوسکتا۔'' کہتے ہوئے اسفر قلقل ہنسنے لگا اور خولہ کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایسی نگاہیں جیسے ابھی کھا جائے گی۔

''تم شہری لوگ بہت تیز ہوتے ہو'' جب اور کچھ نہ بن پایا تو خولہ نے یہی کہا تھا۔

اسفر ہنستا ہی رہا اور ساتھ پڑا شاپر خولہ کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' خولہ نے ہاتھ بڑھا کر شاپر لے لیا اور کھول کر دیکھا۔ شاپر میں نیلے چمکیلے کاغذ والی چاکلیٹس تھیں۔

''یہ میرے لیے ہیں'' خولہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''صرف تمھارے لیے نہیں۔ ذیشان کو بھی کھلانا۔ وہ نظر نہیں آرہا ورنہ اسے خود ہی کہہ دیتا۔''

''تمھیں کیسے پتا چلا کہ مجھے یہ چاکلیٹس پسند ہیں۔'' خولہ تو جیسے خوشی سے بے حال ہورہی تھی۔

''تم نے خود بتایا تھا۔ چار سال پہلے جب ہم لوگ آئے تھے تب تم نے مجھ سے وعدہ بھی لیا تھا جب اگلی دفعہ آؤں گا تو تمھارے لیے یہ چاکلیٹس لیتا آؤں گا۔'' اسفر بتا رہا تھا۔

''اسفر تمھیں چار سال پہلے والی بات یاد تھی۔ کس قدر ذہین ہو تم۔'' خولہ کی آنکھوں کی چمک ماند ہی نہ پڑتی تھی اور اسفر کے مسکراتے ہونٹ لمحے بھر میں لفظ ''ذہین'' پر ساکن ہوگئے۔

☆......☆......☆

ہفتے مل کر مہینے بنانے لگے تھے۔ یہاں تک کہ چھ مہینے ہوگئے اور بدر یونہی ہفتے کی ہر رات اس فٹ پاتھ کے پاس گاڑی روکتا۔ چنبیلی سرخ گاڑی کو دیکھ کر مسکراتی اور چکر کاٹ کر دوسری طرف آتی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کے بیٹھ جاتی۔

سرخ گاڑی دور چلی جاتی اور فٹ پاتھ خالی رہ جاتا۔ ان چھ مہینوں میں اچھی شناسائی ہوگئی۔ عجب ناآشنا سی شناسائی تھی۔ نہ بدر نے چنبیلی سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی اور نہ کبھی چنبیلی نے بدر سے اس کے بارے میں پوچھا۔ جو جس نے بتایا اگلے نے دلچسپی سے سن لیا۔ ایسے سوال نہ کیے جن کے جواب سامنے والے کو مشکل میں ڈالیں۔

پہلی بار جب بدر نے گوجرانوالہ چلنے کی فرمائش کی تھی تب چنبیلی نے قطعیت سے منع کردیا تھا۔ اگلی بار جب بدر نے کہا تو چنبیلی کے پاس قطعیت کا جواز نہ تھا۔ زیادہ اچھا تو نہ لگا پر وہ راضی ہوگئی۔

اور چنبیلی جہاں مجمع کو متوقع کرلی تھی وہ محض تین دوستوں کی محفل تھی۔ پینٹ شرٹ پہننے والے سلجھے ہوئے طور طریقوں والے لڑکے تھے۔ بات کرتے ہوئے انگریزی کے بے تحاشا الفاظ استعمال کرتے۔ مہنگی امپورٹڈ شراب پیتے۔ ڈیرے کا ماحول بھی کیسا فسوں خیز تھا۔ کھلا صحن، دائیں بائیں شہتوت کے درخت جن پر سرخ شہتوت لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا، تازگی کا احساس۔ شہر لاہور کے دیوار سے دیوار ملے گھروں سے واقف چنبیلی کو یہ کشادگی خوب بھائی تھی۔

گوجرانوالہ سے واپسی پر اس کے کندھے سے لگا سنہری پرس پیسوں کے بوجھ سے بھاری محسوس ہورہا تھا۔ پرس کو تھپتھپاتے ہوئے اسے طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

اور پھر یہ ایک عام سے دن کی بات ہے۔ دو دن بعد قومی تہوار تھا۔ تہواروں کے موقعوں پر عموماً مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسی لیے لڑکیاں چھٹی مناتیں اور آج کل تو چنبیلی کے پاس پیسوں کی ریل پیل تھی۔ اتنے پیسے تھے کہ سنبھالے نہ جاتے۔ چنانچہ وہ پرس میں ڈھیروں پیسے ٹھونسے، چندا کو ساتھ لیے اس شاپنگ مال چلی آئی جس میں برقی سیڑھیاں تھی۔

کتنا بڑا شاپنگ مال تھا کھانے پینے کا سامان، پہننے اوڑھنے کا سامان، گھریلو کراکری، کھلونے، جیولری، فلمیں، کتابیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے دنیا کی ہر چیز اس سٹور مال میں دستیاب ہے۔ چنبیلی اور چندا مرعوب تو ہوئیں پر پرجوش بھی تھیں۔ جیولری کے کاؤنٹر پر چنبیلی نے ایک ہار کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ یوں تو چنبیلی کے انداز اس کے پیشے کی چغلی کھاتے تھے لیکن ایک تو آج وہ شعوری طور پر مہذب بننے کی کوشش کررہی تھی۔ دوسرا سیلز بوائے بھی شریف النفس تھا۔ سو سیلز بوائے کو اندازہ نہ ہوا۔ سیلز بوائے نے ہار نکال کر چنبیلی کو پکڑا دیا۔

''کتنے کا ہے؟'' سیلز بوائے کو خوبصورت لڑکی کا رقم پوچھنے کا انداز عجیب لگا پر اس نے ہار کی قیمت بتادی۔

''چندا لے نہ لوں، کس قدر خوبصورت ہے اور مہنگا بھی نہیں۔'' چنبیلی چندا سے مشورہ کرنے لگی۔ اسی سمے ایک لڑکا، لڑکی جیولری کاؤنٹر پر آن رکے۔ لڑکی بریسلٹ کے ریک میں سے بریسلٹ پسند کرنے لگی۔ لڑکا مشورہ دینے لگا۔ چنبیلی کی بلاارادہ نظر لڑکے پر پڑی تو وہ پرانا شناسا تھا۔ بے اختیار چنبیلی کے منہ سے نکلا۔

''ارے صاحب تو بھی ادھر، کیا کمال بات ہے۔'' یہ فقرہ چنبیلی کے منہ سے بے ارادہ ہی نکلا اور اگلے پل ہی اسے جملے کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔

بدر نے گردن موڑ کر دیکھا، چنبیلی کو دیکھ کر گڑبڑا ہی گیا۔ ایک بریسلٹ کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتی لڑکی لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ نظروں کا زاویہ تبدیل کیا تو دیکھا سستے دو نمبر شیفون کے سوٹ میں ملبوس لڑکی جس نے ہونٹوں کو انتہائی شوخ لپ اسٹک سے رنگا ہوا تھا، کی آنکھوں میں اس کے منگیتر کے لیے شناسائی کی چمک تھی۔

منگیتر صاحب، لڑکی کے کلاس فیلو بھی تھے۔ ایسے حلیے والی لڑکی سے منگیتر کی شناسائی بھلا کیونکر ہوسکتی ہے۔

''بدر کون ہے یہ لڑکی؟''۔ لڑکی یہ سوال کرنے میں حق بجانب تھی۔

(جاری ہے)

پلیٹ فارم

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں ......
جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے





ممتاز احمد

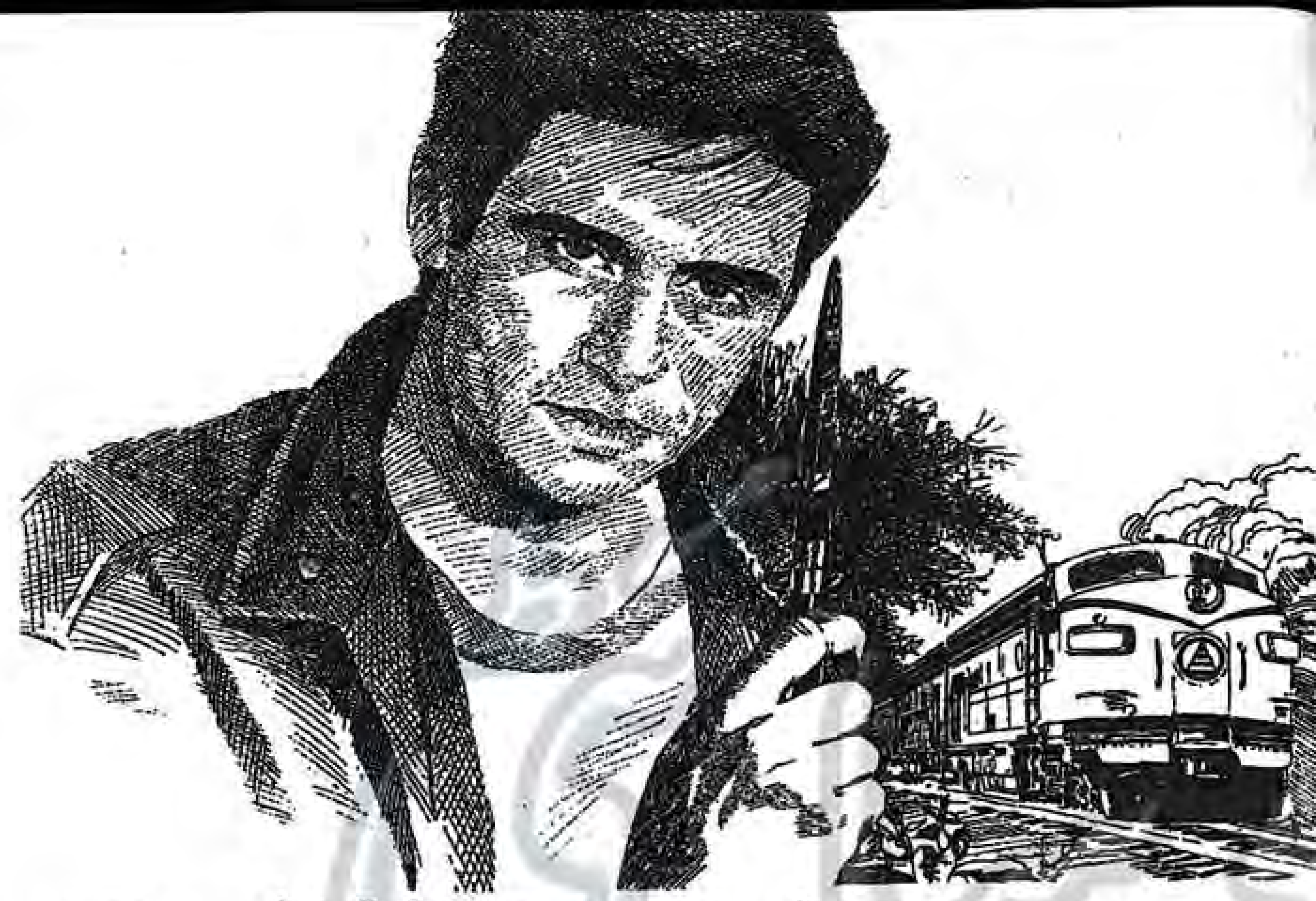
اس نوجوان کی کتھا' جو آ بیل مجھے مار والی صورت حال کا شکار ہو گیا تھا

ٹرین پوری رفتار کے ساتھ ڈھول اُڑاتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ ٹرین میں سوار مسافر خوش گپیوں میں مشغول تھے اور مختلف موضوعات پر، بحث و تکرار بھی ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا، رفتہ رفتہ شام کے آثار رونما ہوئے، اندھیرا چھانے لگا تو ٹرین کے ڈبوں کی لائٹیں آن ہونے لگیں، مختلف اشیاء فروخت کرنے والے جن میں چائے، بسکٹ، کیک، کھلونے اور علاقوں کی مخصوص سوغاتیں اور اشیاء کا نام اور اُن کی خوبیاں گنوا گنوا کر مسافروں کو اِن کی طرف متوجہ کرنے اور بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ کچھ مسافر حسب ضرورت خریداری بھی کر رہے تھے۔ سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔ ٹرین سے باہر مکمل اندھیرے کا راج تھا۔ میری شروع سے ہی عادت ہے کہ صبح شام کھانا کھاتا ہوں دوپہر کا کھانا کبھی نہیں کھایا۔ چنانچہ سورج غروب ہوتے ہی میں کھانا کھالیتا ہوں۔ تو اب بھوک زوروں پر تھی۔ لہٰذا میں نے اپنا ٹفن نکالا اور کھولنے لگا۔ امی نے مجھے چکن آلو کا سالن بنا کر دیا تھا۔ ساتھ چار پانچ روٹیاں تھیں۔ ٹفن کھول کر کھانا شروع کرنے سے پہلے اپنے ساتھ بیٹھے تمام مسافروں کو رسمی طور پر کھانے میں شمولیت کی دعوت دی تو سب نے شکریے کے ساتھ کہا۔ آپ کھائیں اللہ برکت عطا فرمائے۔ مگر ایک مسافر جو کہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تھا وہ میرے ساتھ کھانے میں شامل ہو گیا۔ ہم نے کھانا ختم کیا اور میں نے واش روم میں جا کر برتن دھوئے اور ٹفن صاف کر کے اپنے بیگ میں رکھ دیا۔

تھوڑی دیر گزری تو جس مسافر نے میرے ساتھ کھانا کھایا تھا اُس نے پیٹ درد اور گھبراہٹ، بے چینی کی شکایت شروع کر دی اور ہائے ہائے کرنے لگ گیا تو سب مسافر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اِسی اثناء میں ریلوے کا عملہ اور دو پولیس والے بھی آ گئے تو اُنھوں نے اُس مسافر سے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا ہے تو اُس نے فٹ میری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اِس نے مجھے کھانا کھلایا ہے۔ تو اس کے بعد میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

بس اُس کا یہ کہنا تھا اگلے ہی لمحے پولیس والوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا اور مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ریلوے کا عملہ اُس مسافر کو تسلیاں دینے لگا کہ آپ گھبرائیں مت ہم آپ کو اگلے اسٹیشن پر ہسپتال لے جائیں گے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھیں۔"

جیسے ہی اگلے اسٹیشن پر ٹرین رُکی اُس مسافر کو بھی اور مجھے بھی میرے سامان جو کہ ایک بیگ تھا کے ساتھ ٹرین سے اُتار لیا گیا۔ اُس مسافر کو ریلوے کا عملہ قریبی ہسپتال میں لے گیا جبکہ مجھے پلیٹ فارم پر ہتھکڑیاں لگا کر بٹھا دیا گیا۔



میرا نام فواد ہے۔ میرے والد کریم بخش درزی (ٹیلر ماسٹر) ہیں۔ وہ صبح سے رات گئے تک اپنی دکان میں مصروف رہتے۔ وہ بہت اعلیٰ پائے کے کاریگر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی دکان پر کپڑے سلوانے والوں کا رش لگا رہتا تھا۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن صوبیہ ہے۔ ہماری رہائش ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں تھی۔ امی جان قرآن پاک کی حافظہ تھیں اور محلے کی بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا کرتی تھیں۔ جبکہ کچھ بچیاں حفظ کے لیے بھی آتی تھیں۔ والد صاحب کو بہت شوق تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں۔ والد صاحب کو ہمیں پڑھانے کا شوق جنون کی حد تک تھا تو یہی وجہ تھی کہ ہم بڑی محنت سے تعلیمی مراحل کامیابی سے طے کر رہے تھے۔ میں نے گریجویشن انتہائی شاندار نمبروں سے پاس کر لیا جبکہ صوبیہ انٹر میں تھی۔

دن رات کام کرنے کی وجہ سے والد صاحب بیمار رہنے لگے۔ اُن کی کمر میں شدید درد رہنے لگا اس کے علاوہ اُن کی نظر بھی بہت کمزور ہو گئی اور بلڈ پریشر کا عارضہ بھی اُن کو لاحق ہو گیا۔ جس کی وجہ سے دکان کا کام بُری طرح متاثر ہو گیا۔ ابو کی بیماری اور دکان کا کام کم ہونے کی وجہ سے آمدنی بھی کم ہو گئی جس کی وجہ سے ہمارا پورا گھرانہ مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ میں مزید پڑھنا چاہتا تھا مگر گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ملازمت کر لوں اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ ایم اے کی تیاری بھی کرتا رہوں گا۔ لہٰذا میں نے اخبارات میں ملازمت کے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیے اور ساتھ ساتھ کئی محکموں میں درخواستیں بھجوانا شروع کر دیں۔ پہلے تو والد صاحب نے میری ملازمت کی مخالفت کی مگر گھریلو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور میرے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھنے کے فیصلے کو دیکھتے ہوئے مجھے ملازمت کی اجازت دے دی۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں کے بعد مجھے کراچی سے ایک محکمے کی طرف سے اسسٹنٹ کی پوسٹ کے لیے ٹیسٹ اور انٹرویو کی کال موصول ہوئی۔ چنانچہ میں نے کراچی جانے کی تیاری شروع کر دی اور ٹیسٹ سے دو دن پہلے کی ٹرین میں سیٹ اور برتھ ریزرو کروالی۔ مقررہ تاریخ کو ایک بیگ اور ضرورت کی چیزیں ساتھ لیں اور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ گیا اور جب ٹرین آئی تو سوار ہو گیا

اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین دوپہر ڈھائی بجے ہمارے شہر سے چلی تھی......

ٹرین اُس اسٹیشن پر دس منٹ رُکی اور روانہ ہوگئی۔ مجھے ریلوے کی پولیس چوکی میں لے گئے۔ پہلے تو میری تلاشی لی گئی۔ میرا پرس اور گھڑی قبضے میں لے لی گئی پھر میرے بیگ کی مکمل جامہ تلاشی لی گئی۔ چھوٹے تھانیدار نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور کہا کہ شرافت سے بتادو کھانے میں کیا ملایا ہوا تھا اور کس گروہ سے تمہارا تعلق ہے؟ کب سے یہ وارداتیں کررہے ہو؟

میں نے تھانیدار کو اپنا نام بتایا اور کہا کہ سر کھانے میں کچھ بھی نہیں ملایا تھا۔ میری والدہ نے میرے لیے رات کا کھانا بنا کر دیا تھا۔ وہ تو کھانے سے پہلے میں نے رسماً اپنے ساتھی مسافروں کو کھانے کی دعوت دی تھی تو یہ مسافر فوراً میرے ساتھ کھانے میں شامل ہوگیا۔ وہی کھانا میں نے بھی کھایا ہے مگر مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ دیکھ لیں بھلا چنگا آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ باقی میرا کسی گروہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں اور یہ میری زندگی کا پہلا لمبا سفر ہے۔ حصولِ ملازمت کے لیے کراچی جارہا ہوں۔ میں نے کوئی واردات نہیں کی۔"

مگر تھانیدار میری کسی بات کا یقین نہیں کررہا تھا وہ بار بار مجھ سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اب تک کتنی وارداتیں کرچکا ہوں اور گروہ کا نام بتادوں۔ میں تھانیدار کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی بھرپور کوشش کررہا تھا اور روہانسا ہوکر کہا۔

"سر میری بات کا یقین کریں میں ایک شریف نوجوان ہوں۔ ایک عزت دار گھرانے سے تعلق ہے۔ بس میری غلطی یہ ہے کہ اخلاقاً کھانے کی دعوت دے بیٹھا۔ پھر میں نے اپنا ٹیسٹ اور انٹرویو کا لیٹر بھی دکھایا مگر تھانیدار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اِسے ٹرائل روم میں لے جاؤ اور اس کی خاطر تواضع کرو۔ یہ ایسے نہیں مانے گا۔ سپاہی مجھے دھکیلتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے اور وہاں لے جاتے ہی لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی اور کافی دیر تک میری خوب پٹائی کی اور بار بار یہی کہتے کہ اپنی اصلیت اور گروہ کا نام بتادوں میں مار کھاتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ سب کچھ سچ بتایا ہے میرا کسی گروہ سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہے۔ جب وہ مار مار کر تھک گئے اور میں ادھ مرا ہوگیا تو مجھے پولیس چوکی کی چھوٹی سی حوالات میں بند کردیا گیا۔ جہاں میں ساری رات شدید درد اور تکلیف سے کراہتا رہا۔ کیونکہ بڑی بے دردی سے مجھے مارا گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی مجھے پھر تھانیدار کے سامنے پیش کیا گیا تو تھانیدار نے مجھ سے پوچھا کیوں مسٹر دماغ درست ہوا کہ نہیں......؟

میں رونے لگا اور ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کی منتیں کرنے لگا کہ سر خدا کا واسطہ ہے میری بات کا یقین کریں مگر تھانیدار نے مجھے آٹھ دس تھپڑ مارے اور گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگا کہ لوگوں کو کھانے میں نشہ ملا کر کھلاتے ہو اور اُن کو لوٹتے ہو اور رو رہے ہو؟ اب تمھیں اُلٹا لٹکا کر تمہاری چھترول ہوگی تو سب فرفر بولنے لگو گے۔

مجھے پھر حوالات میں بند کردیا گیا۔ تھوڑی دیر گزری تو اُس ریلوے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر پولیس چوکی میں آیا اور اُس نے بتایا کہ جس مسافر نے اِس لڑکے سے کھانا کھایا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ رات اُسے ہسپتال میں لے گئے تھے تو ڈاکٹر نے اُس کا مکمل چیک اپ کیا تو پتا چلا اُس کا معدہ پہلے سے ہی خراب تھا۔ جب اُس نے کھانا کھایا تو اُسے بدہضمی ہوگئی جس کی وجہ سے اُسے گیس اور پیٹ میں درد ہوا تھا۔ اُسے رات کو ہی دوا دے کر فارغ کردیا گیا تھا اور وہ رات کی ٹرین سے کراچی چلا گیا ہے۔ یہ لڑکا بے قصور ہے اور کھانے میں کوئی نشہ آور چیز نہیں تھی۔ لہٰذا اس لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔" جس پر تھانیدار نے کہا کہ آپ اپنا یہ بیان لکھ کر دیں پھر بڑے تھانیدار صاحب کے آنے پر اُن کی اجازت سے اِس لڑکے کو چھوڑ دیا جائے گا۔ جب مجھے اس صورت حال کا پتا چلا تو میری جان میں جان آئی۔ پھر خدا خدا کرکے بڑے تھانیدار صاحب آئے سارا معاملہ اُن کے گوش گزار کیا گیا اور اسٹیشن ماسٹر کے تحریری بیان کے بعد میری گلوخلاصی ہوئی اور شام تک مجھے رہا کردیا گیا۔ میرا بیگ اور پرس تو مجھے واپس کردیا گیا مگر پرس میں تمام نقدی اور گھڑی پولیس والوں نے غائب کردی۔ میں درد سے چُور اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا بیگ سمیت ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا۔ بھوک سے میرا بُرا حال تھا اور پولیس والوں کی مار پٹائی سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی کیونکہ سارے پیسے پولیس والوں نے نکال لیے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے اسٹیشن ماسٹر صاحب کا جن کے بیان سے میری جان چھوٹی تھی۔ میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر چلا گیا کہ اُن کا شکریہ ادا کردوں۔ اسٹیشن ماسٹر جن کا نام غلام علی تھا بہت بھلے اور اچھے انسان تھے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے تو میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ جس پر وہ کہنے لگے کہ رات اُنھیں ایک ایمرجنسی کی وجہ سے گھر جانا پڑ گیا تھا ورنہ وہ رات کو ہی میری جان چھڑوا دیتے۔ اُن کے جانے کے بعد کسی نے بھی اس معاملے میں دلچسپی نہیں لی۔ جس کی وجہ سے مجھے رات پھر حوالات میں رہنا پڑا اور پولیس کی مار الگ کھانی پڑی۔ انھوں نے بہت معذرت کی اور افسوس کیا کہ راہ چلتے میرے گلے مصیبت پڑ گئی تھی۔ پھر غلام علی صاحب نے مجھ سے میرے حالات پوچھے تو میں نے شروع سے آخر تک اپنی راہ کہانی سنادی اور کراچی جانے کا مقصد بھی بتادیا۔ غلام علی صاحب کہنے لگے اب تو کراچی جانے والی ٹرین رات کو ہی آئے گی۔ پھر غلام علی صاحب مجھے اپنے ساتھ اپنی سرکاری رہائش گاہ پر لے گئے جہاں میں نے غسل کیا اور مجھے کھانا کھلایا، چائے پی پھر ہم اُٹھ کر ریلوے اسٹیشن آگئے جہاں ان کے دفتر میں تھوڑا آرام کیا۔ غلام علی صاحب نے مجھے نیا ٹکٹ بنوا کر دیا اور اپنے پاس سے ایک ہزار روپے بھی دیے جو کہ قرض کی صورت میں میں نے قبول کیے۔ رات کو ٹرین آگئی تو غلام علی صاحب نے میرے لیے برتھ کا انتظام کردیا اور میں فوراً سو گیا۔ اگلی صبح گاڑی کافی تاخیر سے کراچی پہنچی۔ میں بھاگم بھاگ ٹیسٹ کے لیے سینٹر میں پہنچا مگر پتا چلا کہ ٹیسٹ ہوچکا ہے۔ میری غیر حاضری لگ چکی تھی میں نے بہت منت سماجت کی مگر میری شنوائی نہ ہوئی۔ چنانچہ میں مایوس ہوکر بجھے دل سے اُسی دن گھر واپسی کے لیے ٹرین میں بیٹھ گیا۔ واپسی پر ٹرین پندرہ منٹ کے لیے اُسی اسٹیشن پر رکی تو میں نے اُتر کر غلام علی صاحب کو بتایا کہ میرا کراچی جانا بیکار ثابت ہوا۔ بہرحال انھوں نے مجھے حوصلہ اور تسلی دی اور کہا کہ رابطے میں رہنا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں گھر پہنچ گیا اور گھر والوں کو صرف اتنا ہی بتایا کہ ٹیسٹ انٹرویو دے آیا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا موبائل فون تو دور کی بات پی ٹی سی ایل ٹیلی فون بھی بہت کم ہوتے تھے اور ٹیلی فون لگوانا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا تو رابطے کا واحد ذریعہ خط و کتابت تھی۔ میرا رابطہ غلام علی صاحب سے بذریعہ خط تھا۔ کوئی ایک مہینہ گزرا تو غلام علی صاحب کا خط مجھے موصول ہوا اور انھوں نے لکھا تھا کہ میں اپنی تعلیمی اسناد اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپیاں انھیں فوراً بھیجوں اور ساتھ ہی اپنی تین عدد تازہ تصاویر بھی چنانچہ میں نے فوراً متعلقہ کاغذات انھیں بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیے۔

مزید ایک مہینہ گزرا تو غلام علی صاحب نے مجھے فوراً راولپنڈی پہنچنے کا خط لکھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں جگہ پہنچوں۔ چنانچہ میں مقررہ تاریخ کو بذریعہ ٹرین راولپنڈی پہنچ گیا۔ غلام علی صاحب وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ وہ بہت پرتپاک طریقے سے ملے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر محکمہ ریلوے کے بہت بڑے آفیسر سے ملوایا اور میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہی وہ لڑکا ہے جس کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ ٹیسٹ انٹرویو نہ دے سکا تھا۔ کیونکہ ریلوے اور ریلوے پولیس کی وجہ سے اس بے چارے کو نہ صرف پوری رات حوالات میں گزارنی پڑی بلکہ مار بھی کھانی پڑی اور اپنی رقم سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔"

غلام علی صاحب نے میری بھرپور سفارش کی کہ اس لڑکے کو ریلوے میں بھرتی کرلیا جائے۔ کیونکہ وہ یہ کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں جو زیادتی اس کے ساتھ ہوچکی ہے۔ اُس کا ازالہ ہوجائے گا۔ تو اُن بڑے آفیسر نے میرے شاندار تعلیمی ریکارڈ اور غلام علی صاحب کی سفارش کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے ریلوے میں بھرتی کرلیا۔ جب میں اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر گھر پہنچا تو سب خوشی سے نہال ہوگئے۔ امی نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی اور مبارکبادیں وصول کیں۔ پھر اُس دن میں نے اپنے گھر والوں کو اپنے ساتھ گزری روداد سنائی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور کس طرح غلام علی صاحب نے میری مدد کی اور غلام علی صاحب نے ہی مجھے یہ نوکری دلوائی ہے۔"

امی یہ سب سن کر پہلے تو رونے لگیں پھر اللہ کی بارگاہ میں شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ اگلے ہی دن میں نے ڈیوٹی جوائن کرلی۔

کوئی ایک ہفتہ گزرا تو امی ابو نے کہا کہ غلام علی

صاحب نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے تو اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُسی دن میں نے غلام علی صاحب کو خط لکھا کہ میرے امی ابو آپ کا شکریہ ادا کرنے فلاں تاریخ کو آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ ابو نے مجھ سے غلام علی صاحب کا قد کاٹھ پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ درمیانے جسم کے ہیں اور لمبا قد ہے تو ابو نے بازار سے عمدہ اور بڑھیا کپڑا لے کر اندازے سے اُن کے دو سوٹ سلائی کیے۔ امی نے غلام علی صاحب کی بیوی کے لیے سوٹ اور شال خریدی اور مٹھائی اور پھل لے کر اگلے روز امی، ابو، میں اور صوبیہ بذریعہ ٹرین غلام علی صاحب کے وہاں پہنچ گئے۔

ریلوے اسٹیشن پر وہ بہت پرتپاک طریقے سے ہمیں ملے اور اپنے ساتھ ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے آئے۔

اُن کے گھر والوں نے ہمیں بڑی عزت اور احترام سے بٹھایا ہماری خوب مہمانداری کی گئی۔ غلام علی صاحب کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی شازیہ جو کہ تھرڈ ائیر میں پڑھ رہی تھی۔ اُس سے چھوٹا مراد علی تھا جو سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ مراد سے چھوٹی تین بہنیں جو کہ انڈر میٹرک تھیں۔ غلام علی صاحب کی پوری فیملی کے ساتھ ہم گھل مل گئے اور ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ہم آپس میں غیر ہیں۔

اگلے دن ہم وہاں سے واپس آ گئے اور پھر ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ ہم دونوں فیملیوں میں ایک دوسرے کی بہت عزت اور احترام تھا۔ میں نے ابا کا چیک اَپ ریلوے ہسپتال سے کروایا۔ جہاں اُن کا علاج شروع ہو گیا اور ایک ماہ کے علاج کے بعد اُن کی کمر درد ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ بیٹھ کر کام نہیں کرنا بہر حال ابا دکان پر جاتے رہے دکان تبدیل کر لی اور پہلے سے نسبتاً بڑی اور بہتر جگہ پر بنا لی اور بہت سارے کاریگر رکھ لیے پھر اللہ کے فضل سے دوبارہ کام چل نکلا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ میری جاب ریگولر اور مستقل ہو چکی تھی۔ معقول تنخواہ اور بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ میں نے دوران ملازمت پرائیویٹ ایم اے کر لیا تھا جس کی وجہ سے مجھے بہت جلد گریڈ سولہ مل گیا۔ صوبیہ بھی ایم اے کر چکی تھی اور لیکچرار کی آسامی کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ اُدھر غلام علی صاحب کی بیٹی شازیہ نے بھی ایم ایس سی کر لی تھی اور اُسے لیکچررشپ مل گئی تھی جبکہ اُن کے بیٹے مراد علی نے بھی ماسٹرز کر لیا تھا اور غلام علی صاحب نے اُسے بھی ریلوے میں اچھی پوسٹ پر بھرتی کروا دیا تھا۔

مجھے اپنے ہی شہر میں ریلوے کالونی میں بہت شاندار سرکاری گھر مل گیا تھا۔ جہاں ہم سب شفٹ ہو گئے۔

☆......☆......☆

ایک دن غلام علی صاحب کا فون آیا کہ وہ دو دن بعد ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔ اُن دنوں سرکاری چھٹی اتوار کی بجائے جمعہ کو ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جمعہ کی صبح غلام علی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ ہمارے گھر آئے اور نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد انھوں نے صوبیہ کا رشتہ اپنے بیٹے مراد کے لیے مانگا تو امی ابو کہنے لگے کہ ہم بھی آپ کی طرف آنا چاہ رہے تھے۔ فواد کے لیے شازیہ بیٹی کا رشتہ مانگنے۔ الغرض بہت جلد تمام معاملات طے پا گئے۔ میری منگنی شازیہ کے ساتھ اور صوبیہ کی منگنی مراد کے ساتھ ہو گئی اور چھ ماہ کے بعد شادی کی تاریخیں رکھ دی گئیں۔ اللہ کے فضل سے صوبیہ کو بھی لیکچررشپ مل گئی اور پھر وہ دن آن پہنچا جب شازیہ میری دلہن بن کر آ گئی اور صوبیہ رخصت ہو کر چلی گئی۔

شازیہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ اُس نے اپنی پوری تنخواہ جمع کی ہوئی تھی اسی طرح کچھ جمع پونجی میرے پاس بھی تھی تو ہم دونوں میاں بیوی نے پیسے جمع کر کے امی ابو کو حج کروایا۔ اسی طرح شازیہ کے امی ابو نے بھی حج کی سعادت حاصل کی۔ الحمد اللہ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی ہے۔ صوبیہ بھی اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ میں اکثر اپنے دفتر سے نکل کر تھوڑی دیر پلیٹ فارم پر ٹہلتا ہوں اور پھر کسی خالی بنچ پر بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ تقدیر عجب رنگ دکھاتی ہے۔ کس طرح ایک انجان مسافر کو کھانا کھلانا اور اُس کے بعد کے واقعات اور پھر پلیٹ فارم اور ریلوے اسٹیشن کا ہمیشہ کا ساتھ۔ شاید یہ ازالہ ہے۔ پولیس کی مار پیٹ اور حوالات میں گزری ہوئی رات کا۔

☆☆☆

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

وہ کون تھی!



جاوید راہی

اُس مجرم کی داستانِ خاص جو ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا ہے

تیز بارش سے بچتا ہوا میں موٹر سائیکل کو چھوٹے اسٹینڈ پر ٹیڑھا کھڑا کرتے ڈیری فارم کی دیوار کے سائے میں آن کھڑا ہوا۔ موسم خراب ہوتے پتا ہی نہ چلا ورنہ میں کب کا گھر پہنچ جاتا۔ شہر سے روز گاؤں آنا گو کہ گاؤں اور شہر کا فاصلہ آٹھ/نو کلومیٹر بنتا تھا مگر کچی سڑک کا یہ فاصلہ صبح و شام میرے لیے پریشان کن بنا ہوا تھا۔ والدین سے اَن بن ہونے کی وجہ ساس بہو کا روایتی جھگڑا بنا اور یوں مجھے بیگم کے ساتھ سسرال آنا پڑا۔ دو سال سے میں گاؤں میں ہی ٹکا ہوا تھا۔ غلہ منڈی کی ایک آڑھت پر گیارہ سال سے بہی کھاتہ کے کام پر ملازمت کر رہا تھا۔ صبح نو دس بجے سے لے کر شام چھ بجے تک ڈیوٹی کرنے کے بعد گھر کا سودا سلف لے کر گاؤں چل پڑتا اور یوں زندگی بے کیف کولہو کے بیل کی مانند رینگ رہی تھی۔

ارنم ڈیری فارم آرمی کے تحت چل رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہاں بھینسیں تھیں جن کا دودھ آرمی کے لیے مختلف آئٹم مثلاً خشک دودھ، بٹر، چیز، پنیر وغیرہ فیکٹری میں تیار کر کے اِدھر سے سپلائی کیا جاتا تھا۔ بارش کی وجہ سے چاروں جانب زندگی کے آثار نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے، جہاں میں رُکا ہوا تھا وہاں سے میرے گاؤں کا راستہ کوئی دو کلومیٹر بنتا ہوگا۔ میں سوچ میں ڈوبا کھیتوں کے درمیان سے گزرتے گندے پانی کے کھال کا بھی جائزہ لے رہا تھا جو تیز بارش کے باعث لبالب بھرا تیزی سے بہہ رہا تھا کھال آگے چل کر کنگرو کی کچی پکی کوٹھڑی کے قریب سے گزرتا ریلوے لائن کے نیچے والے چھوٹے سے موگے سے ہوتا ہوا کھیتوں میں جا گرتا تھا۔

کنگرو نے ڈیری میں بھینسوں کے پیدا ہونے والے ایک دن کے زیچوں کو ذبحہ کرنے کا اور مرنے والی بھینسوں کا باقاعدہ ٹھیکہ لے رکھا تھا اور وہ لوہے کے بڑے سے کڑاہے میں مرنے والی بھینسوں اور کٹوں کو کاٹ کر ان کی ہڈیوں اور گوشت سے چربی نکال کر خدا معلوم وہ کہاں سپلائی کرتے تھے؟ حالانکہ گاؤں کا وہ راستہ سیدھا تھا زیادہ تر لوگ وہی راستہ استعمال کرتے مگر میں بہت کم اِدھر سے آتا جاتا۔ ایک تو سخت بدبو اور دوسرا چاروں جانب پڑیں جلی کٹی ہڈیاں اور مردہ بھینسوں اور نوزائیدہ کٹوں کے پنجر جن پر درجنوں گدھ نوچ کھسوٹ میں مصروف دکھائی دیتے۔ جب بہت ہی مجبوری ہوتی کبھی اس راستہ پر شہر آنے جانے کی تو میں کراہت سے بے حال ہوتے اپنا سانس بند کرتے تیزی سے گزرتا۔

اس وقت بھی میری نظریں کنگرو کی کوٹھڑی کی طرف تھی جو برستی بارش میں دھندلی دھندلی سی دکھائی پڑتی

گاؤں والے شام ہونے سے پہلے یہ راستہ استعمال کرتے تھے۔ ان کے مطابق دوپہر کو اور رات کو یہ راستہ باہر کی چیزوں کی آماجگاہ ہوتا تھا جو ہڈیوں اور مردہ گوشت کی دعوت اُڑانے آتے اور تمام رات وہاں موجود ہوتے۔ بارش کی رفتار کم ہونے کی بجائے اور تیز ہو گئی۔ ارنم ڈیری کے کوارٹروں میں مدہم روشنی ٹمٹماتی دکھائی دے رہی تھی جس جگہ میں رُکا ہوا تھا وہ راستہ چھوٹی سی کچی سڑک سے ہوتا ہوا جی ٹی روڈ پر چڑھ جاتا تھا۔

سڑک سے گزرتی ٹریفک کا منظر مجھے بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ میری نگاہیں اَب اُسی سڑک پر اپنی طرف آتے ایک وجود کو دیکھ رہی تھیں۔ تیز بارش میں اِدھر اُدھر ڈولتا وہ وجود جب ذرا قریب پہنچ گیا تو میں نے ایک لڑکی کو بیگ سنبھالتے آتے دیکھا شاید کوئی ارنم کی رہائشی یا گاؤں جانے والی سواری تھی۔ ہمارے گاؤں میں کرسچن آبادی آدھی سے زیادہ تھی یہاں کی لڑکیاں اپنی تعلیم یا نوکری کے باعث اکثر آتی جاتی تھیں۔

وہ لڑکی سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور میرے قریب آتے تھوڑے فاصلے پر رُک گئی۔ اس کا سارا لباس اس کے جسم پر چپکا اُس کے وجود کو نمایاں کر رہا تھا۔

اس کے سلام کا جواب دیتے میں نے نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔ اس کے بھیگے بدن کے خطوط اتنے نمایاں دکھائی دے رہے تھے کہ ان پر نگاہ ٹکانا محال ہو رہا تھا۔ میرے کانوں سے اس کی آواز دھیرے سے ٹکرائی۔

''آپ گاؤں جائیں گے کیا؟''

میں نے ایک بار پھر توجہ اس کی طرف کرتے مختصر سا جواب دیا ''جی ہاں''۔

''اگر آپ مناسب جانیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے جائیے گا۔'' اس نے کم ہوتی بارش کی طرف دیکھتے مجھ سے لفٹ مانگی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس بار اس کے سراپے کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا تو وہ اپنے بھرے ہوئے خدوخال پانی میں شرابور چادر میں چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ چادر کی گرفت اس کے جسم سے ذرا ڈھیلی ہوئی تو اس کے جسم کی مہک نے مجھے اپنے حواس پر قابو رکھنے کا سگنل دیا اور میں دیوار کے سائے سے ہٹ کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ اب تیز بارش پھوار کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر سیفٹی بیرر



کے ساتھ لٹکاتے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے پیچھے اس انداز میں بیٹھی کہ اس کے بدن کا زیادہ حصہ میری کمر سے چپک گیا۔

اس کے بدن کا احساس میرے اعصاب پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ میری حالت غیر تر ہو رہی تھی۔ جہاں موٹر سائیکل اونچے نیچے راستے پر اُچھلتی تو وہ اپنا بازو میری کمر کے گرد سختی سے جما لیتی اس کے جسم کی بو جو بارش کے پانی میں مل کر میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی شاید اس نے بھی میری حالت کو محسوس کر لیا تھا۔

''تمہارا نام؟'' اس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے پاس لاتے زور کی آواز میں پوچھا۔

''نثار۔'' میں نے سر گھما کر اس کو بتایا۔

''میرا نام روز ہے اور میں خوش پور میں سسٹر کا کورس کر رہی ہوں''۔ میرے کان کے قریب اس کے گرم گرم سانس کی تپش محسوس ہوئی۔ اس کے نام اور کام سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کرسچن ہے اور اسی گاؤں کے کسی کرسچن خاندان کی لڑکی ہے۔

''تو کیا آپ چھٹی پر آئی ہیں گھر؟'' میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو میرا چہرہ اس کی ناک سے ٹکرا گیا۔ وہ شاید مجھ سے بات کرتے ہوئے میرے کان کے قریب جھکی ہوئی تھی۔ یکدم وہ پیچھے کی طرف سمٹ گئی۔ میں نے دھیان سامنے رکھتے سوال کیا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہی۔ سامنے گاؤں کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔

''کہاں اُترنا ہے آپ نے روز؟'' میں نے اس بار جان بوجھ کر چہرہ پیچھے گھمایا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی جھالر جھکاتے کہا کہ گاؤں سے باہر ہی روک لیجیے گا' کوئی دیکھ لے گا تو باتیں کرے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دھیان دوبارہ سامنے کی طرف کر لیا۔

گاؤں سے باہر والی پگڈنڈی پر میں نے موٹر سائیکل روکی اور اس کا سامان والا بیگ اُتار کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اس بار میں نے روز کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ دراز قد اور کھلتا ہوا سرخ سفید رنگ، مدہوش کر دینے والی آنکھیں۔ مجھے اس طرح خود کو دیکھتے پا کر وہ قدرے شرما گئی اور میرا شکریہ ادا کرتے آگے بڑھ گئی۔

وہ اس طرف جا رہی تھی جدھر کرسچن آبادی تھی۔ آبادی کے کئی لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا پلے داری۔ ان کی لڑکیوں کی زیادہ تر نوکریاں ہسپتالوں میں یا کرسچن اسکولوں میں تھیں جیسا کہ روز نے بھی بتایا کہ وہ کسی چرچ میں سسٹر کا کورس کر رہی تھی۔

میں کیچڑ سے بچتا ہوا گھر پہنچا تو سب کی جان میں جان آئی۔ جلدی سے بارش اور اُڑنے والے گندے پانی کی چھینٹوں سے اپنا جسم دھو کر خشک کیا اور کپڑے بدل کر اپنے بستر پر آ گیا۔ گھر والی نے چائے کی پیالی پکڑاتے کھانے کا پوچھا تو میں نے تھوڑی دیر بعد کھانے کا کہا اور ببلو کی طبیعت کا پوچھا جو دو دن سے کھانسی اور ہلکے بخار میں مبتلا تھا۔

''پہلے سے بہتر ہے صبح انجکشن لگوایا تھا'' نسرین نے اپنی پیالی منہ کی طرف لے جاتے مجھے جواب دیا۔

غیر موسمی بارش تھی رات کے پہلے پہر ہی رُک گئی۔ آسمان صاف اور ستاروں سے جگمگا رہا تھا میں کھانا کھا کر حسب معمول چہل قدمی کے لیے گھر سے نکل کر جرنیلی سڑک کی طرف چل پڑا۔

یہ سڑک زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھی اس سڑک پر سکندر اعظم سمیت بڑے بڑے راجوں اور مہاراجوں نے سفر کیا تھا۔ گاؤں کے اکثر لوگ جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اسی سڑک کو زیادہ استعمال کرتے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب زیر کاشت فصلیں دوسرے گاؤں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ رفع حاجت کے لیے ادھر کا ہی رخ کرتے تھے۔

کرسچن آبادی چونکہ گاؤں کے آخری حصہ میں تھی یہی لوگ اِدھر زیادہ آتے جاتے تھے۔ میں جب کالونی کی طرف بڑھ رہا تھا تو یکدم مجھے روز یاد آ گئی جو ادھر ہی کسی گھر کی رہائشی تھی۔ میرا معمول تھا کہ چلتے چلتے میں گاؤں سے کافی دور نکل آتا۔ سارا دن ایک ہی تھڑے پر بیٹھ کر بہی کھاتوں پر کام کرتے کرتے کمر دُھری ہو جاتی تھی۔ تھوڑی بہت واک کی۔ بدولت جسم فٹ رہتا تھا۔ میں کافی لمبا چکر کاٹ کر واپس آ رہا تھا کہ میرے کانوں میں نسوانی آواز پڑی جو میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔ میں نے آبادی والے حصہ کی طرف گھوم کر دیکھا تو میرا نام لے کر پکارنے والی روز تھی جو شاید کھیتوں کی طرف سے

آ رہی رہی اور مجھ پر نظر پڑتے مجھے آواز دے دی۔

میں سڑک کے دوسری طرف آ گیا وہ سفید لباس میں نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔

''جی روز صاحبہ'' میں نے اس کے قریب رُکتے جواب دیا۔

''آپ روز واک کرتے ہیں رات کو؟''

''جی بالکل'' میں نے اسے بے باکی سے تکتے مسکرا کر کہا۔

اس کے جسم سے اُٹھنے والی سوندھی سے مہک نے میرے اندر ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔

''میں بھی عادی ہوں واک کی وہاں تو بہت بڑا لان ہے ہاسٹل کے آگے اور یہاں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ آپ شاید واپس جا رہے ہیں؟'' روز نے بے ساختہ میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے گڑبڑا کر رہ گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''نہیں ابھی تو واک جاری ہے'' کہتے میں دوبارہ پیچھے کی طرف چل پڑا وہ بھی میرے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔

''روز جی ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں ضرور پوچھیں۔''

''آپ جو کورس کر رہی ہو میں نے سُنا ہے کہ اس میں لڑکی تمام عمر شادی نہیں کر سکتی؟''

''صحیح سُنا ہے'' اس نے قدم میرے برابر کرتے جواب دیا۔

''آپ کب سے کر رہی ہیں؟''

''دوسرا سال شروع ہے۔ بی اے کرنے کے بعد میں نے خداوند کی بندی بننا پسند کیا'' روز نے برجستہ مجھے بتایا۔

''یہ تو بہت ظلم ہے'' میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتے پوچھا۔

''یہی کہ ساری عمر کنواری رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے'' میرے ذو معنی فقرے کی کاٹ سمجھ کر وہ صرف ہنس کر رہ گئی۔ باتیں کرتے کرتے آبادی کو ہم دونوں کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ دور سے دوسرے گاؤں کی بتیاں ٹمٹاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

''واپس چلیں'' میں نے روز کو مخاطب کیا۔

''ہاں!'' وہ چونک کر واپسی کے لیے پلٹی تو مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر پر رکھتے خود کو سنبھالا۔ جب سے وہ مجھے ملی تھی اس طرح کے دو تین واقعات رونما ہو چکے تھے، کبھی موٹر سائیکل پر اور کبھی یونہی چلتے ہوئے۔

''ایک بات پوچھنے کی اجازت ہے؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''پوچھیں'' وہ چلتے چلتے رُک گئی۔

''آپ کے دِل میں اکیلے رہنے کا کبھی احساس نہیں جاگا؟''

''کیوں نہیں مگر یہ فیصلہ میرا خود کا ہے اس لیے خود کو سمجھا لیتی ہوں'' اس بار (خود کو سمجھا لیتی ہوں پر) اس نے خاصا زور دیا تھا۔

''نثار میری بات کا جواب دیں گے آپ؟''

''اگر جواب دینے والی ہوئی تو۔۔۔۔''

''مجھ سے دوستی کرو گے؟''

یہ فقرہ اس کے منہ سے بم کی طرح مجھ پر گرا اور میں ہونق بنا اس کا جائزہ لینے لگا۔

''صرف شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے مگر زندگی کی آسودگی سے تو ناتا نہیں توڑا میں نے'' روز کے لہجہ کی خود سپردگی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دوسرے پل روز میرے بازوؤں میں سمٹ آئی۔

تاروں بھرے آسمان کی چھت کے نیچے ہم دونوں دنیا مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش میں مدغم پڑے تھے۔ گھاس کا گیلا سوکھا بستر ہمیں اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے تھا۔ جب ہوش آیا تو ہم دونوں ایک دوسرے اجنبی نہیں رہے تھے۔

واپس گھر آ کر میں نے دیر سے آنے کی وجہ یہ بتائی کہ رمضان موچی کے گھر رُک گیا تھا اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ وہ کافی دِنوں سے بیمار چلا آ رہا تھا۔ بیگم نے کوئی نوٹس نہ لیا اور دوبارہ اپنے کام کاج میں اُلجھ گئی اور میں ببلو کو اُٹھا کر اپنے بستر پر لے آیا۔

میرا معمول بن گیا روز اور میں دونوں ہر رات اِدھر اُدھر چھپ کر ملتے اور جی بھر کر ایک دوسرے کو محسوس

کرتے۔ روز نے میرے پوچھنے پر کہ وہ کب واپس جارہی ہے؟ بتایا کہ۔

''میرا دِل تو نہیں کرتا تم سے جدا ہونے کو۔ تم نے پوچھا تھا کہ شادی کیوں نہیں کی تو اب میرا فیصلہ ہے کہ شادی ضرور کرونگی مگر تم سے۔ میں اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' اس کے لہجہ کی پختگی نے میرے دل کے اندر اپنے ہونے کا احساس جگا لیا اور میں اس کی قربانی پر دِل ہی دِل میں جھوم اُٹھا۔

روز نے اپنے کورس کو خیر آباد کہہ دیا اور گھر میں بیٹھ گئی۔ دو چار بار وہ میرے ساتھ شہر آئی اور ڈھیر ساری شاپنگ کرتی خود کے لیے اور میرے لیے بھی۔ نسرین اپنے لیے میری لائی چیزوں کو دیکھ کر خوش تو ہوتی مگر مجھے اس کے چہرے پر ہلکی پریشانی کے سائے لہراتے نظر آئے۔

ایک بار تو اس نے کہہ دیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ والا کام تو نہیں کر رہے ہو؟ جواب میں اسے میں نے جھوٹ بول دیا کہ منڈی میں جنس کا کام بھی کرنے لگا ہوں۔ کئی بیوپاری فون پر اجناس کی خرید و فروخت میرے ذریعے کرتے ہیں۔ منافع میں مجھے بھی حصہ مل جاتا ہے۔ وہ میرا جھوٹ سن کر مطمئن ہو گئی تھی اسے کیا پتا کہ اس کا کوئی اور حصہ دار بھی پیدا ہو چکا ہے۔

روز مجھ سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ میں عسائیت ترک کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس بات پر بہت زیادہ متاثر تھا کہ وہ میرے لیے اپنا مذہب چھوڑنے کو تیار ہے۔ میں نے بھی اپنے اندر یہ بات مضبوطی سے رکھ لی تھی کہ میں روز سے شادی کرونگا مگر میرے حالات بہت ٹائٹ تھے اس لیے کھل کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ میری مالی پوزیشن صرف ایک گھر مشکل سے چلانے کی ہے اگر میں دوسری شادی کرلوں گا تو کس طرح حالات کا مقابلہ کر پاؤں گا جو شادی کے بعد پیدا ہونے تھے۔

روز دو دن بعد گاؤں آئی تھی، وہ اپنی بہن کے پاس ٹیکسلا گئی ہوئی تھی۔ شام کو وہ حسب معمول آئی اور آتے ہی مجھ سے دیوانہ وار لپٹ گئی اس کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کتنا چاہتی تھی۔ بڑا سارا شاپر اس کے ہاتھ میں تھا جس میں میرے لیے کافی کچھ بھرا ہوا تھا۔

پرفیوم کی دو بوتلیں دیکھ کر میں نے کہا کہ پہلے ہی کئی پڑے ہیں تم اور لے آئی ہو۔

''تو کیا ہوا میرا تو بس نہیں چلتا تمام دنیا کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔'' سر میرے سینے پر رکھتے مدہوش لہجہ میں اس نے سرگوشی کی۔ میں بھی اس کے گداز جسم کا عادی ہو گیا تھا۔ دو دن بڑی مشکل سے نکلے تھے پھر ہم دونوں اِردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو گئے۔ گھنٹوں ہم اس ویران کونے میں پڑے راز و نیاز میں ڈوبے رہے۔

''روز میں تم سے ایک بات کرنے کی سوچ رہا ہوں''

''ہاں کہو، میں سن رہی ہوں'' اس نے اُٹھ کر بیٹھتے پوچھا۔

''اگر میں تم سے شادی کرلوں تو کیا تم میرے ساتھ خوش رہ پاؤ گی؟''

''کیا مطلب، میں سمجھی نہیں'' روز نے میرے چہرے پر توجہ دیتے پوچھا۔

''یار میں تو اپنا گزارہ بہت مشکل سے کرتا ہوں اگر آپ میری زندگی میں آگئیں تو کیا میں آپ کا بوجھ اُٹھا پاؤں گا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے کہا۔

''میرے پاس بہت کچھ ہے، میرے والد نے جو اپنی خاندانی زمین فروخت کی تھی اس کا سارا پیسہ میرے ہی اکاؤنٹ میں پڑا ہے اس کا منافع ہر سال اتنا مل جاتا ہے کہ ہمارا پورا سال آسانی سے گزر جایا کرے گا اور پھر جو میرا ہے وہ سب کچھ آپ کا ہو جائے گا نا''

اس کا جواب سن کر میرے سر پر سے پریشانی کا بوجھ ہٹ گیا اور میں نے اُٹھ کر بیٹھتے کہا ''چلیں؟''

''ہاں ٹھیک ہے'' اس نے گھاس پر بچھائی اپنی چادر اُٹھاتے میرے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ نہ میں نے کبھی اس کے گھر والوں کا ذکر کیا اور نہ کبھی اس نے میرے بارے میں کوئی کھوج لگایا تھا۔ چلتے چلتے روز نے مجھے مخاطب کیا۔

''نثار صبح میں اپنی خالہ کے پاس خانیوال جاؤں گی۔ ان کی بیٹی کی سگائی ہے۔''

''ٹھیک ہے'' میں نے اس کی طرف بنا دیکھے جواب دیا۔

وہ دو دن بعد آئی اور حسب سابق بڑا ٹوٹ کر ملی اور

مجھے بڑا سا شاپر دیا جس میں تین لاکھ روپے تھے۔

''نثار یہ رکھو اور شہر میں کوئی گھر کرایا پر لو۔ دیگر ضروری سامان بھی لانا ہے اور بھی تمہیں دوں گی کوئی کاروبار بھی کرنا ہے تم نے''

اتنے سارے روپے ایک ساتھ پا کر مجھے اندرونی خوشی محسوس ہوئی۔ دوسرے دن شہر آ کر ایک پراپرٹی ڈیلر کو ملا جس کے پاس دو چار مکان کرایہ کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک دو کمروں پر مشتمل صاف ستھرا اور سپیرٹ گھر مجھے پسند آ گیا، کرایہ بھی معقول اور ایڈوانس بیس ہزار تھا۔

شام کو آ کر میں نے روز کو بتایا کہ گھر مل گیا ہے اب اس کا سامان وغیرہ خریدنا ہے۔ اگر تم ساتھ چلتی ہو تو بہتر طور پر باہمی اتفاق سے خرید لیتے ہیں۔

''ٹھیک ہے'' روز نے مجھے جواب دیتے میری بات کی تائید کر دی اور پھر کرسچن آبادی آنے پر وہ کل شہر جانے کا کہتی اُدھر مڑ گئی۔

☆......☆......☆

صبح ڈیوٹی پر جانے کے لیے میں تیار ہو رہا تھا کہ نسرین میرے پاس آئی اور ببلو کے گرم کپڑے اور جوتے لانے کا کہا اور اپنے لیے گرم شال مانگی۔

ٹھیک ہے شام کو لیتا آؤں گا میں نے اپنی بیوی کو پیار سے جواب دیا وہ جواباً مسکرا دی۔ روز نے مجھے چربی نکالنے والے کڑاھے کے قریب جو کوٹھڑی تھی اس کے پاس ملنے کا بتایا تھا۔ میں گاؤں سے نکل کر اس کچے راستے پر ہو گیا جو بارش کے بعد مٹی بیٹھ جانے سے خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

موٹر سائیکل بند کر کے میں اُدھر کھڑا ہو گیا۔ کل کے مرے اور ذبحہ کیے ڈنگر اور چھوٹے کٹے جن کی کھالیں اُتار لیں گئی تھیں اور کنگرو نے کڑاھے میں ان کو ڈال کر شاید صبح سے نیچے آگ جلا رکھی تھی۔

ابھی میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ روز کوٹھڑی کے دروازے سے نمودار ہوئی اور میرے قریب آتے مسکرا کر بولی نثارو (وہ مجھے نثارو کہہ کر پکارنے لگی تھی) میں جلدی آ گئی تھی اس لیے اندر بیٹھ گئی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا اس نے اندر پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے میرا دھیان

اس طرف کیا۔ میں نے چاروں جانب ہڈیاں گوشت نوچتے گدھوں کو آپس میں چیختے چلاتے دیکھ کر پوچھا

''روز تمہیں ڈر نہیں لگا اس خوفناک ماحول سے''

''نثارو مجھے صرف تم ہی دکھائی دیتے ہو چاروں طرف'' کہتے وہ میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور پکی سڑک سے ہوتا ہوا تبروک سے شہر کی طرف چل پڑا۔

آڑھت سے میں نے دو دِن کی چھٹی لے رکھی تھی کہ گھر میں کام ہے۔ ملک اسلم بہت اچھا انسان تھا جو ہمیشہ میری فیور کرتا۔ شہر آ کر میں نے روز کو مکان دِکھایا جو اس نے بہت پسند کیا پھر ہم دونوں گھر کے لیے سامان خریدتے رہے میں نے کوشش کی کہ پےمنٹ میں کروں مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا کہ میرے پاس ہیں۔ جب ضرورت ہوگی میں خود کہہ دوں گی۔ گھر کی ضروری اور موٹی موٹی چیزیں خریدنے کے بعد لوڈر میں رکھوا کر ہم گھر آ گئے اور مل کر انہیں سیٹ کیا۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے، بھوک بھی لگی ہوئی تھی میں نے کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کا کہا تو وہ بولی

''تم لے آؤ میں تھوڑا کام سمیٹ لوں اور ہاں میرے لیے صرف دودھ لانا دو دِن سے میرے معدہ میں جلن ہے ڈاکٹر نے سالن وغیرہ کھانے سے منع کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے میں باہر نکل آیا۔ مجھے کھانا وغیرہ پیک کرواتے، واپس آتے گھنٹہ گزر گیا۔ دستک دینے پر روز کافی دیر تک دروازے پر نہ آئی تو مجھے تشویش ہوئی میں نے ہلکا سا دھکا لگایا تو دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

موٹر سائیکل میں نے برآمدے میں رکھتے اِدھر اُدھر پکارا مگر کوئی جواب نہ پا کر میں نے کھانا ایک طرف رکھتے اِدھر اُدھر کمروں میں اسے دیکھا مگر وہ موجود نہیں تھی۔ میں تھوڑا گھبرا گیا، ابھی میں اسی کیفیت میں تھا کہ وہ سیڑھیاں اُترتی نظر آئی۔

''یار تم نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا'' میں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے کہا۔

''میں اوپر والا چھوٹا کمرہ ٹھیک کر رہی تھی اس کے لیے بھی ایک چارپائی لے آنا کبھی چھت پر بھی جانا پڑتا ہے'' اس نے بڑے پیار سے مجھے کہا۔

"جو حکم آپ کا"

وہ مجھ سے الگ ہو کر کھانا نکالنے لگی تھی۔ دودھ والا ڈبہ کھول کر اس نے میز پر رکھتے کھانے کا سامان میری طرف کر دیا۔ میں کھانے میں مصروف ہو گیا اور وہ تھوڑا تھوڑا دودھ گلاس میں انڈیل کر پیتی رہی۔

"چائے بناؤں؟"

"ہاں بنالو پھر واپس بھی جانا ہے۔"

"آج رات اِدھر ہی نہ رُکیں؟" روز نے آنکھوں کے سرخ ڈورے مجھ پر وا کرتے اپنا خیال ظاہر کیا اور میں انکار ہی نہ کر پایا۔ نسرین سے میں نے فون پر یہ کہتے کہ رات گھر نہ آنے کا بتا دیا کہ میں نے سال بھر کے گوشوارے بنانے ہیں۔ اس لیے رات کافی ہو جائے گی۔

"ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔" کہتے اُس نے کال کاٹ دی۔

پہلی بار اپنے گھر میں روز کے ساتھ رات بسر کرنے کا لطف ہی کچھ اور محسوس ہوا۔ نا کوئی ڈر نہ کوئی خوف بس میں تھا اور روز۔ اسی طرح چوری چھپے رہتے ہمیں تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ میری راتیں کسی نا کسی بہانا کی مرہونِ منت ہوتی تھیں جب میں واپس گاؤں جاتا تو روز کے دیے پیسوں سے نسرین اور گھر والوں کے لیے کئی کچھ خرید کر لے جاتا اُن کو اوورٹائم کی ادائیگی بتاتا۔

☆......☆......☆

ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر بھینسوں کا بہت بڑا باڑہ تھا جہاں سے سارا علاقہ دودھ خریدتا میں بھی اُدھر سے ہی دو کلو دودھ روزانہ لا کر گھر رکھتا تھا شام کو دودھ لینے گیا تو وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ رات دو بھینسیں مرگئی تھیں انہیں کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا تھا لوگوں کا خیال تھا کہ کسی سانپ نے ان کے تھنوں سے دودھ پیا اور دانت لگنے کے باعث وہ مر گئیں۔ میں دودھ لیے بغیر گھر واپس آ گیا روز نے خالی برتن دیکھ کر پوچھا "دودھ نہیں ملا؟"۔

"اس کی دو بھینس بقول اُن کے کسی سانپ کے ڈسنے سے مرگئی ہیں اس لیے دودھ شاٹ ہو گیا"۔

جواباً روز کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر کر ڈوب گئی۔ "چلو رہنے دو مجھے بھوک بھی نہیں" اس نے کندھے جھٹک کر جواب دیا روز نے دن میں ایک بار تھوڑا بہت کچھ کھانا ہوتا تھا رات کو وہ صرف دودھ ہی پیتی تھی۔

مسلسل کئی کئی ہفتے گھر سے باہر رہنے کی وجہ اُس نے یہ کہہ کر مجھے بتائی تھی کہ میں نے گھر والوں کو مطمئن کر دیا ہے کہ میں کسی اور جگہ ڈپلومہ کرنے کے لیے داخلہ لے چکی ہوں۔ میں نے نسرین کو اپنی لائن پر فٹ کر لیا تھا۔ جب مجھے رات شہر پڑتی تو میں آڑھت کے کسی کام کا بہانہ بنا دیتا کہ میں شہر سے باہر جا رہا ہوں ایسے ہی کام چل جاتا۔

موسم کی تبدیلی کے باعث آڑھت کا کام ذرا ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ میرے آنے جانے کا وقت میری اپنی مرضی کے مطابق تھا' جب دل چاہتا آڑھت پر چلا جاتا جب دل چاہتا واپس گھر آ جاتا۔ آج بھی میں جلد گھر آ گیا تھا باہر کے دروازے کی ایک چابی میرے پاس بھی تھی میں نے اندر آتے موٹر سائیکل کھڑا کیا اور بیڈ روم کی طرف آ گیا۔ روز بیڈ پر لباس سے بے نیاز اوندھے منہ پڑی سو رہی تھی اسے میرے اندر آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ کھڑکی اور روشندان کے شیشوں سے اندر کمرے میں آنے والی ہلکی روشنی میں اس کا جسم قیامت خیز دکھائی دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک کسی ماہر سنگ تراش کا تراشا ہوا شہکار تھی میں جانے کب تک اس کے سراپے میں محو رہتا اگر وہ بستر پر ذرا سا ہلتی نا مگر جس بات پر میں چونکا وہ اس کے جسم کی حرکت تھی جو پاؤں سے سر تک یوں لہرائی تھی جیسے روز کے جسم میں ہڈی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ میں آگے بڑھا اور بغیر آہٹ کے اس کے سر کی طرف بیٹھ گیا اُسے شاید میرے آنے کا پتا چل گیا تھا اس لیے اس نے خود میں سمٹنے کی ناکام کوشش کی "کب سے مفت میں جھلیاں دیکھ رہے ہو بے شرم۔" جس انداز میں اس نے یہ فقرہ کہا میں قربان ہو گیا اس پر اور اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

پہلے تو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا مگر آج کی میٹنگ میں جانے مجھے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ روز کا جسم چکنی چیز کی طرح میرے ہاتھوں میں پھسل رہا تھا جیسے کریم یا مکھن اس کا رویہ بھی کچھ عجیب سا تھا نہ خوش جیسا۔ پھر وہ اُٹھ کر واش روم چلی گئی کافی دیر تک نہاتی رہی جب تولیہ میں لپٹی باہر آئی تو مجھ سے کہنے لگی میں دو روز کے لیے بڑی بہن کے ہاں جانا چاہتی ہوں۔ تم آج گاؤں چلے جاؤ۔"

پھر وہ دوسرے کمرے میں تیار ہونے چلی گئی میں اس کے رویہ پر سوچتا ہوا واش روم کی طرف اُٹھ گیا جب میں نہا کر باہر آیا تو وہ تیار کھڑی تھی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں جاتی ہوں بازار سے کچھ سامان بھی لینا ہے" بغیر میرا جواب سنے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں حیران سا کھڑا رہ گیا کہ اچانک اس کو ہو کیا گیا ہے؟ میں بھی تالا لگاتے باہر نکل آیا مجھے بھی کچھ سامان لینا تھا بازار سے وہ مجھے کسی طرف بھی دکھائی نہ دی پھر میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ لاہور جا کر لے جو اس نے لینا تھا۔

بازار سے فارغ ہو کر میں گاؤں جانے کے لیے ارنم والی کچی سڑک پر اُتر آیا میرا رُخ اس طرف تھا جہاں کانگر مردہ جانوروں کی چربی نکالتے تھے۔ اونچی نیچی سڑک پر موٹر سائیکل اچھل کود کرتا آگے بڑھ رہا تھا میں جب اس کوٹھڑی سے ذرا قریب آیا تو مجھے جھٹکا لگا۔ وہ روز تھی جو تیزی سے اس کوٹھڑی میں گھسی تھی۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان لیتا۔ وہ روز ہی تھی میں تیزی سے موٹر سائیکل کوٹھڑی کے قریب کھڑا کرتا۔ گدھوں اور ہڈیاں ماس نوچتے کتوں کو بھگاتا کوٹھڑی کے دروازے کے اندر آ گیا مگر کمرہ اندر سے بالکل خالی تھا گندی سی ٹوٹی ہوئی چارپائی اور وہ بھی بستر سے خالی...... ہلکی روشنی میں وہ کمرہ ہیبت ناک نظر آ رہا تھا مگر میرے سامنے اندر جانے والی روز کا یہاں نام و نشان نہیں تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں باہر آ گیا مارے خوف کے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے خود روز کو اندر جاتے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مگر وہ اندر نہیں تھی۔ خوف نے میرے اعصاب پر قبضہ کر لیا تھا اور میں گرتے پڑتے گھر پہنچ کر چارپائی پر گر گیا۔

نسرین ببلو کو لے کر میرے پاس آئی تو میں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ کافی دیر تک میں اسی ادھیڑ بن میں اُلجھا رہا کہ میں نے خود روز کو اسی لباس میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو وہ گھر سے پہن کر نکلی تھی اگر وہ روز نہیں تھی تو پھر کون ہو سکتی تھی؟ جو مجھے بالکل اس جیسی دکھائی دی تھی۔

وہ رات میں باہر نہ نکل سکا خوف سے یا پھر اندرونی پریشانی سے۔ صبح گھنٹہ پہلے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل پڑا' راستہ میں نے وہی استعمال کیا جہاں کانگر چربی نکالتے تھے۔ جب میں قریب پہنچا تو تین چار لوگ اس کام میں مصروف تھے پاس ہی گدھا ریڑی کھڑی تھی جس پر کئی کنستر موجود تھے جن میں وہ چربی بھرتے ہوں گے۔ میرا دھیان کوٹھڑی کے اندر کی طرف گیا جہاں صرف خالی چارپائی دکھائی دی۔ میں نے ہمت کرتے ایک کو اپنی طرف بلایا' وہ کام چھوڑ کر میرے پاس آ گیا۔"

جی اس نے میری طرف دیکھتے کہا میں نے جھٹ سوال کر دیا۔ "یہاں کوئی رہتا بھی ہے؟ میرا مطلب اس کوٹھڑی میں؟"

"نہیں جی بس سامان وغیرہ رکھنے کے کام آتی ہے"۔

"میں نے کل تقریباً تین بجے ایک لڑکی کو اندر جاتے دیکھا تھا"۔

"آپ نے تو کل دیکھا ہے۔ ہم تو کئی سالوں سے اُسے دیکھ رہے ہیں" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے جواب دیا۔

"وہ ہے کون؟"

"کوئی باہر کی چیز ہے مگر وہ کسی کو تنگ نہیں کرتی نہ ہم اس کو پریشان کرتے ہیں" بتاتے وہ دوبارہ کڑاھے کے نیچے آگ درست کرنے گھوم گیا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں روز کے چنگل میں پھنس چکا ہوں۔ آڑھت پر آ کر میں بے دل سا ہو کر بیٹھا ہوا تھا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میرا دھیان بس روز کی طرف تھا جس سے میں واقعی پیار کرنے لگے تھا وہ ذرا سا اِدھر اُدھر ہوتی تو میں بے چین ہو جاتا۔

اسلم نے میری طبیعت یوں بھاری بھاری دیکھی تو میں نے بہانہ بنا دیا کہ سر میں درد ہے اور بخار بھی۔ تو اس نے کہا کہ جا کر آرام کرو اور انجیکشن وغیرہ لگانے کی تاکید کی۔

میں نے موٹر سائیکل اٹھائی اور شہر والے گھر آ گیا۔ اندر داخل ہوتے میرا بدن خوف میں ڈوب رہا تھا مگر میں خود پر قابو رکھتے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ شام کو میں کھانے کے لیے اُٹھنے کی سوچ میں رہا تھا کہ باہر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو سامنے روز کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے بدن میں برف کی سرسراہٹ لہرا گئی اور میں زبردستی مسکراتا ایک جانب ہو گیا۔ وہ شاپر

اُٹھائے کچن کی طرف چلی گئی دروازہ بند کر کے میں بھی اس کے پیچھے کچن میں آ گیا اور پیچھے سے اسے اپنے دونوں بازوں سے لے لیا دراصل میں اس کے جسم کی سمیل چیک کرنا چاہتا تھا مگر مجھے کوئی بھی خاص بات نظر نہ آئی وہ گھوم کر میرے سینے سے لگتے بولی

"شارو بہت مشکل سے رات کاٹ پائی ہوں تمہاری یاد نے بے چین کر دیا اور بھاگ پڑی۔ چلو تم منہ ہاتھ دھولو میں کھانا لگاتی ہوں" پھر وہ ساتھ لایا کھانے کا سامان ٹرے میں سجانے لگی اور میں واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔

باربی کیو لائی تھی وہ اور خود بھی میرے ساتھ کھانے میں مصروف تھی۔ گھر میں نے نسرین کو فون کر کے بتا دیا کہ آج میں گھر نہیں آ سکوں گا۔ اسلم کے ساتھ پارٹی کے پاس جانا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر روز نے باہر گھومنے کی فرمائش کی اور ہم دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر کو تالا لگاتے باہر نکل آئے پہلے ادھر اُدھر گھومتے رہے پھر روز نے لنک روڈ کی طرف چلنے کا کہا شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور میں نہر کے کنارے سروس روڈ پر آگے کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور روز دونوں بازو میری کمر کے گرد حائل کیے سر میرے کندھے پر رکھے رومینٹک موڈ میں مجھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔

کافی دور نکل آنے پر اس نے واپس چلنے کو کہا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنے لیے دودھ اور میرے لیے چائے بنائی اور لباس تبدیل کر کے میرے بیڈ پر آ گئی۔ پہلی بار مجھے اس کے ساتھ سوتے میں خوف محسوس ہوا مگر میں نے روز پر یہ کیفیت ظاہر نہ ہونے دی۔ اندرونی خوف نے میرے جذبات برف کی مانند سرد کر ڈالے تھے مگر روز نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور وہ میرے ساتھ لگ کر بے خبر سوتی رہی۔

صبح اُٹھ کر اس نے ناشتہ بنایا اور مجھے یہ کہہ کر گھر سے نکل گئی کہ میں کچھ سامان لے آؤں مارکیٹ سے جاتے ہوئے اس نے کہا کہ کچھ روپے رکھے ہیں وہ لے لینا میں نے ناشتہ سے فارغ ہو کر برتن سمیٹے اور کچن میں آ کر رکھے وہ روپے اُٹھائے جو کچن میں پڑی ٹیبل پر رکھے تھے گنا تو بیس ہزار تھے وہ جیب میں رکھتے میں دوبارہ بستر پر آ گیا اور یونہی کئی طرح کی سوچوں میں اُلجھا رہا۔ جب پڑے پڑے تھک گیا تو اُٹھ کر تیار ہوا اور تالا لگاتے کام پر نکل پڑا۔

دن بھر روز کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا رہا کبھی خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ہو سکتا ہے اُس کا نگر نے غلط کہا ہو یا مجھے دیکھنے میں کوئی دھوکا ہوا ہو مگر میں کسی بھی نتیجہ میں نہ پہنچ پایا اور چھٹی کر کے واپس آیا تو روز کو کمرے میں سوتے پایا تالا باہر سے کھلتا تھا اور ہم دونوں کے پاس چابی تھی۔ میں نے روز کے سراپے کا جائزہ لیا وہ بے ترتیب انداز میں بڑی قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں سب کچھ بالائے طاق رکھتا ہوا جوتا اُتارتا بغیر چینج کیے اس کے پہلو میں آ لیٹا مجھے قریب پا کر وہ کسمسائی۔

"وہ کون تھی؟" اور کیا تھی؟ مجھے اس کی کوئی پروا نہ رہی بس وہ روز تھی میری روز! پتا نہیں کب میری آنکھ لگی۔

جس پر میں بڑبڑا کر اُٹھا تھا وہ باہر دروازے پر ہونے والا شور تھا۔ روز کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ میں سلیپر پہنے بغیر جلدی سے دروازے کی طرف بھاگا باہر ایک ادھیڑ عمر کا بھکاری بار بار روز کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ اُسے بری طرح جھڑک رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے وہ چیخا۔

"بچ جاؤ اس ناگن سے تمہیں ریزہ ریزہ کر کے نگل رہی ہے اور تمہیں خبر تک نہیں"۔

ایک پل کے لیے تو میں اس کے منہ سے یہ سن کر سکتے کے عالم میں رہ گیا مگر جلدی سنبھلتے میں نے ہاتھ سے روز کو دروازے سے پیچھے کیا اور بھکاری کو غصہ سے ڈانٹتے دروازہ بند کر دیا۔ روز غصہ سے بپھری ہوئی کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے اس بھکاری کی ٹو تکرار سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کوئی پہنچا ہوا بابا تھا' جس نے میرے شک کی تائید کر دی تھی۔

کچن میں آ کر میں نے غصہ سے بل کھاتی روز کو پیار دلاوے ٹھنڈا کیا اور ناشتہ میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"آج کل کے حرامی مشٹنڈے بھکاری زبردستی لوگوں کے گھر میں گھسے چلے آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بابا معاف کرو اور وہ لگا مجھ میں کیڑے نکالنے" روز نے بدستور اسی جلے کٹے لہجہ میں کہا۔

"اچھا جناب آپ اب چھوڑ دیں اس قصہ کو وہ دفع ہو گیا ہے" میں نے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے کہا۔ میرے جسم میں ہاتھ رکھتے ایک جھرجھری سی لپک گئی اور میں نے جلدی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"تم چلو میں ناشتہ لے کر آتی ہوں" روز نے انڈہ توڑتے مجھے کمرے میں جانے کا کہا۔ میں کچن سے نکل کر کمرے میں آ گیا۔ روز کے جسم کی سرسراہٹ سے مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اپنا ہاتھ کسی لپکتے سانپ پر رکھ دیا ہو۔ میری گہری سوچ کو روز کے قدموں کی آہٹ نے توڑا جو ناشتے کی ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

دورانِ ناشتہ بھی وہ غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ میں تیار ہو کر غلہ منڈی آ گیا دوپہر تک میں کام میں اُلجھا رہا جب کھانے کے لیے وقفہ ہوا تو ایک بار پھر مجھے صبح والے واقعہ نے گھیر لیا۔

میں اس بھکاری کو تلاش کرنے کے لیے بازار کی طرف نکل آیا۔ جہاں جہاں اس کے ملنے کی اُمید تھی گیا مگر گہری مایوسی ہوئی۔ چھٹی کر کے میں گھر آ گیا اور روز سے گاؤں جانے کا کہا اس نے بغیر کوئی بات کیے مجھے گاؤں جانے کی اجازت دے دی۔

چائے سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آیا۔ پہلے وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی تھی' آج اس نے کمرے میں بیٹھے ہی کہا" جاتے ہوئے دروازہ کھینچ دینا"۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور اندر سے لاک کی ہک پیچھے کرتا باہر آ گیا۔ ہک کو کھینچا اور دروازہ اندر سے لاک ہو گیا۔ میں نے اپنے اندر ایک طاقت پیدا کر لی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے روز کی اصلیت جان کر ہی رہوں گا۔

☆......☆......☆

گھر آ کر میں نے نسرین کو ادھر اُدھر کے جھانسے دیتے اسے اپنی جگہ مطمئن کر دیا اور اسی طرح کھانا کھانے سے بعد میں باہر نکل گیا آج میرے قدم کرسچن کالونی کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ وہاں شہزاد مسیح جو رنگ روغن کا کام کرتا تھا اور میری اس سے خاصی جان پہچان تھی۔ میں اس سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ واقعی روز اس کالونی کے کسی گھر کی بیٹی تھی یا نہیں۔

وہ مجھے اپنے گھر پر ہی مل گیا۔ بڑے تپاک سے ملا اور مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھا کر اپنی گھر والی سے چائے بنانے کا کہتے میرے پاس آ بیٹھا۔ ادھر اُدھر کے حالات جاننے سے بعد میں اپنے مطلب پر آ گیا۔ "یار شہزاد یہاں کتنے گھر ہیں آپ کی برادری کے؟"

"کیوں خیر ہے چوہدری!"

"نہیں یار میں نے یونہی پوچھا ہے" میں نے اُسے تسلی دی تو وہ مجھے گھروں کی تفصیل بتانے لگا۔ جب وہ بتا چکا تو میں نے روز کا ذکر کیا' کچھ پل ذہن پر دباؤ ڈالتے بولا اس نام کی لڑکی تو یہاں کسی گھر کی نہیں جو بچیاں باہر کو رس اور نوکریاں کر رہی ہیں' وہ سب ہماری ہیں۔ بڑے اعتماد سے بولا اور اپنی گھر والی کی آواز پر اندر چلا گیا شاید چائے بن گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ دوبارہ بیٹھک میں آیا تو اس نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے بتایا کہ میں نے تمہاری بھابی سے بھی دریافت کیا ہے کہ اس نام کی لڑکی ہماری پوری کرسچن کالونی میں نہیں' پھر میں چائے ختم کرتا ہوا جرنیلی سڑک کی طرف چل پڑا جہاں چاروں طرف روز کی اور میری گزری داستانیں پھیلی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

تمام رات کروٹیں بدلتے گزری' صبح میں فجر کی اذان پر اُٹھ گیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر شہر کی جانب چل پڑا کانگروں کے کڑاھے کے پاس آ کر میں نے موٹر سائیکل روکی اور بے دھڑک اس کوٹھڑی کا دروازہ اندر کی طرف دھکیلتے اندر کا جائزہ لیا چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی اور پورا کمرہ سناٹے نقشہ پیش کر رہا تھا۔

آس پاس کے درختوں پر گدھ چیخ چلا کر ماحول کو ویران کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ بدبو سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ جلدی سے موٹر سائیکل سنبھالتے میں جی ٹی روڈ کی طرف چل پڑا۔ دراصل اتنی صبح اُٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ میں روز کو گھر چیک کرنا چاہتا تھا وہ سارے شک و شبہات صحیح ثابت ہو رہے تھے جو روز کی اصلیت کی طرف جاتے تھے۔ گھر پہنچ کر میں نے باہر سے چابی لگاتے دروازہ بڑی آہستگی سے کھولا اور موٹر سائیکل دھکا لگاتے اندر کھڑا کیا اور دبے قدموں کمرے کی طرف آ گیا

دروازہ کھلا ہوا تھا پردہ پیچھے کرتے میں نے بیڈ کی طرف دیکھا۔ روز نائٹی میں بے ترتیب پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور پیار سے روز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اسے اپنے آنے کا احساس دلایا تو اس نے خمار آلود لہجہ میں کہا۔

"میرے بغیر رات بھر نیند نہیں آئی" کہتے اپنا سر تکیہ سے ہٹا کر میری گود میں رکھ لیا۔

"بس یہی سمجھ لو" میں نے اس کے ہونٹوں کو چھوتے جواب دیا؟

"چلو جوتے اُتار کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ"

"جی بہتر" میں نے سدھائے ہوئے جانور کی طرح جوتے اُتار کر پیچھے رکھے اور بیڈ پر اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ پتا نہیں کب آنکھ لگی جب جاگ آئی تو دوپہر سر پر تھی پورا جسم کر رہا تھا اُٹھ کر واش روم گیا اور کافی دیر تک نہانے سے طبیعت ذرا سنبھلی تو روز کو آواز دی مگر وہ گھر پر نہیں تھی۔ شاید مارکیٹ گئی ہوگی۔ سوچتے میں کچن میں آیا چائے بنا کر کمرے میں آ گیا ابھی گھونٹ بھرا ہی تھا کہ باہر گلی میں بھکاری کی صدا بلند ہوئی جو شاید میرے دروازے پر ہی رکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا تو وہی بابا جوگی رنگ کا چوغہ پہنے کھڑا تھا مجھ پر نظر پڑتے ہو چلایا۔

"بچ جا اس ڈائن سے تجھے سارا چاٹ جائے گی بچ جا بیٹا۔ بچ جا۔"

"بابا میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں!"

"سرکار لال شاہ کے دربار پر آ جانا۔ شام کو میں ادھر ہی ہوتا ہوں بابے نے مجھے اپنا ٹھکانہ بتایا۔ لال شاہ کا دربار ارنم ڈیری کے ساتھ ریلوے لائن کے پار تھا میرے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ میں نے جیب سے تھوڑے سے روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور شام کو آنے کا کہا وہ صدا لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا روز گھر کا سامان اُٹھائے اندر داخل ہوئی۔ مجھ پر نظر پڑتے مسکرائی اور بولی۔

"میں نے تمہاری آڑھت پر فون کر کے بتا دیا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اس لیے تم کام پر نہیں آ سکو گے۔" اور سامان رکھتے کچن کی طرف چلی گئی۔ کھانا ہم دونوں نے مل کر بنایا۔ کھانے سے بعد برتن سمیٹتے اس نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں چلوں گی۔ بہت دن ہو گئے ہیں گھر گئے ہوئے۔"

پھر شام کو وہ بھی میرے ساتھ گاؤں جانے کے لیے چل پڑی حسب سابق میں نے اسے گاؤں پہنچ کر اسی راستے پر چھوڑ دیا جہاں وہ ہر بار اُترتی تھی اور خود میں گھر کی طرف مڑنے لگا تو اس نے آواز دیتے مجھے روکا۔

"ثارو میں ادھر تمہارا انتظار کروں گی رات کو" میں نے ناچاہتے ہوئے بھی آنے کی حامی بھر لی۔

گھر سے اُسی روٹین کی طرح میں نکلا اور نسرین کو یہ کہتے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی کہ میں دربار پر جا رہا ہوں ایک بندے کو ملنا ہے۔ ارنم ڈیری والا راستہ میں نے جان بوجھ کر اختیار نہیں کیا تھا کہ کہیں روز کی نظر میں نہ آ جاؤں۔ کینٹ کی طرف جانے والی سڑک سے ہوتا ہوا میں جی ٹی روڈ پر چڑھ گیا اور چکر کاٹ کر دربار بابا لال شاہ پہنچ گیا موٹر سائیکل کھڑی کی اور لائن کراس کر کے دربار کے احاطہ میں آ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ موجود تھے مگر اُن میں وہ بابا جی نہیں تھے جن کے پاس میں آیا تھا۔ دو تین دربار انتظامیہ کے لوگ دکھائی دیے جو دربار کا انتظامی امور چلا رہے تھے۔ ان کے قریب جا کر میں نے اس بابا جی کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس ڈھاری پر ملیں گے۔ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے میری راہنمائی کی۔

میں اس ڈھاری کی طرف ہو گیا جو دربار کی بغل میں تھی۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا جب میں قریب پہنچا تو چند پرانی قبریں تھیں وہاں اور ایک کچی اینٹوں سے بنا کمرہ جس کے اندر مدھم روشنی میں کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ باہر رُک کر میں نے آواز دی تو وہ اُٹھ کر باہر آ گیا وہی بابا جو مجھے صبح ملا تھا۔

آ گئے بیٹا؟

"جی بابا جی"

"آ جاؤ اندر کہتے میں کمرے میں آ گیا۔

"بیٹھ جاؤ میں بھی زمین پر پڑی چٹائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

کب سے تمہارے ساتھ ہے یہ خوبصورت بلا؟

تھوڑا عرصہ ہوا ہے پھر میں نے شروع سے آخرت تک ساری روداد بابا جی کو سنا ڈالی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تم کوئی اپنا پہنا کپڑا۔ مجھے دے جاؤ اور اپنا ایڈریس بھی۔ میں صبح تم سے آ کر ملوں گا۔" میں نے اپنی بنیان اُتار کر بابا جی کو دی اور دو ہزار روپے بھی نذرانہ کے طور پر انکی خدمت میں رکھے اور اجازت لیتے اپنا فون نمبر دیا اور واپس جانے کے لیے دربار کی طرف چل پڑا۔ جن سے پوچھ کر میں ڈھاری پر آیا تھا ان میں سے ایک نے مجھے روک کر پوچھا کہ بابا شرفو مل گیا آپ کو میں نے اثبات میں جواب دیا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا اسی اثنا میں دربار کے احاطہ سے رمضان نکل کر میری طرف آیا اور مجھے ساتھ لے جانے کا کہا رمضان موچی بھی میرے گاؤں کا رہنے والا تھا اور تعویز گنڈا کرنے کا بھی کام کرتا تھا۔ بابا لال شاہ کے متوالی کو سلام کرتے میرے پیچھے آ بیٹھا اور میں نے موٹر سائیکل جی ٹی روڈ کی طرف بڑھا دی۔

کینٹ مارکیٹ کے قریب وہ میرا شکریہ ادا کرتے اُتر گیا اور میں نے موٹر سائیکل جرنیلی کی طرف موڑ لی۔ گاؤں پہنچ کر موٹر سائیکل گھر کھڑی کی اور پیدل اس طرف چل پڑا جہاں روز کے ملنے کا امکان تھا۔ گاؤں کے آخری کونے پر وہ پیلو کی گھنی جھاڑیوں کے پاس اندھیرے میں کھڑی تھی۔ میرے قریب آنے پر وہ بڑی افسردہ ہوئی اور میرے سینے سے لگ گئی۔

"ثارو مل آئے بابے شرفو سے" اُس نے میرے سینے سے لگے لگے بڑے دکھ بھرے لہجہ میں سوال کیا۔

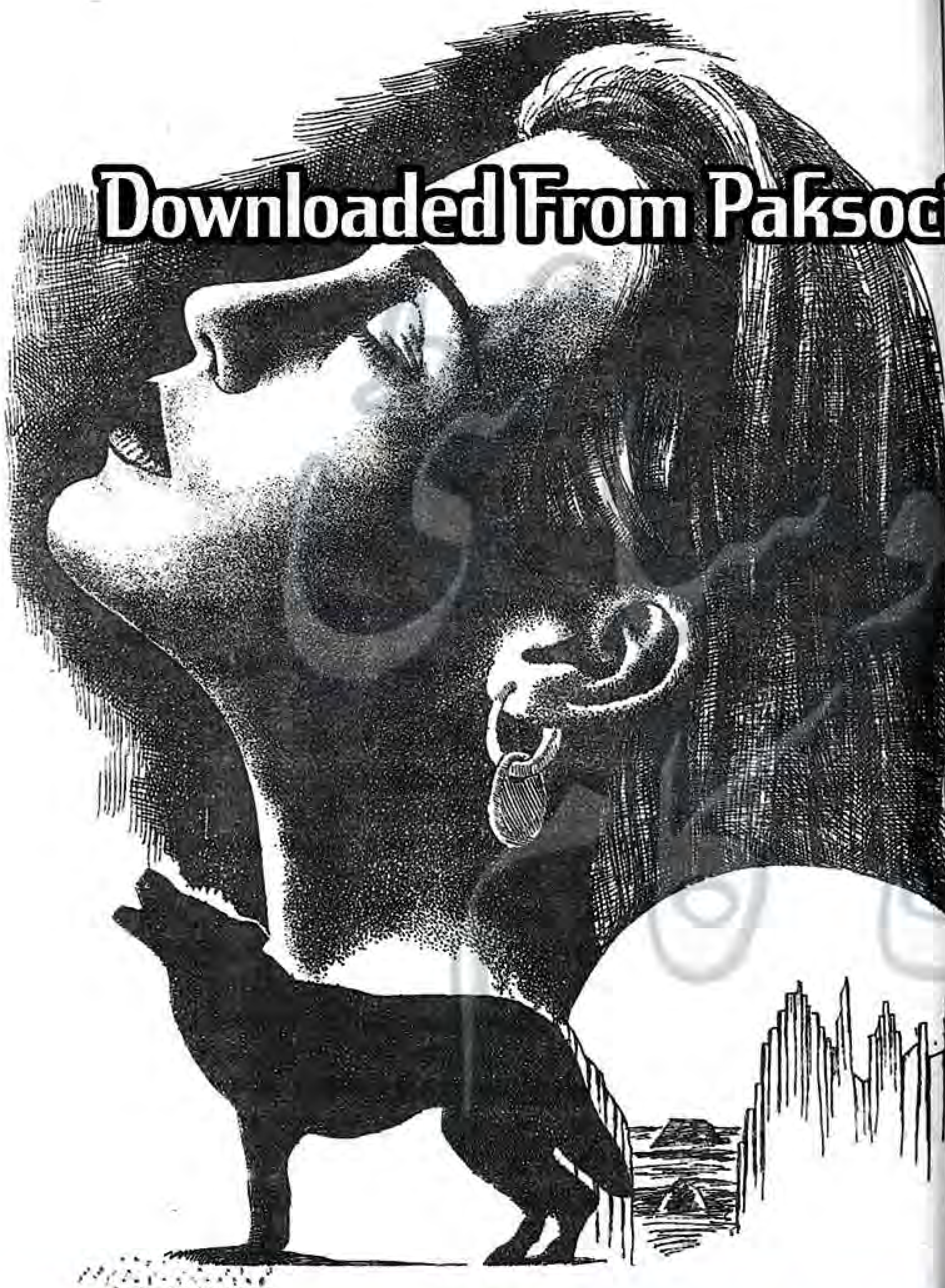
یکدم مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے......" اس نے میری بات کاٹتے کہا" مجھے کسی صفائی کی کوئی ضرورت نہیں ثارو !بس ایک بات میں تم سے پوچھتی ہوں کہ جب سے میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں کیا کمی چھوڑی ہے میں نے اپنے پیار میں" وہ بول رہی تھی اور میں مارے ندامت کے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ "میرا اور تمہارا سفر بس اتنا ہی تھا" کہتے اس نے اپنے ہونٹ میری گردن پر رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے دو دہکتے انگارے میری گردن پر رکھ دیے ہیں میں تلملا کر پیچھے ہٹ گیا روز کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ پہلی بار مجھے اس سے خوف محسوس ہوا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ جھاڑیوں میں تحلیل ہو گئی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جہاں یوں اس کے جانے کا دکھ ہوا وہاں اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ میں کسی مافوق الفطرت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ گرتا پڑتا گھر پہنچا اور نسرین کو سر دبانے کا کہتے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رہ رہ کر روز کے ساتھ گزرے لمحات یاد آ رہے تھے۔ پتا نہیں کب نیند نے دبوچ لیا۔

صبح اس وقت آنکھ کھلی جب کئی لوگوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں ہڑبڑا کر اُٹھا دیکھا تو پولیس میرے گھر کے اندر موجود تھی اور گاؤں کے کئی لوگ ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ مجھے پکڑ کر انہوں نے وین میں بیٹھایا اور تھانہ کینٹ لے آئی۔ یہاں آ کر مجھے معلوم ہوا کہ مجھے بابا شرفو کے قتل میں ملوث ہونے کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ رات کو کسی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور صبح اس کی لاش ملی تھی۔ ڈھاری والے کمرے سے اُسے رات کو مل کر جانے والا میں تھا۔ میرا فون نمبر جو میں نے دیا تھا اس کی روشنی میں پولیس مجھ تک آ پہنچی۔ مجھے تو علم تھا کہ اسے کس نے ٹکڑے ٹکڑے کیے تھے کیونکہ مجھ سے بابا شرفو کی آخری ملاقات تھی۔ رمضان اور دربار کا متوالی موقع کے گواہ تھے جس کی نشاندہی پر مجھے گرفتار کیا گیا کہ رات میں ہی ملا تھا اسے۔ جب میں نے پولیس کو بیان دیا کہ روز مافوق الفطرت کوئی چیز تھی اور باقاعدہ میرے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ اس نے بابا شرفو کو قتل کیا مگر میری اس بات کو تفتیشی آفیسر میری دماغی حالت غیر تسلی بخش قرار دے رہا تھا۔

میرے پاس اس صورتِ حال کا کوئی حل نہیں تھا۔ جیل میں ہوں سارے حالات اور واقعات میرے خلاف جا رہے ہیں دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟

☆☆......☆☆



ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 12

درشہوار نے اس کی طرف دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے یہ لڑکا اس کے بہت کام کا ہے۔

''تمہیں کس نے بتایا کہ ہمیں ملازم کی ضرورت ہے؟'' درشہوار نے اس سے پوچھا۔ ''ہم نے تو کوئی اشتہار بھی نہیں دیا۔''

''میں نے سب ہی گھروں میں ملازمت کے لیے دروازے کھٹکھٹائے ہیں۔ کسی نے مجھے نہیں رکھا۔ بیگم صاحبہ میں بہت ضرورت مند ہوں۔ آپ رکھ لیجیے نا پلیز۔'' سولہ یا سترہ سال کا یہ لڑکا اتنا خوبصورت اور پرکشش تھا کہ درشہوار اب تک اس کے سراپے میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ کوئی بھی غریب لڑکا اتنا حسین کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف غریب ہے بلکہ کئی دنوں کا بھوکا بھی ہے۔

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟ تمہاری ضمانت کون دے گا۔ بغیر ضمانت کے تو ہم کوئی ملازم نہیں رکھتے۔ کوئی تو ہو جو تمہیں جانتا ہو۔ کل کلاں کو اگر تم چوری کر کے بھاگ گئے تو کون ذمہ دار ہوگا۔''

''میری طرف دیکھیے! کیا میں آپ کو چور لگتا ہوں'' اس نے بہت ہی مٹھاس سے کہا۔ درشہوار نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے دل نے کہا وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اس کی صورت پر اتنی زیادہ معصومیت کھیل رہی تھی کہ وہ چور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟'' درشہوار ہر چند کہ اسے رکھنے کا فیصلہ دل ہی دل میں کر چکی تھی لیکن پھر بھی وہ تسلی کرنا چاہتی تھی۔

لڑکا چپ رہا جیسے اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو۔

''دیکھو اس طرح تمہیں کوئی بھی ملازمت نہیں دے گا۔ تمہیں کوئی تو جانتا ہو۔'' درشہوار نے اسے چپ دیکھ کر پھر سے اپنی بات دہرائی۔

لڑکا کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''میں آپ کو ایک ضمانت دے سکتا ہوں!'' اس کے سوچ کر بولنے پر درشہوار کو عجیب سی مسرت ہوئی تھی۔

''وہ کیا؟''

اس سے پہلے کہ لڑکا کچھ بولتا درشہوار نے سنا....

''اسے رکھ لیجیے اسے میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں'' درشہوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہ حیران رہ گئی.. درشہوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ صنوبر تھی۔

''اس کی ضمانت میں دیتی ہوں۔ ماما... آپ ذرا غور سے اس کی صورت دیکھیے... یہ تو شکل سے بہت ہی معصوم لگتا ہے... چوروں کی شکلیں ایسی نہیں ہوتیں۔ ویسے میرا دل بھی کہتا ہے ہمیں اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔'' صنوبر کی بات نے درشہوار کو معمولی سا پریشان کر دیا تھا کہ وہ کبھی اس طرح کسی مسئلے میں بولتی نہیں تھی لیکن اس وقت... وہ جس طرح بول رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس لڑکے کو ذاتی طور پر جانتی ہو۔ درشہوار تو خود بھی اسے رکھنے کا ارادہ کر چکی تھی اب صنوبر کی بات نے اس کے ارادے کو اور بھی تقویت دے دی اور وہ بولی۔

''ٹھیک ہے صنوبر میں اسے رکھ لیتی ہوں.... ویسے بھی ہمیں کوئی کل وقتی ملازم درکار ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ میرے خیال سے''

صنوبر نے ماں کے فیصلے پر خوش ہوتے ہوئے اس کی تائید کی۔

''لیکن یہاں ملازمت کرنے کے لیے تمہیں اپنا نام تو بتانا ہی ہوگا'' صنوبر نے نرمی سے کہا اور وہ ایک دم جیسے وہ کچھ یاد کر رہا ہو۔

''ارے یہ تو مجھے آتے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔ معاف کیجیے میرا نام حماد ہے۔ حماد ابراہیم۔''

''ابراہیم..... یہ تو تمہارے والد کا نام معلوم ہوتا ہے۔ کہاں ہیں وہ؟'' حماد گھر کے لاؤنج میں آ چکا تھا۔ صنوبر اور درشہوار فراغت سے کرسیوں پر براجمان ہو چکی تھیں لیکن حماد اب بھی کھڑا ہوا تھا۔

''وہ دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں''

''اپنے والد کی اجازت سے آئے ہو نا؟ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ کہیں بعد میں تمہارے والد کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔ تمہارا شناختی کارڈ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔'' درشہوار نے اپنی تسلی کرنی چاہی۔

''اس کی آپ فکر مت کیجیے بیگم صاحبہ مجھے انھوں نے خود بھیجا ہے۔ اصل میں وہ مزدوری کرتے ہیں۔ ان کی کمائی سے گھر کا خرچ پورا نہیں پڑتا۔ اس لیے انھوں نے مجھے کہا کہ مجھے اب کوئی کام کرنا چاہیے۔ ہم چھوٹے شہر کے رہنے والے ہیں وہاں ملازمت نہیں ملتی اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔'' لڑکا کیسے پٹر پٹر بول رہا تھا اس بات نے درشہوار کو کسی انجانے سے وسوسے میں ڈال دیا۔ وہ سوچنے لگی شکل سے جتنا معصوم ہے اتنا شاید ہے نہیں۔ جبکہ صنوبر اس کی بات کرنے کے انداز سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ بیگم صاحبہ میں بہت محنت سے کام کروں گا۔ آپ کو کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا میری طرف سے'' درشہوار اس کے مخاطب کرنے پر جیسے چونک ہی تو پڑی اسے لگا یہ لڑکا اندر تک جھانک سکتا ہے۔ وہ جو سوچ رہی تھی اس کا اسے کیسے پتا چلا۔ جو اس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ درشہوار اس کی طرف توجہ سے دیکھنے لگی اور اسی ایک لمحے میں اسے اپنے اندر ایک انجان سا خوف تیرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ خود کو سمجھانے لگی کہ یہ اس کا وہم ہو سکتا ہے ورنہ یہ لڑکا محض اپنی نوکری پکی کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ باتیں کر رہا ہے۔ اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اس نے اپنی پریشانی کی طرف سے توجہ ہٹا کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا تو اسے یہ منظر اچھا لگا صنوبر اس کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اسے صنوبر کی ہنسی بچپن سے ہی بہت مسحور کیا کرتی تھی لیکن جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس نے ہنسنا بہت ہی کم کر دیا۔ اور پھر میں بھی تو اسے تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ درشہوار نے خود کو ملامت کی۔

''ماما میں اسے کا کوارٹر دکھا دوں؟'' صنوبر نے اسے مخاطب کیا تو اس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ہاں بیٹے دکھا دو۔'' صنوبر اسے اس کا کوارٹر دکھانے گھر سے باہر جانے لگی تو راستے میں اس کی مڈبھیڑ سلمان

سے ہو گئی۔ وہ حماد کو دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکا۔

''یہ کون ہے... پہلے تو اسے کبھی نہیں دیکھا؟'' سلمان کے سوال پر صنوبر کو لگا اس کا بھائی دراصل اس سے بات کرنے اور اپنے تعلقات ٹھیک کرنے کے لیے اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔

''ماما نے نیا ملازم رکھا ہے'' صنوبر نے مختصر اور سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

''تو کیا یہ اب یہیں رہے گا؟'' صنوبر آگے نکل چکی تھی۔ جب پیچھے سے سلمان نے اس سے پوچھا۔

''جی صاحب میں اب یہیں رہوں گا'' سلمان کے سوال کا جواب حماد نے دیا اور صنوبر کے پیچھے چل دیا۔ سلمان نے اچھا کہا اور اندر چلا گیا۔

صنوبر اسے کوارٹر دکھانے کے لیے گئی اور یہ دیکھ کر اسے کافی افسوس ہوا کہ کوارٹر کافی گندا ہو رہا تھا۔

''اوہ........ یہ تو کافی خراب ہو رہا ہے''

''کوئی بات نہیں صنوبر بی بی..... میں اسے خود ہی صاف کر لوں گا'' صنوبر چونکی... پھر کچھ کہے بغیر سر کے اشارے سے اس نے جیسے اس کی بات کو صاد کیا۔

''تو میں چلوں...؟''

''جی ٹھیک ہے...'' اس نے کہا اور پھر ایک دم ہی بولا۔ ''کیا میں آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے چلوں۔ صفائی بعد میں کر لوں گا۔''

''نہیں.. اتنی ایمرجنسی نہیں ہے تم پہلے یہاں کی صفائی کر لو۔ ویسے بھی تمہیں رات میں یہاں سونا ہے۔ پتا نہیں بعد میں ٹائم ملے یا نہیں''

''جی ٹھیک ہے'' یہ کہہ کر وہ اسے جاتے دیکھتا رہا۔

صنوبر کے قریب رہنے کا اور کوئی راستا نہیں تھا۔ اور اس بار وہ کسی جانور کے روپ میں اس گھر میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہاں کامیاب ہونے کے بعد اسے ابوریحان اور نگراں کے مسئلے کی یاد آگئی۔ اسے لگا اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ نگراں کو کوئی نہ کوئی سبق ضرور سکھایا جائے۔ لیکن کیسے؟؟ یہ وہ سوال تھا جس نے اس کی سوچوں کو ایک مقام پر ٹھہرا دیا۔ اس نے آنکھوں کے اشارے سے اپنے کمرے کو ایک منٹ سے بھی کم میں ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ اب ہی کمرا ایسا چمچما رہا تھا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی دھول مٹی اٹا سرونٹ کوارٹر ہے... جسے کچھ دیر پہلے کسی انسان کے رہنے کے لیے کوئی بھی موزوں قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی وہ کمرے کی خوبصورتی کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ اسے باہر سے کوئی مردانہ آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے کمرے کو پھر پہلے کی طرح کاٹھ کباڑ سے اٹا ایک ناقابلِ استعمال کمرا بنا دیا اور باہر کی طرف لپکا۔

''جی صاحب جی....'' اس کے کمرے کے باہر سلمان کھڑا ہوا اسے آوازیں دے رہا تھا۔

''مجھے تم سے ایک کام ہے... ذرا میرے ساتھ چلو۔'' سلمان نے کہا۔

''جی بہتر'' یہ کہہ کر وہ سلمان کے پیچھے چلنے لگا۔ گھر کے اندر پہنچ کر سلمان اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور اپنی الماری کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں بہت دنوں سے اسے ٹھیک کرنے کا سوچ رہا تھا۔ بہت خراب اور بے ترتیب ہو چکی ہے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو؟''

''جی میں کر دیتا ہوں'' حماد نے کہا۔

سلمان یہ کہہ کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا اور حماد سوچنے لگا کہ اسے یہ کام کتنی دیر میں کر دینا چاہیے۔ اگر زیادہ جلدی کر دیا تو کہیں... سلمان کو شک نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ آرام آرام سے الماری کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا۔ سلمان نہا کر بڑا سا تولیا باندھ کر باہر آیا اور اپنے آپ کو آرام دینے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے جیسے حماد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ سلمان اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ حماد اس کی طرف دیکھتے

ہوئے۔ دھیرے دھیرے کام کرتے ہوئے سوچنے لگا انسانوں میں بھی کتنے تضاد ہیں۔ غریبوں کے بچے کبھی اتنی فارغ البالی سے لیٹ کر سو نہیں سکتے انھیں تو رات کو بھی مشکل سے سونے کے لیے جگہ ملتی ہے۔ اور ایک یہ ہے نواب کا بچہ کیسے مزے سے سو رہا ہے۔ حماد جو دراصل سلمان ابراہیم تھا۔ اس نے سلمان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا اور سوچا اگر اسے پتا چل جائے کہ میں ہی وہ بلا ہوں جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔ تو یہ شخص مجھے ایک دن بھی اپنے گھر میں رہنے نہیں دے سکتا۔ گھر میں رہنا تو کیا یہ تو مجھے جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اس سے بھی زیادہ بڑی اور انہونی بات تو یہ ہے کہ اگر کسی کو بھی یہ بات پتا چل جائے کہ میں کوئی انسان نہیں بلکہ جن ہوں تو ممکن ہے یہ لوگ مجھ سے ڈر جائیں اور میرا داخلہ بند کر کے مجھ موت کے گھاٹ اتارنے کی ترکیبیں کرنے لگیں۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس نے اپنی جن جاتی کے سارے ہی اصولوں کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔ لیکن اب پہلے کی طرح اس کے ضمیر پر بوجھ نہیں تھا اور اسے اپنا آپ اندر سے بھی ہلکا محسوس ہوتا تھا۔ بس یک ہی بوجھ تھا اور وہ یہ کہ صنوبر اس سے نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔

صنوبر مجھ سے محبت کرتی بھی تو کیسے؟ میں تو آج تک اس کے سامنے اصل روپ میں نہیں آیا۔ بس ایک جانور بن کر ہی اس سے ملتا رہا ہوں۔ تو ایک جانور سے کوئی بھی لڑکی ایسی محبت کیسے کر سکتی ہے جیسی محبت انسانوں سے کی جاتی ہے۔ صنوبر بے قصور تھی، اس کی زندگی میں اس کے آنے سے پہلے ہی کوئی اور موجود تھا۔ وہ اسی کے لیے اداس رہا کرتی تھی۔ مجھے اس سے محبت ہوئی تو اس میں صنوبر کا کیا قصور ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں عورت آسانی سے اپنی پہلی محبت بھولتی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بات اتنی درست نہ ہو لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بات پوری طرح درست ہو۔ بہرحال نورانی بزرگ سے ہونے والی ملاقات کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب صنوبر کو حاصل کرنے کے بجائے اس کے راستے میں آنے والی مشکلات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور جب صنوبر شرجیل کی ہو جائے گی تو وہ واپس اپنے ماں باپ کے پاس چلا جائے گا۔ اسی لیے اب اسے اپنا بہروپ بدلنا کوئی ایسا غلط نہیں لگتا تھا جیسا پہلے لگا کرتا تھا۔

سلمان کو سوتا چھوڑ کر وہ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ الماری تو اس نے ایک لمحے میں مرتب کر دی تھی۔ اب اس کی نظریں صنوبر کو تلاش کر رہی تھیں اور صنوبر اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی اس لیے دن میں اسے نیند نے پکڑ لیا تھا۔ حماد کچھ دیر تک اس کے کمرے کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے سوچا کہ کہیں کسی نے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اس لیے وہ خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔

اب وہ ایک نیا نکور جوان ہوتا ہوا لڑکا تھا اور اس ناتے سے اسے کسی بھی خاتون کے کمرے میں بن بلائے جانے کی اجازت نہیں ہوسکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ صنوبر کے کمرے کے پاس کھڑا رہ کر اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا تھا اسی لیے وہ صنوبر کے کمرے کے پاس زیادہ دیر نہیں رکا اور کچن کے پاس جو صحن تھا اس میں آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

سلمان سو کے اٹھا تو اس کا تولیہ اس کے جسم سے الگ ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا اور یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اٹھا تولیہ پھر سے جسم کے گرد لپیٹا اور کپڑے پہننے سے بھی پہلے اس نے الماری کے دروازے کھول کھول کر دیکھے تینوں دروازے کھول کر دیکھنے کے بعد اس نے نئے ملازم لڑکے کے کام کو بے پناہ سلیقے سے کرنے پر دل میں اس کی تعریف کی اور پھر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اسے ابھی اور سونا تھا۔

سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اسے خیال آیا اور اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا اسے آئے ہوئے ابھی صرف آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ تک سویا تھا۔ تو کیا......'

'اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس لڑکے نے الماری کا کام صرف پندرہ منٹ میں یا اس سے بھی کم وقت میں مکمل کرلیا تھا۔ اسے شدید حیرانی ہوئی یہ کام زیادہ نہیں تو دو گھنٹے سے کم کا نہیں تھا۔ لڑکا تو بڑا تیز ہے اس نے دل میں سوچا اور پھر سوچ کے مختلف دائروں میں نیند نے اسے پھر سے کب جکڑ لیا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆......☆......☆

حماد کو دیوار سے اداس بیٹھے دیکھ کر در شہوار کو عجیب سا افسوس ہوا۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کر کے وہ بولی۔

''ارے تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ تمھیں تو اپنے کوارٹر کی صفائی کرنی تھی؟''

''جی بیگم صاحبہ وہ میں کر چکا ہوں۔ یہاں آیا تو ایسا لگا گھر میں سب سو رہے ہیں اس لیے کسی کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کو کوئی کام ہو تو بتا دیں میں کر دوں گا بیگم صاحبہ'' وہ کھڑا ہو کر بڑے ہی مؤدب انداز سے بول رہا تھا۔ در شہوار اس کے انداز تخاطب سے متاثر ہوئی۔

''مجھے جو کام ہے وہ تم نہیں کر سکو گے۔ میں خود ہی کر لوں گی۔ میرے سر میں کچھ درد تھا میں چائے بنانے آئی تھی۔ تم بیٹھو میں ذرا چائے بنالوں پھر تمھیں کوئی کام بتاتی ہوں'' یہ کہہ کر در شہوار کچن میں جانے لگی تو وہ بولا۔

''بیگم صاحبہ آپ نے یہ کیسے جانا کہ میں چائے نہیں بنا سکتا۔ میں تو ہر کام کر سکتا ہوں۔ آپ اجازت دیں تو میں ابھی آپ کو چائے بنا کر دے سکتا ہوں؟'' در شہوار کو حیرت ہوئی۔

''کیا مطلب! کیا تم پہلے کہیں کام کر چکے ہو؟''

''جی بیگم صاحبہ پہلے میں ایک اور جگہ کام کر چکا ہوں'' وہ تواتر سے بولا۔

''لیکن جب میں تم سے کسی کی ضمانت مانگ رہی تھی تو تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔ میں تو سمجھی تمھیں کوئی کام آتا ہی نہیں ہوگا اور یہ تمہاری پہلی جاب ہے؟''

''میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ جن لوگوں کے پاس میں پہلے کام کیا کرتا تھا وہ میری ضمانت دیں گے تو ان کا ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔''

''کیا مطلب؟ تم نے ایسا کیا کیا ہے جو وہ تم سے ناراض ہیں اور تمہاری ضمانت نہیں دینے سے انکار کر دیں گے۔ کہیں تم نے کوئی چوری ووری تو نہیں کی۔'' شک کا سانپ در شہوار کے ذہن میں پھن اٹھانے لگا۔

''نہیں نہیں بیگم صاحبہ ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے پہلے آپ کو چائے بنا دیتا ہوں اس کے بعد ان کے بارے میں بتا دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں جانے لگا۔

''نہیں... رکو... پہلے مجھے بتاؤ کہ تم نے ایسا کیا کیا ہے جو تمھیں وہاں سے نوکری چھوڑنا پڑی یا انھوں نے تمھیں نکال دیا؟''

''ارے آپ تو مجھ پر شک کرنے لگیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا چلیں بتاتا ہوں۔ میں نے نہ تو کوئی چوری کی ہے اور نہ ہی مجھے کسی نے نکالا ہے۔ میں پہلے جہاں کام کیا کرتا تھا وہ بس دو میاں بیوی تھے۔ بیگم صاحبہ بیمار رہا کرتی تھیں تو میں گھر کے کام کرنے کے ساتھ ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری بھی کیا کرتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا علاج چل رہا تھا لیکن علاج سے ٹھیک ہونے کے بجائے وہ مسلسل اور بیمار ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر ایک دن صاحب جی نے فیصلہ کیا وہ انھیں علاج کے لیے کہیں دوسرے ملک لے جائیں گے۔ جس دن انھوں نے یہ بات کی میں سمجھ گیا کہ میرا دانہ پانی وہاں سے ختم ہونے والا ہے۔ پھر بھی میں آخری دن تک ان کے ساتھ رہا اور انھیں اکیلا چھوڑا اور نہ ہی کوئی دوسری نوکری تلاش کی۔ کافی اچھے لوگ تھے۔ صاحب نے مجھ سے کہا بھی کہ مجبوری ہے تمھیں نکالنا نہیں چاہتے لیکن تم ابھی اتنے چھوٹے ہو کہ پورا اور اتنا بڑا گھر تمہارے حوالے کر کے جا بھی نہیں سکتے' اس لیے مجھے وہاں سے جانا ہی ہوگا اور یوں وہ اپنا گھر بند کر کے چلے گئے تو میں بے روزگار ہو گیا۔ اب آپ ہی بتایئے۔ میں ان کی ضمانت کہاں سے لاتا اس لیے میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔''

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو در شہوار نے ایک گہرا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ وہ ساری کہانی میں ہر لمحے یہ سوچ کر ڈرتی رہیں کہ اس کہانی میں کوئی ایسی بات نہ نکل آئے کہ انھیں اس لڑکے کو جاب پر رکھنے کا افسوس ہو اور پہلے ہی دن نوکری سے جواب دینا پڑے۔ لیکن یہ تو بات ہی دوسری تھی پھر بھی انھیں اس کی اس بات زیادہ بھروسا نہیں تھا کہ وہ چائے بنا سکتا ہے۔

''تم بولتے بہت ہو۔ یہ اتنی لمبی بات تم دو جملوں میں بھی کہہ سکتے تھے مگر لگتا ہے تمھیں کہانیاں کہنے کا شوق ہے یا پھر تمھیں لمبی بات کرنے کی بری عادت ہے'' در شہوار نے ناگواریت سے کہا۔

"معاف کر دیجیے بیگم صاحبہ! آئندہ خیال رکھوں گا" یہ کہہ کر وہ پھر چائے بنانے کے ارادے سے کچن کی طرف جانے لگا تو چاہتے ہوئے بھی درشہوار اسے روک نہیں سکیں۔ انھوں نے سوچا کہ چلو ایک بار بنانے دیتی ہوں۔ دوبارہ ایسا وقت آیا تو یہ کہہ کر منع کر دوں گی کہ تم چائے اچھی نہیں بناتے۔

"لیکن کچھ دیر بعد جب وہ چائے بنا کر لایا اور بہت ہی بڑے گھر کے سلیقے سے اس نے ان کے سامنے چائے پیش کی تو وہ ایک مرتبہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ پھر انھوں نے چائے کا پہلا سپ لیا اور ایک ہی گھونٹ میں انھیں یہ احساس ہو گیا کہ یہ لڑکا تو بڑے کمال کا ہے' اسے یہی نہیں کہ چائے بنانی آتی ہے بلکہ بڑے غضب کی چائے بنانا آتی ہے۔ وہ اس کی چائے کی مرید ہو گئیں۔ انھیں لگا کہ اس سے پہلے کبھی انھوں نے اتنی اچھی چائے نہیں پی تھی۔

"چائے بنانا تم نے کہاں سے سیکھا؟"

اس کی تعریف کرنے کے بجائے وہ اس کے اس ہنر کی تفتیش میں لگ گئیں۔

"اپنی امی سے..." وہ قصداً اب مختصر جواب دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"کہاں رہتی ہیں تمہاری امی" درشہوار بھی رکنے والی نہ تھیں۔

"وہیں جہاں سے میں آیا ہوں"

"تم جہاں سے آئے ہو اس شہر کا کوئی تو نام ہوگا؟" درشہوار تھوڑا سا جھنجلا گئیں۔

"شہر نہیں جی چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کاکوشاہ کے پاس ہے" وہ بڑے سوچ بچار کے بعد بول رہا تھا۔ درشہوار اگر کبھی اس علاقے سے گزر جاتیں یا کبھی جانے کا اتفاق ہوتا تب بھی وہ اس کا نام یاد نہیں رکھ سکتی تھیں۔ وہ کبھی اس عجیب و غریب علاقے سے نہ تو گزری تھیں اور نہ ہی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس لیے اب انھوں نے چپ رہنے میں عافیت جانی۔ البتہ ان کا دماغ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اس بے حد نا قابل بیان علاقے میں رہنے والی عورت جو حماد کی ماں تھی نے یہ چائے پتا نہیں کس سے سیکھی ہوگی۔ درشہوار کا دل چاہا کہ وہ حماد سے کہیں کہ انھیں بھی ایسی چائے بنانا سکھا دے مگر وہ اس خیال سے چپ رہیں کہ ایک نوکر سے چائے بنانا سیکھنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

"اچھا تم یوں کرو.. باہر میرے ساتھ لان میں چلو۔ باغیچے کو مالی نے اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔ سچ پوچھو تو اس آدمی سے میں بہت ناخوش ہوں۔ مجھے اس کا کام بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس سے کچھ کہتی ہوں اور وہ کچھ کا کچھ کر دیتا ہے۔ آج ہم دونوں باغیچے کو ٹھیک کریں گے۔"

درشہوار نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اٹھ گئیں۔ چائے نے ان کے سر کے درد کو کیسے پلک جھپکتے میں اڑن چھو کر دیا تھا یہ بات انھیں یاد بھی نہیں تھی۔ وہ بھول چکی تھیں کہ چائے پینے سے پہلے ان کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

حماد ان کے پیچھے چل دیا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک دونوں باغیچے میں اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہے اور یہاں حماد نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ جاتے ہی اس نے یہ کہہ کر درشہوار کے ارمانوں پر اوس گرا دی کہ اس نے باغیچے میں کبھی کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی اسے اس کام کا کوئی تجربہ ہے۔ آج سے پہلے خود درشہوار نے بھی اس کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا پتا نہیں کس خیال سے وہ اسے لے کر باغیچے میں اتر پڑیں اور جتنا وقت بھی وہ رہیں انھوں نے محسوس کیا کہ جو کچھ ان کے پھوہڑ مالی نے کیا تھا انھوں نے اس کا بھی بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ وہ حماد کو اس کام پر لگا کر پچھتا رہی تھیں۔ اور خود کو آزمانے کے لیے انھوں نے بہرحال کچھ دیر تک تو یہ بے گار ٹالی۔ پھر خاموشی سے اندر ہی اندر خود کو کوستی ہوئی گھر میں واپس آ گئیں کہ کیوں بلاوجہ اس کام میں جا کے پھنسیں۔

حماد نے کچن کے پاس لگے بیسن میں اپنا ہاتھ منہ دھویا اور وہ نہانے اوپر چلی گئیں۔ جیسے ہی وہ ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہوا تو صنوبر لاؤنج میں آتی ہوئی نظر آئی اسے بھی چائے کی ضرورت تھی۔ اس نے حماد کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کچن میں چائے بنانے کھڑی ہو گئی۔ حماد تو اس کے قریب رہنے اور اسی کے کام کرنے یہاں آیا تھا اس لیے اسے یہ کیسے گوارہ ہو سکتا تھا کہ وہ دوسروں کے کام تو کرے مگر اس کے نہ کرے جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔

"آپ بیٹھے صنوبر بی بی! چائے میں بنا دیتا ہوں" وہ اس کے عین عقب میں جا کر بولا تو ایک لمحے کو صنوبر جیسے چونک سی گئی۔

"کیا مطلب ہے۔ تم چائے بھی بنا سکتے ہو؟" اب حیران ہونے کی باری صنوبر کی تھی مگر اس نے صنوبر کو قائل کر ہی لیا کہ وہ چائے بنا سکتا ہے اور اسے ایک بار تو ضرور چائے بنانے کا موقع دیا جائے۔ صنوبر کو بھی اس چائے کا وہی مزا آیا جو اس کی ماں کو آیا تھا یا پھر اس سے بھی زیادہ...... صنوبر چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے میں آ چکی تھی اس لیے حماد اس کی تعریف یا خوش ہونے والے تاثرات دیکھنے سے محروم رہا۔

ابھی صنوبر کی چائے ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے کمرے میں بنا دستک دیے سلمان داخل ہوا۔ اس کی یہ بری عادت صنوبر کو ہمیشہ بہت ناگوار گزرتی تھی لیکن اسے سمجھانا فضول تھا۔ وہ اس سے پہلے اسے سمجھا کر دیکھ چکی تھی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے" سلمان کے ہاتھ میں بھی چائے کا کپ تھا۔ ظاہر ہے اس نے بھی حماد سے ہی لیا تھا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" وہ متوجہ ہو گئی۔

"میرا ایک دوست ہے فارس رحمان! تم یقیناً اسے جانتی ہو" اس نے بات شروع کی۔

"پتا نہیں شاید جانتی ہوں۔" صنوبر نے بے دھیانی سے کہا۔

"وہ بہت امیر ہے۔ اس کے باپ کا بزنس بہت بڑا اور وسیع ہے۔ وہ اکلوتا ہے اپنے ماں باپ کا۔" سلمان نے اس کی تعریف کے بے تکے قلابے ملانے شروع کیے۔ صنوبر کو اس کا یہ انداز کچھ اجنبی سا لگا۔ اس سے پہلے تو کبھی اس نے اپنے کسی دوست کی اس طرح تعریفیں نہیں کی تھیں۔

"وہ جو بھی ہے مجھے اس سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ تم وہ بات کرو جو مجھ سے کرنے کے لیے آئے ہو؟" صنوبر کا لہجہ بیزاریت کے باوجود نرمی لیے ہوئے تھا۔

"میں چاہتا ہوں تمہاری اس سے شادی ہو۔" وہ اتنی بڑی اور انوکھی بات ایسے بول رہا تھا جیسے یہ کوئی ایسی بات ہے کہ میں چاہتا ہوں تم میرے دوست کی دکان سے شاپنگ کرو۔"

"وہاٹ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" صنوبر کے دماغ کے قریب جیسے کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

سلمان کو لگا اسے یہ بات ذرا بھی پسند نہیں آئی۔ "کیونکہ اس میں اتنا اچھلنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی سے تو تم شادی کرو گی۔ تو فارس رحمان سے کیوں نہیں۔" سلمان اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"تمہارے اس اوباش دوست سے میں ہرگز شادی نہیں کر سکتی۔ یہ میری زندگی ہے کوئی تمہاری پسند کی چیز نہیں جسے تم اپنے دوست کو دے کر اس کو خوش کرنا چاہتے ہو۔" اب وہ پوری طرح بھڑک چکی تھی۔

"شادی سے پہلے سب لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ خود کو بدل لے گا" سلمان کو کوئی اور دلیل نہیں ملی۔

"وہ بدلے گا یا نہیں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں شادی اپنی مرضی سے کروں گی اور اس کے لیے میں کسی کا انتخاب کر چکی ہوں۔" صنوبر نے حتمی انداز سے کہا۔ کچھ دیر سلمان چپ رہا۔ اسے لگا اب کوئی بھی بات کرنا فضول ہے۔ پھر وہ صنوبر کو گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ یہ گفتگو حماد نے بھی سن لی تھی اور جیسے ہی اسے لگا کہ اب سلمان کمرے سے باہر آنے والا ہے وہ وہاں سے ہٹ آیا۔

☆......☆......☆

اپنے جس دوست کے ذریعے فارس نے صنوبر کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس کا نام شاہ جہاں تھا اور اسے سارے دوست مل کر جہانی کہا کرتے تھے۔ اس وقت سلمان' جہانی کے پاس تھا۔ اور اسے صنوبر سے ہونے والی بات بتا رہا تھا۔

"اس کا تو مطلب ہے صنوبر کی طرف سے پوری طرح انکار ہے؟" جہانی نے ایسے کہا جیسے اسے اس بات میں کوئی سنجیدگی نہ محسوس ہوئی ہو۔ "دیکھ لو! فارس ویسے تو دوستوں کا دوست ہے مگر وہ اس انکار سے ناراض بھی ہو سکتا ہے" جہانی نے مزید کہا۔

میں کیا کرسکتا ہوں یار۔ پتا نہیں کیوں فارس نے بلاوجہ یہ بات نکالی ہے۔ ہماری دوستی خراب ہو یہ میں بھی نہیں چاہتا مگر میں نے اپنے پاپا سے بھی بات کی تھی انھوں نے کہہ دیا کہ صنوبر ایک سمجھدار لڑکی ہے اور اپنی مرضی سے وہ جس کا بھی انتخاب کرے گی وہ اسی سے اس کی شادی کریں گے۔ اب اگر صنوبر ہی راضی نہیں ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ رہی بات فارس کی ناراضگی کی تو اسے اس بات پر دوستی ختم نہیں کرنی چاہیے۔'' سلمان نے تفصیل سے اپنا موقف بیان کیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ فارس کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ تم تو جانتے ہو اسے انکار سننا کتنا برا لگتا ہے'' جہانی نے جیسے اب کسی قدر سنجیدگی سے اس ٹاپک میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔

''جو بھی ہو مجھے تو تم نے بات کرنے کو کہا تھا۔ میں دونوں سے بات کرچکا ہوں۔ اور اب اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

یہ کہہ کر سلمان خراب موڈ سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر چند کہ سلمان جانتا تھا فارس کس قدر کمینہ انسان ہے لیکن اس وقت بات اس کی سگی بہن کی تھی اس لیے اسے بھی غصہ آنے لگا تھا۔ تاہم اندر کہیں وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں فارس کوئی حد سے گری ہوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ جس طرح کسی بھی لڑکی کے بارے میں یہ کہا کرتا تھا کہ سالی کو اٹھا لیتے ہیں تو کہیں...... اس سے زیادہ سلمان سوچ نہیں سکا۔

''اچھا سنو جا کہاں رہے ہو بیٹھو تو...... میں اور چائے بنواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جہانی نے انٹرکام پر اپنے نوکر کو اور چائے لانے کو کہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بولا۔ ''تم بتا رہے تھے کہ صنوبر کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ وہ کون ہے؟ کیا تم اس بارے میں جانتے ہو؟''

''نہیں...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' سلمان نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ اس لڑکے کا پتا چلاؤ جسے صنوبر پسند کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ایک ہی دھمکی کا بندہ ہو۔ ایسا ہوا تو صنوبر کو فارس کے رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔'' جہانی کی بات سن کر سلمان کو جیسے اپنی بہن کے تحفظ کا ایک راستا نظر آ گیا تھا۔ وہ فارس سے صنوبر کی لازمی شادی ہو ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ وہ فارس کی حرکتوں کو جانتا تھا اس لیے وہ اس شادی کے خلاف بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ فارس کوئی اوچھی حرکت کرے جس سے صنوبر کو تکلیف پہنچے بہتر تھا کہ صنوبر اس کی بیوی بن جائے زیادہ بہتر نظر آتا تھا اسے۔ لیکن یہ بات وہ اپنے والد اور صنوبر کو کیسے سمجھاتا' اس لیے اس نے جہانی سے کہا کہ وہ کوشش کرے گا کہ اس لڑکے کا پتا چلائے کہ وہ کون ہے۔

''ویسے پتا تو فارس بھی چلا سکتا ہے۔ ضرور اس کے اسکول کا ہی کوئی لڑکا ہوگا۔ یا پھر خاندان میں کوئی ہے تو وہ تم پتا کرو۔'' جہانی سے لڑکے کا پتا کرنے کا کہہ کر سلمان وہاں سے اٹھ آیا۔ راستے بھر اسے غصہ آتا رہا کہ وہ کیوں ایک ایسے معاملے میں پھنس رہا ہے' جس کے حق میں وہ خود بھی نہیں ہے۔ لیکن جیسے وہ مجبور تھا یا شاید لالچی۔

☆......☆......☆

''کل سلمان نے مجھ سے اپنے کسی دوست سے شادی کرنے کی بات کی تھی'' صنوبر کے منہ سے یہ بات سنتے ہی شرجیل کو جیسے جھٹکا لگا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''پریشان مت ہو۔ میں نے اس سے منع کردیا ہے'' صنوبر نے کہا۔ ''بس تمہیں بتا رہی تھی۔''

''لیکن یہ کون دوست ہے اور اسے یہ خیال کیوں اور کیسے آیا؟'' شرجیل پریشان ہوچکا تھا۔

''میں کہاں سلمان کے دوستوں کو جانتی ہوں۔ ایک دن وہ ہی جو اس نے گھر پہ اپنے دوستوں کو بلا کر ایک ادھم پارٹی کی تھی' اس میں شاید اس کے دوست فارس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔''

''فارس......'' شرجیل کے منہ سے ایسے نکلا جیسے وہ اسے جانتا ہے۔

''تو کیا تم فارس کو جانتے ہو؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''ہاں...... جم خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑا ہی اکڑو اور بدمعاش اسٹائل کا لڑکا ہے۔'' اتنا کہہ کر شرجیل جیسے کچھ سوچنے لگا۔ ''یہ بات تو سلمان بھی جانتا ہوگا۔ پھر ایک ایسے لڑکے سے وہ تمہاری' اپنی بہن کی شادی کی سفارش کیوں کر رہا ہے؟''

''یہ سب میں نہیں جانتی۔ اکڑو تو سلمان بھی بہت ہے۔ اور اس میں اتنی سمجھ بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا اور وہ بے وقوف مجھ سے پوچھنے چلا آیا۔ اور ساتھ یہ بھی بولا کہ اس نے کہا ہے وہ شادی کے بعد یکسر بدل جائے گا۔''

''ایسا کہا اس نے......'' شرجیل کو بات اتنی غیر سنجیدہ نہیں معلوم ہوئی جتنی صنوبر کو لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا۔ میں نے تمہیں واقعی پریشان کردیا ہے۔'' صنوبر اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں اٹس اوکے......'' شرجیل خاموش ہوگیا۔

''کیا سوچنے لگے؟''

''سوچ رہا ہوں۔ جلد از جلد میرے والدین کو تمہارے گھر رشتا لے کر جانا چاہیے۔'' صنوبر اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔

''تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے وہ مجھے زبردستی اپنی بیوی بنا لے گا۔ میری مرضی کے بغیر کوئی مجھے تم سے الگ نہیں کرسکتا۔'' صنوبر نے محبت سے کہا۔

''ٹھیک کہا تم نے! تمہاری مرضی کے خلاف کوئی تمہیں مجبور نہیں کرسکتا۔ لیکن ایسا اگر تمہاری مرضی سے ہوا تو کیا ہوگا؟'' شرجیل دور تک سوچ رہا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ شرجیل ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' صنوبر کو شرجیل کی بدلتی ہوئی حالت پر حیرت ہو رہی تھی۔

''تم کچھ بھی کہو صنوبر یہ بات اتنی غیر سنجیدہ نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہی ہو؟'' شرجیل کی بات سن کر ایک لمحے کو صنوبر بھی چپ ہوگئی اور شاید کہیں اندر سے اسے بھی کوئی نامعلوم ڈر سرسراتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر یہ طے ہوا کہ شرجیل جلد سے جلد اپنے گھر والوں کو صنوبر کے گھر رشتا مانگنے بھیجنے کی کوشش کرے گا''

شرجیل نے ماضی میں جو غلطی کی تھی اس سے اسے بڑی مشکل سے نجات ملی تھی۔ اب اگر صنوبر کے معاملے میں اس نے مزید دیر کی تو اسے ڈر تھا کہ کہیں بہت دیر نہ ہوجائے۔ اسے صنوبر پر یقین تھا۔ اس کی محبت پر یقین تھا۔ اس کلاس کی لڑکیاں محبت کے معاملے میں اتنی سنجیدہ اور کمیٹڈ نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے فائدے کے لیے کہیں بھی' کسی بھی وجہ سے بدل جایا کرتی ہیں۔ لیکن صنوبر ان سب سے بہت مختلف لڑکی تھی۔ وہ اپنی محبت کے لیے کوئی بھی قربانی دے سکتی تھی۔ مگر صنوبر ایک لڑکی ہے اور مفادات کی اس دنیا میں صنوبر جیسی لڑکیاں اکثر اپنی محبت اور مرضی ہار جایا کرتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فارس کا باپ بہت بڑا بزنس مین تھا۔ اس کا ساری اسٹاک مارکیٹ پر ہولڈ تھا۔ اس کا مخصص کے بازار میں سکہ چلتا تھا۔ کتنے ہی وزیروں اور حکمرانوں سے اس کے تعلقات تھے۔ خود اس کے والد سرفراز ملک کے اس کے والد نے کئی پھنسے ہوئے کاموں میں ساتھ دیا تھا۔ اس کے والد کو اگر یہ بات پتا چلی کہ فارس صنوبر میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ بھی بھی اس معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ پہلے تو انھوں نے کسی نہ کسی طرح بات سنبھال لی تھی اور اس کی مرضی اور پسند کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اب تو بات ان کی بقاء کی تھی۔ ان کے بزنس کو فارس کا باپ رحمان جب چاہے مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ شرجیل جانتا تھا اس کے والد معلوم ہونے پر پیچھے ہٹ جائیں گے اور جو بازی وہ دل کے بازار میں جیتا ہوا ہے اسے مفادات اور بزنس کے بازار میں ہار جائے گا۔ یہ بات اس نے صنوبر کو بھی نہیں بتائی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا صنوبر یہ سب سننے کے بعد بہت زیادہ پریشان ہوجائے گی۔ اور وہ اپنی صنوبر کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

جہانی نے جس وقت وہ سب باتیں فارس کو بتائیں جو اس نے سلمان سے سنی تھیں تو فارس کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت جائے اور صنوبر کو سب کے سامنے اٹھا کر لے آئے۔ اس نے مارے طیش کے یہ بات کہی بھی مگر جہانی ہوش میں تھا۔ اسے فارس کی طرح غصہ نہیں آرہا تھا اور بعض دوست ایسے ہوتے ہیں

جن کا کوئی فائدہ نہ ہو تب بھی وہ اپنا نام بنانے کو مشورہ ضرور دیتے ہیں۔ جہانی نے اسے مشورہ دیا کہ اس قسم کی حرکت سے تم ہمیشہ کے لیے صنوبر سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر تم اسے اٹھانے اور اس کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرنے میں کسی بھی وجہ سے ناکام ہو گئے تو پھر صنوبر کسی بھی قیمت پر تم سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہو گی۔ اس لیے ایسی حرکت کرنے کا مت سوچو۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ اس لڑکے کو تلاش کرو جسے صنوبر پسند کرتی ہے۔ اگر اسے راستے سے ہٹا دیا جائے تو پھر صنوبر کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔"

انسان غصے میں ہو تب بھی اسے اپنے مطلب اور فائدے کی بات سمجھ آ ہی جاتی ہے فارس کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی اور اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکے کو تلاش کر کے اس کی عقل درست کر دے گا جو اس کی صنوبر کو اس سے چھیننا چاہتا ہے۔

دوسری طرف شرجیل نے ہر پہلو سے اس معاملے پر غور کر لیا تھا اور اس کی سمجھ میں بس یہی ایک بات آ رہی تھی کہ اگر اس نے اپنے باپ کو راضی کر لیا اور وہ صنوبر کا رشتا مانگنے اس کے گھر اس کے والدین کے پاس چلے گئے۔ یہ رشتا ہو گیا تو شادی بھی ہو جائے گی اور فارس کو پتا چلنے سے پہلے اگر یہ سب ہو گیا تو پھر وہ خود بخود صنوبر کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ لیکن شرجیل نے فارس جیسے کینہ توز انسان کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ ایسے لوگ اپنی ضد اور ہٹ کے ایسے پکے ہوتے ہیں اگر صنوبر کی شادی شرجیل سے ہو جاتی تب بھی فارس اپنی ضد پوری کر کے ہی رہتا۔ لیکن فی الحال شرجیل جو سوچ رہا تھا اسے اسی پر عمل کرنا تھا۔

اسی اثنا میں حماد کو اس کے ہم شکل نے بتایا کہ اسے نگراں نے مدرسے سے نکالنے کا پورا بندوبست کر لیا ہے اس لیے وہ کچھ کر سکتا ہے تو اس کے ساتھ چلے اور یہ کارروائی روکے۔ حماد کو کیا پتا تھا کہ شرجیل کے خلاف فارس کیا کرنے والا ہے اسے مدرسے کی اب اتنی فکر نہیں تھی۔ وہ مدرسے کے داخلے اور رہائش کو صرف اس لیے بچانا چاہتا تھا کہ اس کے والد ابراہیم کے پاس اس کا یہی ایک پتا اور ٹھکانہ تھا۔ حماد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی یہ نوکری چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ نہ گیا تو بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے کیونکہ اصل بات جس نے اسے زیادہ پریشان کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ کمینہ نگراں اس کے ساتھ ابو ریحان کو بھی نکالنے کی سازش بن رہا تھا۔ اسے ابو ریحان جیسے مخلص اور طالب علموں سے محبت کرنے والے استاد کی عزت بچانا تھی۔ یہ اس کے لیے اپنے مدرسے سے نکالے جانے سے بھی زیادہ ضروری کام تھا۔ اب اسے کسی طرح درشہوار سے چھٹی کی درخواست کرنا تھی۔ ابھی اسے اس گھر میں کام کرتے ہوئے پندرہ دن ہی ہوئے تھے اسے معلوم تھا کہ اسے چھٹی نہیں ملے گی۔ اس کی زیادہ بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے سلمان سمیت گھر کے سب ہی افراد بہت خوش تھے لیکن سلمٰی اس کی موجودگی سے خائف بھی تھی اور اس کے لیے بددعائیں بھی کیا کرتی تھی کہ کسی طرح یہ لڑکا یہاں سے چلا جائے تو اس کی نوکری جو ہر وقت درخت کے سوکھے پتے کی طرح لرزتی رہتی ہے وہ مستحکم ہو جائے۔

حماد جانتا تھا وہ کیسا ہی بہانہ کیوں نہ بنا لے اسے چھٹی ملنا دشوار تھا۔ اس لیے اس نے ایک ترکیب سوچی۔ یہ پوری طرح محفوظ اور اس کی نوکری کی ضمانت دینے والی ترکیب نہیں تھی لیکن اس طرح اتنا ضرور ہو جائے گا یہ جب وہ واپس آئے گا تو اسے یہ نہیں سننا پڑے گا کہ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر کیوں چلا گیا تھا۔ درشہوار کی بجائے اس نے صنوبر سے بات کرنا زیادہ ٹھیک سمجھا۔

اس رات صنوبر پھر اسی بالکونی میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایسا وہ عموماً اسی وقت کرتی تھی جب وہ کسی بھی وجہ سے پریشان ہو یا اداس ہوتی۔ یہ دیکھ کر حماد جو کہ سلمان ابراہیم تھا اسے بڑا دکھ پہنچا اور دل میں پہلی لہر تو یہی اٹھی کہ وہ اپنی صنوبر کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ وہ ضرور کسی بات سے پریشان ہے۔ لیکن اسے کیا پتا صنوبر کو کیا پریشانی ہے ممکن ہے یہ کوئی وقتی بات ہو اور کل صبح تک یہ پریشانی ختم ہو جائے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ہو سکتا ہے کوئی پریشانی ہی نہ ہو اور وہ ایسے ہی بالکونی میں بیٹھی ہوئی ہو۔ سب کچھ سوچ کر بھی اس نے جب صنوبر کی طرف دیکھا تو اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔ اسے لگا وہ صنوبر سے جانے کی اجازت مانگنے کی ہمت خود میں جمع نہیں کر سکے گا۔ لیکن اگر وہ نہیں گیا تو ابو ریحان کو بچانا ممکن نہیں رہے گا۔

اس لیے اس نے اپنے دل کو سمجھایا اور صنوبر کے پاس پہنچا۔

"بی بی جی چائے لاؤں آپ کے لیے؟" اس نے بات بنائی۔

"ارے تم اب تک یہاں ہو۔ میں تو سمجھی اپنے کوارٹر میں جا چکے ہو۔" صنوبر نے اس کی طرف دیکھ کر خوشگواریت سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بس جانے ہی والا تھا۔ آپ کو یہاں بیٹھا دیکھا تو سوچا کہیں آپ کو چائے کی ضرورت نہ ہو؟ اس لیے چلا آیا۔"

"بھئی چائے کی ضرورت ہو نہ ہو لیکن جب تم چائے کی آفر کرتے ہو تو انکار کرنا بھی چاہو تو انکار نہیں ہو پاتا۔" صنوبر بدستور اس سے اسی نرم اور میٹھے لہجے میں بات کر رہی تھی جو اس کی فطرت تھی۔

"اچھا تو پھر میں چائے بنا کر لاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلا گیا۔ اور کچن میں جا کر اس نے جلدی سے چائے بنائی اور صنوبر کے پاس لے کر پہنچا۔ صنوبر نے چائے لے کر اس سے کہا۔

"اب تم جاؤ برتن میں خود رکھ دوں گی"

"نہیں بی بی جی! اول تو مجھے کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ میں اپنے کوارٹر میں چلا بھی جاؤں تب بھی مجھے جلدی نیند نہیں آتی تو میں برتن رکھ کر ہی چلا جاؤں گا۔"

"ایسا کیوں کہتے ہو۔ سارا دن کام کرتے ہو تھک جاتے ہو گے اور تھکن سے نیند فوراً آ جاتی ہے" صنوبر نے چائے کا کپ اٹھایا اور ایک سپ لینے کے بعد کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر شاید ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ میں اپنے والدین سے دور ہوں۔ ان کی یاد مجھے سونے نہیں دیتی اور پھر میں اپنے کوارٹر میں اکیلا بھی ہوتا ہوں تو کبھی کبھی یادوں کا میلہ اکیلے آدمی کو بھی اکیلا نہیں رہنے دیتا۔" صنوبر نے تحمل سے اس کی بات سنی اور بولی۔

"کہاں سے سیکھتے ہو ایسی باتیں۔ تم تو ابھی بہت چھوٹے ہو"

"جی میں کتابیں پڑھتا ہوں۔ ان ہی میں لکھی ہوتی ہیں ایسی باتیں" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"اچھا ارے واہ تمہیں پڑھنے کا شوق ہے یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ویسے بھی یہ تمہارے پڑھنے کی ہی عمر ہے لیکن بدقسمتی سے تم کام میں لگے ہوئے ہو"

"بس بی بی جی غریب آدمی کی یہی مشکل ہے" اس سے پہلے کہ صنوبر اس کی ہمدردی میں کوئی اور بات کہتی اور وہ اصل بات درمیان میں ہی رہ جاتی وہ جلدی سے بولا۔ "بی بی جی آپ سے ایک بات کہنا تھی۔"

"ہاں بولو" صنوبر اس کی گفتگو کی روانی میں بولی۔

"میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا مجھے ایک ہفتے کی چھٹی مل سکتی ہے؟" صنوبر کو اس سے اس وقت ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک دم ہی چونک اٹھی اور فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ سوچ میں چلی گئی۔ یہ ملازموں کا محکمہ اس کی ماما درشہوار کا تھا۔ اور اتنا تو وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ حماد اگر اس کی ماما کے بجائے یہ بات اس سے کہہ رہا ہے تو اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہے کہ اسے یقین ہے اس کی ماں اسے چھٹی نہیں دیں گی کیونکہ ابھی اسے کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جو بات صنوبر کو پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب سے اس نے سلمان سے فارس والی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ وہ اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں رہتا تھا اور اکثر اس کے لیے چھوٹے موٹے مسائل پیدا کرتا تھا۔ حماد کے کاموں سے سلمان بھی خوش تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اب تک بھی حماد کی نہ تو کوئی برائی کی تھی اور نہ ہی اسے کسی بھی بات پر ڈانٹا تھا۔ ورنہ ملازموں کو ڈانٹ پھٹکار کرتے رہنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ کئی مرتبہ کئی ملازم سلمان کی وجہ سے ہی نوکری چھوڑ کر جا چکے تھے۔ سلمٰی سے بھی وہ اسی طرح پیش آیا کرتا تھا لیکن ماما نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر سلمٰی نوکری چھوڑ کر گئی تو اس کے کام گھر میں کوئی اور نہیں کرے گا۔ تب سے وہ سلمٰی کے ساتھ قدرے احتیاط سے پیش آیا

کرتا تھا اس احتیاط کے باوجود وہ سلمیٰ سے ہفتے میں ایک بار تو ضرور الجھ پڑتا تھا۔

''کیا سوچنے لگیں بی بی جی؟'' صنوبر کو سوچتے ہوئے جب کافی دیر ہوگئی تو حماد نے اسے مخاطب کیا وہ سمجھا شاید صنوبر اس کی بات سن کر بھول گئی ہے۔

''سوچ رہی ہوں ماما سے بات کر لیتے تو اچھا ہوتا۔ انھیں بتانا ضروری ہے''

''آپ جانتی ہیں وہ مجھے کبھی جانے کی اجازت نہیں دیں گی لیکن اگر آپ ان سے یہ کہہ دیں گی کہ آپ نے مجھے اجازت دی ہے تو وہ آپ کی بات کا برا نہیں مانیں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں خود نہیں چاہتی کہ ان کے کاموں میں مداخلت کروں۔ ان سے اجازت لے لوں تم پھر چلے جانا۔'' صنوبر کو یہی ٹھیک لگا وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسے وقت میں جب شرجیل اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجنے والا تھا تو وہ اپنی ماما کی حمایت سے کسی بھی وجہ سے محروم ہو جائے وہ انھیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی بی بی جی'' حماد نے مردنی سے کہا تو صنوبر کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ چائے کا کپ لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ اتنی سی دیر میں صنوبر نے پتا نہیں کیا کیا سوچ لیا۔ اس نے سوچا کہ کہیں اس کی ماں بہت زیادہ بیمار ہوئی اور اسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو یہ بچہ اسے ساری زندگی ایسی نظروں سے دیکھتا رہے گا جیسے وہ اس کی ماں کی قاتل ہے۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر داخلی دروازے سے جانے لگا تو صنوبر نے اسے آواز دی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ تم یا تو ابھی چلے جاؤ یا پھر صبح جب ماما بیدار ہوں تو اس سے پہلے انھیں نظر مت آنا۔ وہ پوچھیں گی تو میں کہہ دوں گی۔ اس کا گھر سے فون آ گیا تھا ایمرجنسی تھی اس لیے وہ رات کو ہی چلا گیا تھا۔''

حماد اس کی بات سن ایک دم خوش ہو گیا اور صنوبر کے دل و دماغ کی ذہانت کا قائل بھی ہو گیا جس نے اتنی اچھی ترکیب اس کی مدد کرنے کے لیے نکالی تھی۔

''لیکن تم شاید اس طرح جا نہیں سکو گے یہی سوچ رہے ہو نا؟'' صنوبر کو لگا اس کے لیے ایسے اوقات میں جانا ممکن نہیں ہوگا جب کوئی سواری آسانی سے نہیں ملتی۔ اسے سوچتے ہوئے اس نے کہا۔

''نہیں بی بی جی میں چلا جاؤں گا' اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں تو آپ کی ہمدردی اور انسان دوستی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ آپ کا دل واقعی بہت اچھا ہے۔''

''اگر تمھیں کوئی پریشانی ہو تو میں تمھیں گاڑی میں چھوڑ آتی ہوں اسٹیشن تک۔ بس ایک خطرہ ہے ماما اگر جاگ گئیں تو وہ پھر تم جانتے ہو کیا کریں گی۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

''ارے نہیں بی بی جی! آپ نے میرے لیے اتنا کیا ہے باقی میں خود کر لوں گا۔ آپ پریشانی نہ اٹھائیں۔'' اس کے لہجے میں تشکر اور محبت کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلا گیا۔

صنوبر کو کیا پتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کے لیے سواری کا کوئی مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں وہ تو پلک جھپکتے میں جہاں چاہے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ حماد نے اس کے بعد دیر نہیں کی اور وہ اسی وقت وہاں سے مدرسے جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

صنوبر کچھ دیر تک بالکونی سے اسے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر دور تک دیکھتی رہی اور جب حماد اسے نظر نہیں آیا تو اس نے سوچا وہ ضرور صبح سویرے جائے گا۔ رات میں جانے کا اس میں شاید حوصلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھر سے اپنی سوچوں میں ڈوب گئی اور سوچتے سوچتے اسے اچانک خیال آیا کہ خدانخواستہ اگر اس کی صبح آنکھ نہ کھلی تو وہ جا نہیں سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھ کر جانے والی تھی کہ اسے کہے کہ وہ صبح جاگنے کے لیے اس سے الارم والی گھڑی لے لے۔ یا پھر وہ کسی طرح اپنا موبائل اسے دے دے۔ تاکہ اس کی آنکھ کھل سکے۔ وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ اس کے پاس موبائل ہے جو اسے آصف کریم نے لا کر دیا تھا تاکہ کبھی انھیں درشہوار کے بارے میں کوئی معلومات کرنی ہو تو وہ اس سے پوچھ لیا کریں اور ابھی تک یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ ویسے بھی آصف کریم کو ایسی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ اب تک تو انھوں نے اسے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ صنوبر ڈرتے ڈرتے اس کے کوارٹر تک پہنچی اور

ہلکے سے اس کا دروازہ بجایا لیکن اندر سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سمجھی شاید سو گیا ہے لیکن وہ تو کہہ رہا تھا اسے جلدی نیند نہیں آتی۔ یہی سوچ کر صنوبر نے پھر دروازہ بجایا اور جب اس نے کئی دستکوں کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا تو اس نے ہلکے سے دروازے کو دھکا دیا دروازہ اندر کی طرف کچھ آواز کر کے کھلتا چلا گیا۔ وہ دھیرے سے اندر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا بستر خالی تھا۔

''ہیں تو کیا وہ اسی وقت چلا گیا۔ چلو اچھا ہوا۔ لیکن وہ گیا کہاں سے؟ اسے تو نظر ہی نہیں آیا ایسی کئی باتیں سوچنے کے بعد وہ اس اطمینان کے ساتھ وہاں سے لوٹ آئی کہ چلو اچھا ہوا جو اس نے صبح کا نتظا نہیں پالا پتا نہیں صبح کسی بھی وجہ سے اس کی آنکھ نہ کھلتی تو بڑا ہی مسئلہ ہو جاتا۔

☆......☆......☆

صبح اس کی آنکھ سلمان کے اونچی اونچی باتیں کرنے سے کھلی وہ اپنی ماں کے سامنے چیخ رہا تھا لیکن اس کا مخاطب حماد ہی تھا۔ وہ سمجھ گئی سلمان کو حماد سے کوئی ضروری کام ہے اور وہ موجود نہیں ہے۔ ایسے حالات میں وہ اکثر اپنے کاموں کے لیے صنوبر سے کہہ دیا کرتا تھا لیکن اب وہ صنوبر سے کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہا تھا کیونکہ صنوبر خود بھی اس سے بات نہیں کر رہی تھی۔

وہ اٹھ کر لاؤنج میں آئی تو اس نے سلمان کو غصے سے جھنجھلاتے ہوئے دیکھا۔ قریب ہی اس کی ماں پریشان چہرہ لیے کرسی پر براجمان تھیں، وہ اپنی ماں کے پاس پہنچی۔

''کیا بات ہے ماما یہ سلمان کیوں چیخ رہا ہے؟'' گڈ مارننگ کے بعد صنوبر نے پوچھا۔

''چیخنا دھاڑنا تو اس کا کام ہے لیکن اس وقت وہ حماد کے نہ ہونے پر چیخ رہا ہے۔ اسے کہیں جلدی جانا ہے۔ شاید اپنے کسی دوست کے ساتھ پکنک وغیرہ پر جا رہا ہے۔ اور بہت سے کام تھے جو اسے حماد سے کروانے تھے۔ وہ ہے نہیں تو اس کا پارہ ہائی ہو رہا ہے۔'' درشہوار نے کہا اور پھر بولی۔

''پتا نہیں اتنی صبح یہ لڑکا کہاں چلا گیا۔ زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ چوکیدار کہتا ہے کہ اس نے تو حماد کو جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ اندر سے مین گیٹ بھی بند ہے اور حماد گھر میں اپنے کوارٹر میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ سلمان نے اپنے کاموں کی وجہ سے اسے سب ہی جگہوں پر۔ حتیٰ کے ٹیرس اور اسٹور روم ہر جگہ تلاش کر لیا ہے۔ وہ ہوتا تو ملتا۔ مجھے تو لگتا ہے وہ رات کے اندھیرے میں دیوار پھاند کر بھاگ گیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے اس نے چوری کی ہے؟'' صنوبر نے کہا۔

''اس طرح چوروں کی طرح چلے جانے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ ورنہ وہ دروازے سے جاتا تو چوکیدار کو ضرور پتا ہوتا۔''

درشہوار نے یقین سے کہا۔ صنوبر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ اگر واقعی ایسا تھا کہ وہ دیوار پھاند کر گیا ہے تو پھر تو یہ بہت غلط بات ہے۔ اب اگر ایسے میں وہ اپنی ماں کو یہ بات بتاتی ہے کہ وہ اس سے چھٹی لے کر اپنی ماں سے ملنے گیا ہے تو پھر ایک اور ہنگامہ پیدا ہو جائے گا کہ اگر ایسا تھا تو وہ چوروں کی طرح دیوار پھاند کر کیوں گیا۔ صنوبر سمجھ گئی کہ ایسا اس نے کیوں کیا تھا۔ وہ شاید ڈر گیا تھا کہ اگر اس نے چوکیدار کے سامنے سے جانے کی کوشش کی تو کہیں چوکیدار اپنی وفاداری میں بیگم صاحبہ اور صاحب کو ابھی کے ابھی نہ بتا دے۔ صنوبر کے پاس ان حالات میں چپ رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا اس نے سوچا ابھی تو سلمان بھی ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔ وہ یہ بات بعد میں اطمینان سے اپنی ماں کو سمجھا دے گی۔ حالانکہ ایک بات وہ اپنے دل و دماغ میں محسوس کر رہی تھی کہ اب اسے پھر سے اس گھر میں ملازم رکھوانا کافی مشکل ہوگا۔ سلمان تو اس کی بہت ہی مخالفت کرے گا۔ سلمان جس کی مخالفت کرے ایسے ملازم کو رکھ بھی لیا جائے تو اس کا گھر میں رہنا کس قدر دشوار ہوتا ہے یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

''کیا آپ نے چیک کر لیا ہے۔ اس نے واقعی کوئی چوری تو نہیں کی؟'' صنوبر کو کامل یقین تھا کہ حماد ایسا نہیں کر سکتا تھا

پھر بھی اس نے اپنی ماں کی تسلی کے لیے یہ بات کہی۔

''ابھی تمہارے پاپا سو رہے ہیں وہ رات کو دیر سے سوئے تھے کسی دفتر کے کام میں بزی تھے۔ اس لیے میں کسی قسم کی چیکنگ کا آغاز نہیں کرنا چاہتی جس سے وہ جاگ جائیں۔ جاگ گئے تو یہ گھر کوئی کھولتا ہوا آتش فشاں بن جائے گا جہاں سلمان پہلے ہی بات بات پر بھڑک رہا ہے اسے حماد کے اس طرح غائب ہونے پر بہت غصہ ہے۔ میرے خیال سے اس کے کمرے کی اور اس کی خود کی سب چیزیں محفوظ ہیں نہیں تو اب تک آسمان سر پہ اٹھا لیتا اور حماد پر کتنے ہی الزام لگا چکا ہوتا۔'' درشہوار نے ناگواریت سے کہا۔ اسے شاید حماد کے اس طرح گھر سے چلے جانے سے بھی زیادہ غصہ اس بات پر آرہا تھا کہ سلمان نے صبح ہی صبح ہنگامہ کیوں مچایا ہوا ہے۔ ''شکر کرو کہ سلمان کا کمرا نیچے اور تمہارے پاپا کا اوپر ہے' ورنہ اب تک وہ اس بدتمیز لڑکے کو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال چکے ہوتے۔'' درشہوار نے دانت کچکچا کر یہ بات کہی۔

''چلیں چھوڑیں! آپ کیوں صبح صبح اپنا موڈ خراب کرتی ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں'' صنوبر نے کہا تو درشہوار کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''ہائے اب اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی اتنی اچھی چائے سے بھی ہم محروم ہو جائیں گے۔'' درشہوار نے جس طرح سے یہ بات کہی تھی صنوبر کو اس تناؤ بھرے ماحول میں بھی ہنسی آگئی اور وہ ہنستی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

مدرسے پہنچ کر سلمان سب سے پہلے ابوریحان سے ہی ملا۔ اور یہ دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا کہ ابوریحان اپنا سامان پیک کر کے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے۔

''آؤ سلمان۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے دو بار تمہیں دیکھنے کے لیے لڑکا بھیجا تھا، میں تو سمجھا تم نگراں کے خوف سے نکالے جانے سے پہلے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔''

''ارے استاد کیا آپ نے مجھے اتنا بزدل سمجھا ہوا ہے۔ میں اس طرح جانے والا نہیں ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ رکا اور پھر سامان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''البتہ آپ ضرور جانے کی پوری تیاری کر چکے ہیں۔''

''ارے یار عزت دار کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔ تمہیں تو پتا ہے نگراں کے بارے میں۔ تمہیں نکالنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی یہاں رہنے نہیں دے گا کیونکہ تمہارے معاملے میں' میں نے اس کی بجائے تمہاری طرف داری کی ہے اور اس بات کا مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' ابوریحان کی بات سن کر سلمان کو فوری طور پر جو غصہ آیا اسے تو وہ پی گیا اور بولا۔

''یہ عزت والی بات میرے کچھ پلے نہیں پڑی استاد محترم؟'' سلمان نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں یا تم جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو۔ اگر معلوم نہیں ہے تو یہ بڑی اچھی بات ہے کیونکہ ایسی بات نہ ہی معلوم ہو تو اچھا ہے۔ لیکن یہ اس مدرسے کا اور یہاں کے نگراں کا بہت ہی پرانا حربہ ہے۔ جب بھی کسی لڑکے کو یا استاد کو نکالنا ہوتا ہے تو ان پر الزام لگا دیتے ہیں جو بہت ہی معیوب بات ہے۔ کوئی بھی عزت دار انسان اسے چیلنج نہیں کرتا کیونکہ چیلنج کرنے کا مطلب...... اس لیے کوئی بھی انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے یہاں سے چلا جائے۔ مدرسے کے بورڈ کے جو ٹرسٹی ہیں' وہ اس قسم کے معاملے میں چھان بین کرنے اور اصل بات تک پہنچنے کے جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتے اور یوں ہمیشہ ہی معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی استاد اِس نگراں سے پنگا لینے کا سوچتا بھی نہیں ہے۔''

ابوریحان نے اسے ساری بات تفصیل سے بتانا ہی ضروری سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے سلمان کو ساری بات نہ بتائی تو وہ اتنے سوال کرے گا کہ انھیں بتاتے ہی بنے گی۔ ویسے انھیں اس کی سوال کرنے کی عادت پسند تھی۔ اس طرح خود ان کا اپنا علم بھی تازہ ہوتا رہتا تھا۔ سلمان ان کی بات سن کر جیسے چپ سا ہو گیا۔ حالانکہ ابوریحان یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ کم سے کم اتنا تو ضرور کہے گا کہ یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے اس ناانصافی کو روکنا چاہیے ورنہ نگراں کے ظلم کا تو لوگ شکار

ہوتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ وہ سلمان کی عادت سے واقف تھے۔ بڑی مختلف اور انقلابی باتیں کیا کرتا تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' ابوریحان نے براہ راست پوچھا۔

''وہ ہی جو آپ سمجھ رہے ہیں'' سلمان نے گہری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ انھیں سلمان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔

''تو کیا تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟'' ابوریحان نے آواز نیچی رکھتے ہوئے تقریباً سرگوشی میں کہا۔

''وہ ہی سوچ رہا ہوں'' سلمان کا جواب کافی مختصر تھا۔

''کیا مجھے بتاؤ گے کہ تم کیا کرو گے؟''

''ابھی سوچ رہا ہوں۔ کوئی راستا سجھائی نہیں دے رہا۔ جیسے ہی کوئی سدباب دکھائی دیتا ہے تو آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کچھ دیر بالکل خاموش رہیے۔''

سلمان نے جیسے ہی یہ بات کہی ابوریحان اس کی روحانیت کے رعب میں آگئے اور سمٹ کر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف توجہ سے دیکھنے لگے۔ وہ جان چکے تھے کہ سلمان اپنی انہی خفیہ طاقتوں کو کھوج رہا ہے جنھوں نے اس کی ایگزام روم میں مدد کی تھی اور ایسے سوالوں کے جواب بھی اسے بتا دیے تھے جو اس نے پڑھے بھی نہیں تھے۔ کمرے میں ایک سکوت سا طاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کوئی موجود نہ ہو سلمان کو تو اپنی سانسوں پر بھی اختیار تھا لیکن ابوریحان کے سانسوں کی آواز اس وقت اور گہری ہو جاتی جب وہ کچھ دیر تک اپنا سانس روکنے کے بعد اسے سینے سے خارج کرتے۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر یہ پرحول سناٹا طاری رہا پھر سلمان نے ایسی مسمیرائز آواز میں کہا جیسے وہ سلمان نہیں بلکہ اس کے اندر کوئی اور بول رہا ہو۔

''نگراں بدعنوان ہے۔ اس کی خفیہ الماری میں اس کی بدعنوانی کا ثبوت موجود ہے۔ تمہیں وہاں سے وہ ثبوت لا کر بورڈ کے ممبران کو دکھانا ہوگا۔ ایسا کرنے سے نگراں کی ہمیشہ کے لیے یہاں سے چھٹی ہو جائے گی۔''

پوری بات کرنے کے بعد سلمان ایک زور کے جھٹکے سے زمین بوس ہو گیا۔ ابوریحان پر خوف اور ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ پہلے تو سلمان کی طرف لپکے کہ اس کی کوئی مدد کر سکیں لیکن پھر انھوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ لیکن یہ بات وہ ہی جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے ہاتھ روکے نہیں تھے بلکہ کسی غیر مرئی طاقت نے ان کے ہاتھوں کو سلمان تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا اور انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ طاقت تھی جس نے ان کے ہاتھوں کو پکڑ کر واپس اسی جگہ پر کر دیا تھا۔ جہاں سے وہ آگے بڑھے تھے۔ یہ محسوس کرنے کے بعد خوف کا پسینہ ان کے بن مو سے پھوٹ نکلا اور وہ کھلی آنکھوں سے ایسے سلمان کو بے ہوش پڑا ہوا دیکھتے رہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہوں۔

سلمان پر یہ کیفیت کافی دیر تک قائم رہی اور ابوریحان تو جیسے ہمواریت سے سانس لینا تک بھول چکے تھے۔ انھوں نے سلمان کو ایسے ہی دھیرے سے زمین سے سر اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی تازہ تازہ نیند سے جاگا ہو۔ سلمان پوری طرح ہوش میں آگیا اس کے بعد بھی ابوریحان کو اس سے کلام کرنے کی جسارت نہیں ہوئی۔ سلمان نے خود ہی پوچھا۔

''کیا استاد محترم...... میں......'' وہ جیسے بات پوری نہیں کر سکا۔ اور ابوریحان کو ہوش آگیا۔

انھوں نے بمشکل ساری بات سلمان کو بتائی تو سلمان خوشی سے بولا۔

''سمجھیں کام بن گیا''

''کیا......؟''

''میں نے وہ خفیہ الماری دیکھی ہے'' سلمان نے امید بھری آواز میں کہا' جس میں خوشی کی کھنک بھی صاف سنی جا سکتی تھی۔

''کہاں ہے وہ خفیہ الماری؟'' ابوریحان اب بھی ڈرے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

"نگراں کے حجرے میں۔ اور کہاں!" سلمان نے ایسی سادگی سے کہا کہ ابوریحان کو کافی حیرت ہوئی۔

"تم ان کے حجرے میں کب گئے تھے۔ وہاں تو وہ اپنے خاص دوستوں کو بھی نہیں بلاتے" ابوریحان کی بات ٹھیک تھی سلمان نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"استاد جی میں ان کے حجرے میں کبھی نہیں گیا لیکن اب جاؤں گا تا کہ وہ الماری کھول کر وہ ثبوت لاسکوں جو ان کی بدعنوانی کے ہیں اور جن کو دکھا کر ہم اپنی حفاظت اور ان کو یہاں سے چلتا کر سکتے ہیں"

"بنا جانے کہ وہ الماری کہاں کس مقام پر ہے اگر ان کے حجرے میں گئے تو پکڑے جانے کا اندیشہ کہیں زیادہ ہوگا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ نگراں اپنے حجرے میں جب نہیں ہوتا تو اس میں تالا لگا ہوتا ہے۔ تم یہ تالا کیسے کھولو گے۔" ابوریحان جیسے یقین کر لینا چاہتے تھے کہ واقعی ان کی نوکری بچنے کے امکانات ہو چکے ہیں اور اب انھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

"آپ بےفکر ہو جائیں۔ میں ابھی جب بے ہوش ہوا تھا تو مجھے وہ الماری اور اس کا مقام دکھا دیا گیا ہے۔ رہی بات تالا کھولنے کی تو وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں میں کر لوں گا۔ آپ بس مطمئن رہیں۔ اب ہمیں یہاں سے کوئی نہیں نکال سکے گا۔" اتنا کہہ کر سلمان ان کے حجرے سے جانے لگا اور جاتے جاتے رک کر بولا۔

"میں رات کو آؤں گا" ابوریحان نے ایسے گردن ہلائی جیسے انھیں اپنی گردن ہلانے کے لیے بھی کسی ایسی طاقت نے مجبور کیا تھا جو سلمان کی مدد کر رہی ہے۔

☆......☆......☆

کمرے میں سرفراز ملک اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی مسئلے میں الجھے ہوئے تھے اور یہ مسئلہ بزنس اور سیاست کی کوئی چال تھی جسے وہ دونوں آپس میں گفت وشنید کر کے سمجھ رہے تھے۔ کمرے کے باہر شرجیل اپنے گھر کے کپڑوں میں ٹراؤزر اور اورنج رنگ کی ٹی شرٹ میں بے چینی سے ان کی ملاقات کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھے اور ان دونوں کی موجودگی میں ہی جا کر اپنے مطلب کی بات اپنے ڈیڈی سرفراز ملک سے کہہ دے۔ اس کے مطلب کی بات ہی اس کے دل کی بات بھی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنی ماما سے کہوں گا اور وہ ڈیڈی کو بتا دیں گی لیکن اسے کیا پتا تھا کہ یہ فارس والی آفت اسی وقت ٹوٹے گی جب اس کی ممی امریکا میں ہوں گی۔ وہ ایک مہینے سے بھی زیادہ وقت کے لیے امریکا اپنے کسی علاج کے لیے گئی ہوئی تھیں جہاں شرجیل کی خالہ ان کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔ شرجیل نے اس بارے میں بھی سوچا تھا کہ اگر اس نے اپنے ڈیڈی سے صنوبر کے گھر چلنے اور اس کے والدین سے رشتے کی بات کرنے کی بات کی تو اسے یقین تھا کہ اس کے ڈیڈی لازمی یہی کہیں گے کہ پہلے اپنی ممی کو آ جانے دو پھر چلیں گے۔ اس کے بعد بھی اسے لگا کہ اگر اس نے دیر کی تو کہیں فارس کوئی ایسا قدم نہ اٹھا لے جس کے بعد اسے ہاتھ ملنے پڑیں۔ اس لیے وہ اپنے باپ سے جسٹ فار ٹرائی یہ بات کرنے کے لیے ان کے کمرے کے باہر موجود تھا۔

اس کا نوکر اس کے باپ اور دوست کو کئی بار چائے اور دیگر لوازمات سرو کر چکا تھا اور ہر بار وہ اس سے بھی ضرور پوچھتا تھا۔ پہلے جب وہ یونہی انتظار کر رہا تھا تو اس نے سمجھا تھا کہ دوست کے چلے جانے میں کوئی زیادہ وقت نہیں ہے لیکن جب یہ دوست شیطان کی آنت بنتا چلا گیا تو شرجیل کو ایک کتاب پکڑ کر بیٹھنا پڑا' کتاب دلچسپ تھی پھر بھی اس کا دل اس میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک بار وہ نوکر کے اصرار پر چائے بھی پی چکا تھا۔ اس لیے اب اسے الجھن ہو رہی تھی لیکن شرجیل اپنی فطرت میں دھیرج والا انسان تھا اس لیے صبر سے انتظار کرتے رہنا ہی اسے صحیح معلوم ہوا۔

اللہ اللہ کر کے اس کے ڈیڈی کے دوست رخصت ہوئے اور جب وہ کمرے سے باہر اپنے دوست کو رخصت کرنے کے لیے باہر آئے تو شرجیل کو اس طرح کمرے کے باہر بیٹھا دیکھ کر چونکے۔ شرجیل نے ان کے دوست سے سلام کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے ڈیڈی کے سامنے ان کے کمرے میں موجود تھا۔

"کب سے باہر بیٹھے ہوئے تھے؟" اس کے والد نے پوچھا۔

"یہی کوئی ڈیڑھ گھنٹے سے" شرجیل نے آہستہ سے کہا۔

"پھر تو ضرور کوئی ایمرجنسی ہی ہوگی۔ نوکر سے کہلوا دیتے یا خود آ جاتے!" انھوں نے فکر سے کہا۔

"آپ کو یہ دونوں باتیں پسند نہیں ہیں اس لیے" شرجیل نے جیسے چوٹ کی۔

"وہ ٹھیک ہے لیکن عام حالات میں اور غیر معمولی حالات میں فرق ہوتا ہے۔ اچھا چھوڑو بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ سیدھے مقصد پر آتے ہوئے جلدی سے بولے۔

"میں.... چاہتا ہوں... آپ صنوبر کے گھر جا کر میرے رشتے کی بات کریں!" شرجیل نے بڑی حد تک لحاظ اور مشرق کی روایات کے مطابق' جن میں ماں باپ سے ایسی بات کرتے ہوئے ایک جھجک ہوتی ہے۔ کا خیال کرتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ........ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے.... یہ کوئی ایمرجنسی والی بات ہے... ایسی باتیں تو اطمینان سے کرنے کی ہوتی ہیں"

وہ چیخ ہی تو پڑے۔

"میں اگر اس طرح آپ کے کمرے کے باہر ڈیڑھ گھنٹے سے بیٹھا ہوا ہوں تو آپ کو سمجھنا چاہیے ضرور کوئی ایمرجنسی ہی ہوگی!" شرجیل نے غصے کو دباتے ہوئے مصمم انداز اختیار کیا۔

"کیا کیا ایمرجنسی ہے.. ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟" وہ کچھ دھیمے ہوئے۔

"اگر دو ایک دن میں آپ نے رشتے کی بات نہیں کی تو اس کا رشتا کسی اور کو دے دیا جائے گا"

"وہاٹ ربش.... کیا مڈل کلاسیوں کی طرح کی بات کر رہے ہو۔ ہماری کلاس میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیا صنوبر یہی نام ہے نا اس لڑکی کا وہ تم سے کمیٹڈ نہیں ہے؟ اور اگر وہ تم سے کمیٹڈ نہیں ہے تو پھر ایسی لڑکی کا رشتا مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تمہیں بعد میں بھی دھوکا دے سکتی ہے"

"مجھے آپ کی یہ باتیں نہیں سننی... آپ یہ بتائیے آپ رشتا مانگنے جائیں گے یا نہیں؟" شرجیل کی آنکھوں میں پہلی بار انھوں نے ایک ایسا غصہ اور بے قراری دیکھی کہ وہ ایک دم ہی جیسے اپنا سارا استغنا بھول کر اس کے لہجے اور رویے پر غور کرنے لگے۔

"ایسی کیا بات ہے.... مجھے لگتا ہے کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو!" سرفراز ملک کو اپنا بیٹا کسی بڑی مصیبت میں مبتلا نظر آیا۔

"آپ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے' جائیں گے یا نہیں؟" وہ چیخ ہی تو پڑا۔ سرفراز ملک کی حیرت کی جیسے انتہا ہی نہیں رہی۔ ان کا بیٹا ان سے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ انھیں ایک دم ہی طیش آ گیا۔

"نہیں..... بس یہی سننا چاہتے تھے۔" وہ جیسے ضد پر اتر آئے۔

"تو پھر سن لیجیے میں صنوبر کے ساتھ کورٹ میرج کر لوں گا" شرجیل کی بات میں انھیں ایسی سچائی نظر آئی کہ وہ اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے اور انھیں لگا زمین ان کے پیروں کے نیچے سے کھسک رہی ہے۔

☆......☆......☆

رات کے اندھیرے میں نگراں کو کمرے کے باہر کوئی کھٹکا سا محسوس ہوا۔ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کون ہے؟" کمرے کے باہر پہرا دیتے ہوئے ابوریحان کو یقین ہو گیا کہ سلمان اب ضرور پھنس جائے گا۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہِ مارچ میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیزانِ من!

اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اچھے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور برے کاموں سے محفوظ رکھے۔

میں نصیحت کروں گا کہ جس قدر ممکن ہو ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کا بہت ورد کریں۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔ اور کوشش کریں کہ امداد سفید پوش خاندانوں کی کریں۔ اللہ کے نبی ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ ''جو ہاتھ نہ پھیلا سکے اس کی پہلے امداد کرو۔'' جب انسان کسی دوسرے انسان کی ضرورت پوری کرتا ہے تب اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اپنے اس بندے کی تمام ضروریات پوری فرماتا ہے۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ ہمیں کارآمد بنائے اور ہم اپنی اس ایک زندگی میں اتنی نیکیاں کمالیں کہ روزِ حشر ہمارا نامہ اعمال ہمارے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے۔

اپنے بچوں کو بھی بتائیں کہ ایک دوسرے کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھو، جھوٹ سے بچو اور اپنے آپ کو بھی پاک صاف رکھو اور اردگرد کو بھی...... جب بدن پاک صاف ہوتا ہے تب روح بھی پاکیزہ رہتی ہے اور روح کی پاکیزگی سارے ماحول کو پاک رکھتی ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔

☐ شازیہ۔ گجرات

○ پیارے بابا جی اسلام علیکم! بابا جی اس سے پہلے بھی آپ کو دو خط لکھ چکی ہوں آپ نے جواب نہیں دیے۔ بابا جی مسئلہ میرے بھائی کا ہے۔ بابا جی میرے بھائی کی عمر 36 سال ہے والدین فوت ہوچکے ہیں۔ لیکن بابا جی پتا نہیں بھائی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ نہ وہ کماتا ہے اور نہ ہی قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی۔ میرے بھائی کی تاریخ پیدائش 12 ربیع الاول کے دن ہوئی تھی۔ بابا جی جب امی زندہ تھیں تب میرا بھائی امی کا بھی نافرمان تھا، لڑتا تھا کبھی کبھی امی کو مارتا بھی تھا۔ امی کو فوت ہوئے 12 سال ہوگئے ہیں۔ اس نے 12 سالوں میں نہ کچھ کمایا ہے۔ اور نہ ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ کبھی کبھی بہنوں کے ساتھ بھی لڑتا ہے۔ ہم پانچ بہنیں ہیں ایک ہی بھائی ہے۔ ساری بہنیں شادی شدہ ہیں۔ جس بہن کے گھر جائے بہنوئی منہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں آگیا ہے کھانا کھانے کے لیے کماتا ہے نہیں۔ بابا جی ہم سے یہ کچھ نہیں دیکھا جاتا، دکھ ہوتا ہے۔ بابا جی بھائی کہتا ہے میں جہاں بھی کمانے جاتا ہوں کچھ چیزیں میرے آگے آجاتی ہیں۔ وہ مجھے کمانے نہیں دیتیں۔ لوگ کہتے ہیں اس پر تعویذ ہے کوئی کہتا ہے ماں کی بددعا ہے کوئی کہتا ہے اوپری مخلوق کی کارستانی ہے اور کوئی کہتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہے یہ ڈرامے کرتا ہے۔ بس نفسیاتی مریض ہے۔ تاکہ اسے کمانا نہ پڑے۔ بابا جی جب امی زندہ تھیں تو میری امی نے اپنی بہن کو میری بہن کا رشتہ دیا اور میرے بھائی کے لیے رشتہ ان کی بیٹی کا مانگا تھا۔ میری خالہ نے اپنے بیٹے کا بیاہ میری بہن سے کروالیا ہے۔ آج ان کے چار بچے ہیں۔ لیکن اپنی بیٹی کا رشتہ میرے بھائی کو نہیں دیا تھا۔ جس سے میرا بھائی پیار بھی کرتا تھا وہ میری کزن یعنی بھائی کی منگیتر بھی بھائی سے پیار کرتی تھی۔ اس کی شادی غیروں میں کردی ہے آج اس کے تین بچے ہیں۔ لیکن میرا بھائی اسے نہیں

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II 88-C۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

بھول سکا۔ آج بھی اس کے ذہن میں وہی رہتی ہے۔ اس رشتے نہ ہونے کے سبب میرا بھائی میری امی کا نافرمان ہوگیا تھا۔ میری امی کے فوت ہونے کے بعد میری خالہ نے میری ہونے والی بھابی کا بیاہ اور جگہ کردیا تھا۔ پتا نہیں لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا میری امی اور بھائی کے دل سے ان کے لیے بددعا نہیں نکلی ہوگی۔ خوفِ خدا نہیں لوگوں کے دلوں میں۔ اب بھائی کہتا ہے میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ لیکن بابا جی ہمارا ایک ہی بھائی ہے ہماری بہت خواہش ہے کہ ہماری بھابی ہو ہمارا میکہ گھر ہو۔ میرے بھائی کا گھر بس جائے۔ ان کے بچے ہوں اور میرا بھائی دل لگا کر کوئی روزگار کرے۔ پلیز بابا جی آپ اس مسئلے کو نظر انداز مت کیجیے گا۔ اس خط کا جواب ضرور دیں اور کوئی جلالی وظیفہ دیں تاکہ میرا بھائی ٹھیک ہوجائے اور نارمل زندگی گزارے اور اس کی شادی ہوجائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی شازیہ! تم نے تو اپنے خط میں ہی بتادیا ہے کہ بھائی ناکام کیوں ہے۔ بیٹی ماں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والے کے لیے نہ تو دنیا ہے نہ آخرت۔ تم بہن ہو اس لیے تمہارا دل دکھتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک تمہارا بھائی سچے دل سے معافی نہیں مانگے گا ایسے ہی بے مقصد زندگی گزارے گا۔ ماں کو دکھ دینے والا کیسے دنیا میں خوش رہ سکتا ہے۔ اس کا نام بھاری نہیں ہے اس کے کرم بھاری ہیں۔ تم دعا کیا کرو کہ اللہ اس پر رحم فرمائے۔

□ سنبل۔ کراچی

☆ بیٹی سنبل! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی رزق میں برکت کے لیے بعد نماز عشا ایک بار سورۃ واقعہ ضرور پڑھو ترجمہ کے ساتھ۔ اس کے علاوہ جب جب یاد آئے 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' ضرور پڑھا کرو۔ بہن سے کہو اس کو وہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ ایسی صورت حال میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان تنہا رہے، کسی سے کچھ کہنے کا فائدہ نہیں۔ صبح وشام آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر حصار کیا کرے اور جلد از جلد وہاں سے نکل جائے۔ ایک ماہ کے لیے کسی دوست یا جاننے والوں کے ہاں چلی جائے یا پھر اگر پاکستان بلوانا سہل ہے تو بلوا کر اپنے پاس رکھو۔ اسے اس وقت خود ہمت کرنی ہوگی۔ مروت اگر زندگی برباد کردے تو اسے بے وقوفی کہتے ہیں۔ تم جو کچھ پڑھ رہی ہو جاری رکھو۔ انشاءاللہ معاملات بہتر ہوں گے۔

□ عمران۔ کراچی

☆ بیٹے عمران! تمہاری نیت بہت اچھی ہے۔ یقیناً کسی کا سہارا بننا بہت نیکی کا کام ہے مگر بیٹے میں زبردستی کا قائل نہیں۔ بچیوں کے بہت زیادہ حقوق ہیں کیا ہوا جو وہ پریشان ہیں۔ حالات تنگ ہیں کوئی پرسان حال نہیں۔ مگر ایسے میں بھی وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ اگر وہ نوکری کرکے اپنا سہارا خود بننا چاہیں تو میں ایسے میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ ہر انسان کو اپنے حساب سے جینے کا حق ہے۔ حدود اللہ کی پاسداری کرتے ہوئے تم اچھے انسان ہو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔

□ رخسانہ جبیں۔ لاہور

☆ بیٹی رخسانہ! میں بیٹی کو نصیحت کروں گا کہ ابھی شادی کا خیال ترک کردے کچھ عرصے کے لیے۔ بیٹے کو تھوڑا سمجھدار ہونے دے، اپنا کمائے اور کھائے۔ برطانیہ میں ایسے بہت گورے ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ایسے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اسلامک سینٹر اس سلسلے میں بیٹی کی مدد کرے گا۔ تم بیٹے کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ بیٹی حفصہ کے لیے بھی منگوالو۔ یہ مت سوچو کہ شادی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ نیت کرو اچھا خاندان دیکھو بندوبست اللہ کرے گا۔

□ مہوش۔ گجرات

○ پیارے بابا جی، اسلام علیکم! بابا جی اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اسی طرح لوگوں کی پریشانیاں دور کرتے رہیں۔ بابا جی اس سے پہلے بھی میں نے آپ کو دو خط لکھے تھے۔ آپ نے جواب بھی دیے تھے۔ تیسری بار آپ کو تکلیف دے رہی ہوں۔ بے شک بابا جی طوالت کے باعث میرا خط کالم میں شائع نہ کیجیے۔ لیکن اس کا جواب ضرور کالم میں دیجیے۔ بابا جی میں بہت بے بس اور مجبور عورت ہوں۔ میری عمر 27 سال ہے۔ دو بچوں کی ماں ہوں۔ میرے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بابا جی آپ کو ہی ماں اور باپ سمجھتی ہوں کیونکہ دل کی ہر بات خط کے ذریعے آپ کو بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہوں۔ بابا جی ہر لڑکی کے شادی سے پہلے دل میں بہت خواب ہوتے ہیں۔ میری شادی کو چوتھا سال شروع ہوچکا ہے۔ ابھی تک خوشی نام کی کوئی چیز زندگی میں شامل نہیں ہوئی۔ بابا میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میری شادی بڑی بہن نے کی ہے۔ میرے حق مہر کا مکان میرے سسر نے مجھ سے واپس دھوکے سے لکھوالیا ہے۔ اب میں، میرا خاوند اور میرے بچے اپنا شہر چھوڑ کر میرے خاوند کے بڑے بھائی کے گھر رہ رہے ہیں۔ بابا جی میرا خاوند انتہائی بگڑا ہوا شخص ہے۔ بچوں کی ذمہ داری اور کمانے سے دور بھاگتا ہے۔ بات بات پر مجھے کہتا ہے تم مجھ سے آزاد ہوجاؤ یا پھر مرجاؤ میری جان چھوڑو۔ مجھے تم لوگوں کی خاطر خوار ہونا پڑتا ہے۔ بابا جی میں کسی بہن بہنوئی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ ہمیشہ عورت کو ہی جھکنا پڑتا ہے۔ بابا جی میں اب تیسری بار امید سے ہوں۔ میری سب بہنیں حتیٰ کہ میرے سسرال کی رشتے دار عورتیں بھی کہتی ہیں کہ ابھی تم لوگوں کا اپنا گھر بار نہیں ہے۔ دردر زل رہے ہو۔ حالات بہت خراب ہیں۔ تم اپنا ابارشن کروالو۔ بابا جی میں خدا کے خوف سے ڈرتی ہوں۔ لیکن بابا جی ہمارے حالات واقعی بہت خراب ہیں کیونکہ پانچ ماہ ہوگئے ہیں ہمیں جیٹھ کے گھر رہتے ہوئے۔ روٹی وغیرہ کا بوجھ انہوں نے اٹھایا ہوا ہے۔ میرے خاوند کا دل کرے تو مزدوری کرتا ہے اس سے بچوں کا دودھ وغیرہ آتا ہے۔ ورنہ پھر ان کے آسرے پر۔ بابا جی مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہمارا کیا ہوگا۔ بابا جی حمل کی وجہ سے میری طبیعت خراب رہتی ہے۔ اُلٹیاں بہت آتی ہیں اس کے ساتھ اچھی خوراک ہونی چاہیے۔ بابا جی یقین مانیں کمزوری اتنی ہے کہ چلوں تو چکر آتے ہیں۔ کبھی خاوند نے طاقت کا سیرپ بھی لے کر نہیں دیا۔ فروٹ تو دور کی بات ہے۔ کپڑے اپنی بہنوں کے اور دیورانی کے اُترن پہنتی ہوں۔ میں نے تو کبھی اسے اپنے فیشن یا بچوں کی ضروریات کے لیے تنگ نہیں کیا۔ بابا جی کیا ہم پر کسی نے تعویذ یا جادو وغیرہ تو نہیں کروایا؟ بابا جی پلیز میرے لیے خصوصی دعا کروائیں اور کوئی جلالی وظیفہ بتائیں۔ تاکہ میرا گھر بس جائے اور یہ میرا فرماں بردار ہوجائے۔ بابا جی میں اگر نماز پڑھ رہی ہوں سالن وغیرہ چولہے پر ہو تو یہ اتنا لاپرواہ ہے نہ بچوں کو پکڑتا ہے اور اگر کہہ دوں سالن کو دیکھو تو کہتا ہے جلتا ہے تو جل جائے میں کیا کروں۔ بابا جی میرا ذرا سا بھی کہنا نہیں مانتا۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ بابا جی میں نے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس لیے لکھی ہیں۔ کیونکہ یہ ازدواجی زندگی کے لیے بہت بڑی ہیں۔ پلیز بابا جی خط کا جواب ضرور دیجیے۔ بہت بے صبری سے انتظار کروں گی اور بابا جی بچے کا ابارشن کے لیے آپ جو مشورہ دیں گے میں عمل کروں گی۔ تب تک مجھے چار ماہ ہوچکے ہوں گے۔

☆ بیٹی مہوش! تمہیں اللہ ہمت دے، طاقت دے تاکہ تم اپنی اولاد کو اچھے انداز سے پال سکو۔ بیٹی بعد نماز فجر ایک بار سورۃ یسین پڑھو اور دعا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو اور کسی کے بھی کہنے پر گناہ کی مرتکب مت ہونا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ ساحل۔ سندھ

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرے والد زیل پاک سیمنٹ فیکٹری میں ایک معمولی سی نوکری کرتے ہیں اور میں نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔ بہت پریشان ہوں' مہربانی کرکے میری پریشانی کا کوئی حل نکالیں۔ میری پہلی پریشانی ہے کہ میرے والد کا زیل پاک سیمنٹ میں گولڈن شیک ہینڈ کے پیسے رکے ہوئے ہیں اور پیسے دینے سے انکار کررہے ہیں جس کی وجہ سے میرے والد بہت پریشان ہیں۔ میری دوسری پریشانی یہ ہے کہ میرا کام میں بالکل بھی دل نہیں لگتا' اگر کام نہ ملے تو پریشان رہتا ہوں اور اگر کام ملے تو کام نہیں ہوتا ہے۔ بابا جی! میرے لیے دُعا کریں۔ مجھے فوج میں جانے کا بہت شوق ہے لیکن ناکامی سے ڈر لگتا ہے۔

☆ بیٹے ساحل! اپنے والد سے کہو نیت کرلیں کہ رقم وصول ہونے کے بعد کچھ رقم غریبوں میں ضرور تقسیم کریں گے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو بیٹے! ڈرنے والے کچھ نہیں کرپاتے۔ قدم بڑھاؤ گے' تبھی آگے بڑھو گے۔ ناکامی اور کامیابی دونوں زندگی کا حصہ ہیں۔ ناکامی سے گھبرانا نہیں چاہیے اور کامیابی پر آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ نماز پابندی سے اُدا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد

7 تسبیح یَاجَلِیلُ کی ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ سحر۔لاہور

☆ بیٹی سحر! تمہاری منفی سوچ ہی تم کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ انسان زندگی میں اکثر ناکام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جدوجہد اور جستجو کرنا چھوڑ دے۔ تم نے اپنے طور پر یہ طے کرلیا ہے کہ تم ناکام ہی ہوگی اسی لیے ناکام ہی ہورہی ہو۔ ہر گھر میں مسائل ہوتے ہیں اور وہ حل بھی ہوجاتے ہیں۔ تمہارے گھر میں جو مسائل ہیں ان کی ذمے دار تم نہیں لہٰذا اپنے آپ کو سزا مت دو۔ حالات بدلنا چاہتی ہو تو خوب محنت کرو اور سب سے پہلے اپنی سوچ مثبت کرلو۔ جس قدر ممکن ہو پڑھو۔ رَبِّ زِدنی علماً پھر کامیابی کی دُعا کرو۔ یہ وِرد نتیجہ آنے تک جاری رکھو۔

□ نور فاطمہ۔میانوالی

☆ بیٹی نور! ہدیہ لفافے میں مت رکھا کرو۔ ڈاک خانے والے ایسے خطوط ادارے تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ بہرحال مجھ سے تعویذ منگوالو۔ بے شک بندش ہے۔ تفصیل جوابی لفافہ ارسال کرکے معلوم کرلو۔

□ سیف اللہ۔گھوٹکی

☆ بیٹے سیف! اللہ تمہیں خوش رکھے اور مالی مسائل حل فرمائے۔ یاد رکھو زندگی میں جلد بازی اکثر نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ بہرحال نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ خالدہ۔خانیوال

☆ بیٹی خالدہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ رکاوٹ مجھے بھی محسوس ہورہی ہے۔ مناسب ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوالو۔ بیٹی! دوا تیار ہے مگر ڈاک خانے والے دوا ارسال کرنے کو تیار نہیں۔ بقول ان کے پالیسی نہیں ہے۔ تم دوا ''سچی کہانیاں'' کے دفتر سے منگوالو۔ طریقۂ استعمال دوا کے ساتھ دے دیا جائے گا۔

□ عندلیب۔گوجرہ

☆ بیٹی عندلیب! تمہیں سب نے ایسا اس لیے کہا کہ قصور تمہارا نہیں ہے' تم ایک بہت اچھی ماں' بیوی اور بیٹی ہو مگر کیا کیا جائے' اگر دوسرا شخص ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو؟ احساسِ کمتری میں مبتلا مرد ہو یا عورت' وہ زندگی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں' یہ کہنا بہت سہل ہے مگر بیٹی! بعض اوقات مشکل راستے پر چل کر ہی انسان کامیاب ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو گھر' بچوں اور اپنی ذمے داریوں میں مشغول کرلو۔ رونا بالکل ترک کردو' ہاں' جب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو تو خوب دل کی بھڑاس آنسوؤں کی صورت میں نکال لیا کرو۔

□ عالیہ۔سکھر

☆ بیٹی عالیہ! اللہ تمہارے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ بیٹی! نیک ہستیاں نہ تو رقم لیتی ہیں اور نہ ہی کچھ کھاتی ہیں جیسا کہ تم سمجھ رہی ہو۔ بہرحال یہ بھی مانگنے کا ایک طریقہ ہے۔ ظاہر ہے' قبرستان میں لوگ اپنے پیاروں سے ملنے ہی آتے ہیں۔ دل دکھے ہوئے ہوتے ہیں اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز' ایسے میں اکثر لوگ منہ سے مانگنے کی بجائے خاموشی سے ہی ساتھ چلتے ہیں۔ تم نے جو کچھ کیا' وہ درست کیا۔ دل میں کوئی وہم مت پالو۔ اللہ تمہارے بیٹے کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین!)

□ رزّاق۔کراچی

☆ بیٹے رزّاق! اللہ تمہیں قرض جیسی لعنت سے نجات دلائے۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ وِرد جاری رکھو اور کسی کو برا کہنے کی بجائے معاملات میں خاموشی رکھو۔ مجھے 2 ماہ بعد مطلع کرو۔

□ رضیہ۔ملتان

☆ بیٹی رضیہ! تم مجھے اپنا مسئلہ تفصیل سے لکھو' تمہارا خط بہت مبہم ہے' وضاحت کے ساتھ لکھو تاکہ مسئلہ سمجھ میں آسکے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں' تم اپنے والد کے رویے سے ناراض ہو۔ بیٹی! باپ کا درجہ بہت بڑا ہے۔ اکثر اوقات درگزر سے کام لینا پڑتا ہے اور بعض اوقات بات چیت سالوں کے سرد رویے کو ختم کردیتی ہے۔ صبر اور مستقل مزاجی سے کام لو اور وضاحت کے ساتھ خط لکھو۔

اول و آخر پہلا کلمہ پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ پیروں کو زیتون کا تیل ہلکا گرم کرکے مالش کیا کرو' ضرور افاقہ ہوگا۔

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

□ نسیم۔سجاول

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی تو اچھے گھروں میں ہوتی ہے لیکن شادی کے قریب آ کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسا تین بار ہوا ہے اور اب کی بار میں بہت پریشان ہوں۔ میرا کہیں شادی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کچھ دن پہلے میری منگنی بدین کے پاس ہی کسی قصبے میں ہوئی تھی۔ یہ شادی وٹا سٹا کی تھی۔ نکاح سے ایک دن پہلے رات کو میری ہونے والی بھابی کسی مرد کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس طرح یہ منگنی ٹوٹ گئی ہے لیکن اس منگنی کے ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔ اب میں کئی امیدیں لے کر آپ کے در پر حاضر ہوں۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔

☆ بیٹی نسیم! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرودشریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عصر کے بعد سورۃ احزاب آیت 33 ایک سو ایک ایک سو ایک بار پڑھو اور دعا کرو۔ اور ہو سکے تو فوراً مجھ سے تعویذ منگوالو۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ ضرور کرم ہوگا۔

□ انوشہ۔کوٹ رجب علی

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اسی طرح دکھی لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں اور وہ لڑکا بھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری شادی ہنسی خوشی ہمارے والدین کی رضامندی سے ہو مگر میرے گھر والے یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ ہماری بہن بیٹی غیروں میں جائے۔ ہم میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ سندھی ہیں اور ہم پٹھان۔ برائے مہربانی مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے گھر والے راضی ہو جائیں۔

☆ بیٹی انوشہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ ناممکن کو ممکن بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ الاعراف آیت 29 ننانوے ننانوے بار پڑھو اور دعا کرو۔ یَا مُقِیطُ کا بہت ورد کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ وقاص خان۔ٹھٹہ

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ لے کر پیش ہو رہا ہوں۔ میری دور کی نظر کمزور ہے اور میری عینک کا نمبر 5 ہے۔ "سچی کہانیاں" میں نظر ٹھیک کرنے کا ایک نسخہ لکھا ہوا دیکھا۔ مجھے یہ نسخہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ نماز کے بعد یَا شَافِعِیُ سات سات دفعہ پڑھ کر ایک چمچ سونف پھانک لیں تو کیا ہر نماز کے بعد یا کسی مخصوص نماز کے بعد سونف پھانکنا ہے؟ اس کے بارے میں ضرور بتایا جائے۔ اس کے علاوہ مجھے فوج میں بھرتی ہونے کا بہت شوق ہے لیکن میں اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے فوج میں بھرتی نہیں ہو سکا۔ برائے مہربانی نوکری حاصل کرنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں۔ میں آپ کا تہ دل سے مشکور رہوں گا۔

☆ بیٹے وقاص! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ وظیفے کی اجازت ہے۔ یہ عمل ہر نماز کے بعد کرو۔ بیٹے! نظر کی کمزوری دور ہوگی تب ہی تم فوج میں اپلائی کر سکو گے۔

□ روبینہ۔کراچی

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں بہت امید لے کر آپ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر رہی ہوں۔ بابا جی! میں بہت مشکلات کا شکار ہوں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ میری بڑی بہن طلاق یافتہ ہے اور میری بہن کے ساتھ یہ حادثہ صرف میرے والد کی وجہ سے ہوا ہے وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ اچھی صحت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرتے ہیں۔ ہر وقت امی سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اب میری بہن ایک کمپنی میں ملازمت کرتی ہے اور ہم لوگوں کا پیٹ پالتی ہے مگر میرے باپ کو ذرا سی بھی غیرت نہیں ہے۔ سارے خاندان والے ہم پر باتیں بناتے ہیں۔ میں لوگوں کی طنز بھری نگاہوں کو برداشت کر کر کے بھی تھک گئی ہوں۔ ہر کوئی ہمیں اس بات کا طعنہ دیتا ہے کہ بہن کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ میں اس گھر کے جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں لیکن میری شادی بھی نہیں ہو رہی۔ کوئی بھی رشتہ آتا ہے تو سب سے پہلے یہی پوچھا جاتا ہے کہ باپ کیا کرتا ہے؟ لیکن ہمارے پاس تو اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم لوگ اتنا جہیز بھی نہیں

دے سکتے۔ کوئی ایسا کلام الٰہی بتائیں کہ میرا کسی شریف اور پڑھے لکھے گھرانے سے رشتہ آئے اور میری شادی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ شکریہ۔

☆ بیٹی روبینہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز عشاء کے بعد یَا مُتَعَالِی کا ورد کرو 11 تسبیح پھر حاجت بیان کرو۔ یہ وظیفہ 41 روز کرو۔ بہت اسباب پیدا ہوں گے۔

□ فریحہ، پیرس۔

☆ بیٹی فریحہ! تمہارا خط پڑھا، یقین جانو بہت دکھ ہوا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ بہتر یہی ہے کہ اس شخص سے واسطہ ختم کر لو۔ اس میں تمہاری اور تم سے زیادہ بچوں کی بھلائی ہے۔ بیٹی کا بہت خیال رکھا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ صبح و شام بچوں پر اور اپنے اوپر آیت الکرسی پڑھ کر حصار کر دیا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور جہاں جہاں لفظ "مُبین" آئے وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔ مجھے حالات سے مطلع رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ گل محمد۔کالا شاہ کاکو

○ عزیز بابا جی! السلامُ علیکم! میں ایک شادی شدہ بے روزگار 28 سالہ نوجوان ہوں۔ اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا اور میرے والد کا بھی کوئی کاروبار نہیں ہے، کاروبار ختم ہو گیا۔ اب تو سر پر قرضے کا بوجھ بھی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمت اور کرم سے روزگار یا کوئی کاروبار عطا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے نماز تو میں پڑھتا ہوں مگر عبادت میں دل نہیں لگتا۔ اگر آپ کسی کامل ولی اللہ کو جانتے ہوں جن کے ہاتھ پر میں بیعت کر کے اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لوں تو کسی ایسے اللہ تعالیٰ کے بندے کا پتا ضرور دیں۔

☆ بیٹے گل! کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر احسان نہیں کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ہی انسانیت ہے۔ پروردگار اپنے بندوں سے بہت محبت رکھتا ہے۔ تم صرف اس پاک ذات سے مدد مانگو وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد سورۃ الزمر آیت 49، 71-71 بار پڑھو اور دعا کرو۔ نماز ادا کرنے سے قبل دعا کیا کرو کہ رب العزت! میری نیت صرف تیری رضا حاصل کرنا ہی ہے۔ تو میرے سجدے قبول فرما، دین اور دنیا لے کر چلنا ہی کامیابی ہے۔ وقت ضائع مت کرو اور جدوجہد جاری رکھو۔ مجھے 2 ماہ بعد مطلع کرو۔

□ شہزاد احمد۔لیہ

☆ بیٹے شہزاد! والدہ سے کہو کہ اس عمل کو اپنی عادت میں شامل کریں۔ جب جب یاد آئے، اپنے اوپر سورۃ الناس پڑھ کر دم کر لیا کریں۔ تعداد کی قید نہیں ہے۔ والد سے کہو کہ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن ضرور پڑھیں، یہ اتنی مبارک سورۃ ہے کہ اس کو تو ویسے بھی ہر مسلمان کو کم از کم ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے۔ مدت 3 ماہ ہے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

□ ثریا، نارتھ کیرولینا۔

☆ بیٹی ثریا! زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے بندے کے لیے کیا مناسب ہے اور کیا نہیں۔ ہمیشہ یہی دعا کرو کہ رب العزت! ہمارے حق میں بہتر فیصلہ فرما۔ بیٹی! شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس کا فائدہ بھی کوئی نہیں۔ صرف اپنی ذات کی تباہی ہے۔ کوشش کرو کہ نہ تم کچھ دیکھ رہی ہو نہ کچھ سن رہی ہو پھر دیکھو تمہاری صحت میں کیسی تبدیلی آتی ہے۔ لاعلمی بعض اوقات بہتر ہوتی ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھا کرو۔ چلتے پھرتے ذُوالجلالِ وَالاکرام پڑھو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اپنے اوپر سے کچھ رقم خیرات ضرور کرتی رہا کرو۔

□ نورینہ۔چمن

○ محترم بابا جان! السلامُ علیکم! میری شادی کو 22 سال ہو گئے ہیں۔ شروع کے چند دنوں میں جو خوشیاں دیکھیں، پھر نصیب نہ ہوئیں۔ بابا جان! ہر طرف سے مایوس ہو کر خدا اور خدا کے رسولؐ کے بعد آپ سے مدد مانگتی ہوں۔ میرے 6 بچے ہیں، 2 بیٹے اور 4 بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ بڑے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ پانچ وقت کی بفضلِ تعالیٰ نماز باجماعت پڑھتا ہے۔ میرے شوہر جوا کھیلتے ہیں۔ نہ گھر کا

خرچہ ٹھیک طریقے سے دیتے ہیں اور میرا خرچہ بالکل بھی نہیں دیتے۔ میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ خدا کے لیے میرا گھر اجڑنے سے بچائیں۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ گھر میں روزانہ لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ بچے الگ پریشان ہیں۔ بابا جان! ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ ہم کچھ عرصہ پہلے لاہور جب گئے تھے تو ہم عورت لے کر آئے تھے۔ بابا جان! خدا کے لیے میری مدد فرمائیں۔

☆ بیٹی نورینہ! اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو۔ جہاں اتنا وقت صبر و تحمل سے گزار لیا ہے وہاں کچھ وقت اور گزار لو۔ انشاء اللہ پھر تم اتنی مجبور نہیں ہو گی۔ نمازِ عشاء کے بعد سورۃ بنی اسرائیل آیت 152 اکہتر اکہتر (71-71) بار پڑھو اور دُعا کرو۔ ایک وقت میں ایک وظیفہ کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور بہتر تبدیلی رونما ہو گی۔

سراج۔ جودھالہ

o بابا جی! میں بڑا پریشان انسان ہوں گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ بوڑھے والدین 5 بہنیں اور بیوہ پھوپھی کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ آج کل مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔ محنت مزدوری کرتا ہوں۔ اکثر گھر میں فاقہ ہوتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟ دل نہیں مانتا کہ بہنوں کو کام پر لگاؤں۔ بابا جی! ابو جب تک صحت مند رہے بہنوں نے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا مگر اَب حالات بہت خراب ہیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہا۔ اکثر سوچتا ہوں کہ کسی اور شہر میں جا کر قسمت آزمائی جائے۔ آپ بتائیں کیا یہ فیصلہ درست ہے؟

☆ بیٹے سراج! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں تمہارے والد کے زمانے میں حالات کچھ اور ہوں گے اَب بہت مختلف ہیں۔ بے تحاشا مہنگائی کی وجہ سے ایک شخص پورے کنبے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ بہرحال تم بہنوں سے کہو بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ واقعہ ضرور پڑھیں اور رزق میں برکت کی دُعا کریں۔ بیٹے! تم بھی یَامَالِکَ الْمُلْکُ کا بہت ورد کیا کرو۔ یاد رکھو اللہ سے مدد مانگنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ رزق اپنے شہر میں رہ کر ہی کوشش کرو۔

□ روزینہ جمال۔ شکار پور۔

☆ بیٹی روزینہ......! اپنی غلطیوں کا بوجھ کسی اور پر ڈالنا بہت غلط ہے۔ تم سمجھ دار ہو اپنا اچھا برا سمجھتی ہو لہٰذا جو غلطی تم سے ہوئی ہے وہ نا سمجھی میں نہیں ہوئی ہے۔ حل صرف یہ ہے کہ خوب گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگو۔ چلتے پھرتے ہر لمحے توبہ استغفار پڑھو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کرو۔ اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرو۔ وہ معاف کر دے گا تو تمہاری بختی بھی ختم ہو جائے گی۔

□ حنا۔ فرید آباد

o بابا جی! اللہ آپ کو اِسی طرح لوگوں کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں بہت مجبور ہوں دو دفعہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکی ہوں۔ بابا جی! مجھے میری خالہ نے پالا۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے مجھے گود لے لیا۔ میری عمر اس وقت 20 سال ہے اور یہ سارا وقت میں نے کراچی میں گزارا۔ میرے خالو بینک میں اچھی جاب پر تھے۔ دو سال قبل خالو اور خالہ میں علیحدگی ہو گئی۔ اَب میں اور خالہ رہتے ہیں۔ خالہ اسکول میں جاب کرتی ہیں اور میں ایک پرائیویٹ ادارے میں۔ ہمارا گزارہ بہت اچھی طرح ہو رہا ہے۔ اَب اچانک میرے والدین کو میرا خیال آ گیا۔ وہ مجھے واپس بلانا چاہتے ہیں۔ دراصل انہوں نے گاؤں میں میری بات طے کر دی ہے۔ وہ شخص بالکل گنوار ہے لیکن کیونکہ میرا بھائی اُس کی بہن سے شادی کر رہا ہے اِس لیے یہ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔ بابا جی! اس رشتے سے اچھا ہے کہ میں مر جاؤں۔ شادی سے انکار کیا تو گھر والے قتل کی دھمکی دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ایسا ہوتا بھی ہے۔ اللہ مجھ پر رحم فرمائے۔ آپ میری مدد کریں۔

☆ بیٹی حنا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! بے شک حالات بہت خراب ہیں مگر سچا مسلمان وہی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان رکھتا ہو۔ بعض اوقات ہمیں لگتا ہے کہ ہر جانب اندھیرا چھا گیا ہے مگر یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے۔ مکمل اعتقاد کے ساتھ اللہ کے حضور گڑگڑا کر دُعا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ میں بھی تمہارے لیے خاص دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ انشاء اللہ سب خیر ہو گی۔

□ زرینہ۔ چکوال

o بابا جی! میں بڑی پریشان ہوں۔ شادی کو 7 سال ہوئے ہیں۔ 3 بچے ہیں۔ شوہر بہت اچھے ہیں مگر میری ساس سفلی عمل بہت کرواتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں بے سکونی رہتی ہے۔ جب تک میرے سسر زندہ رہے حالات قابو میں تھے مگر اَب بہت پریشانی ہے۔ میرے شوہر روزی کمائیں یا ان چکروں میں پڑے رہیں؟ میں انہیں پہلے تو بتاتی تھی اَب بتاتی بھی نہیں۔ وہ مانتے ہی نہیں۔ بابا جی! اس گندے عمل سے چھٹکارے کے لیے کوئی وظیفہ دیں جس کی عام اجازت بھی دیں کیونکہ مذہب سے دوری کی وجہ سے یہ چیز بہت بڑھ گئی ہے۔

☆ بیٹی زرینہ......! اللہ تمہاری ساس پر رحم فرمائے۔ ایسی حرکتیں کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور پھر معافی بھی قبول نہیں ہوتی۔ تم ہر نماز کے بعد الحمد شریف چاروں قل اور سورۃ البقرہ کا پہلا رُکوع اور آخری رُکوع پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی گھر کے تمام افراد کو پلاؤ۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں کہ کس وقت پلانا ہے۔ اِس عمل کی تمام پڑھنے والوں کو اجازت ہے۔ اِس کو اپنی عادت میں شامل کرنا بہت مناسب ہے۔ دافع بلّیات کے لیے یہ عمل نہایت موزوں ہے۔

□ سائرہ بشیر۔ جہانگیرہ۔

o بابا جی! آپ نے مجھے چہرے کی اور دانتوں کی دوا بھجوائی تھی۔ مجھے اِن سے بہت فائدہ ہے۔ دانتوں کا ہلنا اور کیڑا تو بالکل ختم ہو گیا۔ بس چہرے پر ابھی جگہ جگہ داغ ہیں۔ مجھے مزید دوا ارسال کر دیں میں مستقل علاج جاری رکھنا چاہتی ہوں۔

☆ بیٹی سائرہ......! دوا میں تیار کر دوں گا اور مناسب بھی یہی ہے کہ علاج مستقل جاری رکھو۔ تکلیف دور ہونے کے بعد جو لوگ بِنا بتائے علاج چھوڑ دیتے ہیں انہیں پھر دوبارہ تکلیف ہو جاتی ہے۔ بس احتیاط جاری رکھنا اور اپنا تولیہ اور صابن بالکل الگ رکھنا۔

☆☆......☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

اگلے وقتوں کے اچھے لوگ

بادشاہ تیمور لنگ کی یہ عادت تھی کہ جب کسی شہر کو فتح کرتا تو وہاں کے علماء کو اپنے دربار میں بلا کر ان سے کچھ ایسے سوالات کرتا کہ جوابوں کا بہانہ بنا کر انہیں قتل کرا دیتا۔ چنانچہ جب حلب کو فتح کیا تو وہاں کے علماء کو بلایا اور کہا۔

''ہمارے اور آپ کے دونوں کے آدمی جنگ میں قتل ہوئے۔ ہماری فوج کے آدمی شہید ہوئے یا آپ کی فوج کے؟'' یہ سوال سن کر علماء گھبرا گئے مگر علامہ ابن شحنہ جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے اور کہا۔

''مجھے اس وقت ایک حدیث یاد آ گئی ہے کہ ایک اعرابی نے حضورﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص مالِ غنیمت کے لالچ میں جنگ کرتا ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے نام کو بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے کون شہید ہے؟''

تو حضورﷺ نے فرمایا۔ ''جس نے اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کے لیے جنگ کی وہ شہید ہے۔''

لہٰذا اے بادشاہ! میرے فوجی ہوں یا آپ کے فوجی، جس نے اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کے لیے جنگ کی ہوگی، وہی شہید ہوں گے۔''

جواب سن کر تیمور کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''خوب، خوب۔''

مرسلہ۔ کنول جی تنہا، گگو منڈی

ایجاد

آج تو خلا میں جانا کوئی مسئلہ نہیں رہا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کی بنیاد پچاس برس قبل اس وقت کے سوویت یونین اور آج کے روس نے رکھی تھی۔ اس نے پہلا خلائی جہاز ایجاد کیا جو زمین کے مدار کا چکر لگا کر آیا۔ یوری گگارین پہلا انسان تھا جو خلا میں گیا اور انسانیت کو ترقی اور دریافت کے نئے افق سے روشناس کرایا۔ وہ پائلٹ تھا اور اس نے خلا میں 108 منٹ تک پرواز کی۔ یہ اس دور میں بڑی ڈراؤنی بات تھی۔ بہت جرأت، مہارت اور ترقی درکار تھی۔ خلا میں انسانی سفر کا تاریخ ساز لمحہ بے حد محنت اور سائنسی ترقی کے بعد حاصل ہوا تھا۔ یہ سرد جنگ کا دور تھا۔ امریکا اور سوویت یونین کے درمیان محاذ آرائی تھی اور یوری گگارین کی کامیابی نے امریکا کو خلائی دوڑ پر مجبور کر دیا۔ کاشتکار کا بیٹا یوری گگارین 20ویں صدی کا ہیرو بن گیا تھا۔ خلائی جہاز Vostok ون گگارین کو لے کر 12 اپریل 1961ء کو خلا میں روانہ ہوا۔

مرسلہ: انیس الرحمٰن۔ بورے والا

سب سے بڑا لیموں

دنیا کے سب سے بڑے لیموں کا وزن 5 اعشاریہ 265 کلوگرام (11 پاؤنڈ 9 اونس) تھا۔ یہ جناتی سائز لیموں اسرائیل کے شہر کفار زیتم میں آرون شیموئل نامی کسان کے باغ میں جنوری 2003ء کو اگا تھا۔ اس لیموں کی گولائی 78 سینٹی میٹر (29 انچ) اور لمبائی 35 سینٹی میٹر (13.7 انچ) تھی۔

حسنِ انتخاب...... ابوہریرہ بلوچ۔ ڈونگا بونگا سٹی

محبت کب بدلتی ہے

مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے
تمہی کو چاہتے ہیں ہم تمہی سے پیار کرتے ہیں
یہی برسوں سے عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے
تمہیں جو ہم نے چاہا ہے یہی اپنی عبادت ہے
عبادت جس طرح کی ہو، عبادت کب بدلتی ہے

شاعر: جاوید اقبال، ساہیوال

باعزت رہائی

سپر اسٹور میں ایک آدمی نے آ کر درخواست دی کہ اسے سیلز مین رکھ لیا جائے۔ اسٹور والوں کو سیلز مین کی ضرورت تو تھی لیکن اس آدمی کا حلیہ کچھ ٹھیک نہیں تھا اور وہ اس سے مطمئن نہیں ہو پا رہے تھے۔ آخر انہوں نے پوچھا۔ ''کیا تم اس اسٹور میں کسی کو جانتے ہو؟''

امیدوار نے ہچکچاتے ہوئے ایک ڈرائیور کا نام لیا جو ان کے پاس پک اپ میں سامان دینے آتا تھا۔ اسٹور کے منیجر نے امیدوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی، کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

''جی ہاں......'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''کیا یہ ایک محنتی اور ایماندار آدمی ہے؟'' منیجر نے دریافت کیا۔

''ارے صاحب، ان کی ایمانداری کا کیا پوچھتے ہیں؟'' ڈرائیور پرجوش لہجے میں بولا۔ ''کئی بڑے اسٹورز میں سیلز مین کی نوکری کرتے ہوئے یہ آٹھ مرتبہ چوری کے الزام میں گرفتار ہوئے لیکن ہر مرتبہ باعزت طور پر بری ہو گئے۔''

مرسلہ: ایم وکیل عامر جٹ۔ ساہیوال

مہکتی کلیاں

☆ سچ بتا دینے سے ذہن کو خلفشار سے نجات مل جاتی ہے۔

☆ کچھ لوگوں کی شکل خوفناک ہوتی ہے مگر کچھ لوگوں کا دل اور دماغ۔

☆ غم کتنا ہی سنگین ہو، نیند سے پہلے تک ہوتا ہے۔

☆ جو شخص ناممکن کے پیچھے بھاگتا ہے، وہ ممکن سے بھی رہ جاتا ہے۔

☆ رات کو بھوکا سو جانا، صبح قرض دار جاگنے سے بہتر ہے۔

☆ ہر جملہ خوب صورت ہے اگر وہ ہماری امیدوں کے مطابق ہو۔

☆ کتاب ہی وہ چیز ہے جو زندہ رہتی ہے۔

مرسلہ: عمر العطاس۔ کراچی

سالِ نو میں

اوڑھی میں نے زخموں کی قبا سالِ نو میں
فصلِ بہار میری جلی سالِ نو میں
پیاروں کے التفات سے محروم ہوئی میں
دیکھا نفرتوں کا آئنہ میں نے سالِ نو میں
دل رہا سینے میں نا روح رہی جسم میں
قرض قرض ہوئی میں ادا سالِ نو میں
یادیں ہوئی پابندِ سلاسل سوچیں ہوئیں اسیر
ذہن ہوا خالی مانند کاسۂ گدائی سالِ نو میں
چہرہ اس کا نقلی تھا اور آنکھیں تھیں بے وفا
چاہت کا جھوٹا بھید آشکار ہوا سالِ نو میں

شاعرہ: روبینہ ناز روبی۔ فیصل آباد

سوا سیر

ایک ڈاکٹر کے پڑوس میں کتبے لکھنے والا رہتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے ازراہِ تفنن اس سے کہا۔ ''آپ تو یہی دعا کرتے ہوں گے کہ کوئی جلدی سے مرے اور آپ کو اس کا کتبہ تیار کرنے کا آرڈر ملے؟''

''مجھے دعا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔'' کتبے لکھنے والے نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''

"جی ہاں' جب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص آپ کے زیر علاج ہے تو میں اس کا کتبہ بنانا شروع کر دیتا ہوں اور مجھے آج تک مایوسی نہیں ہوئی۔"

مرسلہ: اُمِ حبیبہ۔ اسلام آباد

عجیب بات

ایک مشہور امریکی ایئر لائن سے وابستہ پائلٹ نے بڑی دلچسپ بات بتائی۔ اس نے کہا کہ آپ میں سے زیادہ تر لوگ جب ہائی وے پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں تو سیٹ بیلٹ نہ باندھنے کا خطرہ مول لینا پسند نہیں کر سکتے' لیکن ہوائی جہاز میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب ہم ہزاروں فٹ بلندی پر پانچ سو میل فی گھنٹہ رفتار کو چھو لیتے ہیں تو مسافروں کو سیٹ بیلٹ کھول دینے کا اشارہ جاری کر دیتے ہیں۔ ہے نا دلچسپ بات۔

مرسلہ: ندیم عباس میواتی۔ چوکی

اینگری کلچر

ہمارے ہاں وہ کلچر، جس پر سب اینگری کرتے ہیں۔ اینگری کلچر ہی ہے اس کے علاوہ سب اینگری کلچر ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کالج اس لیے بنائے گئے ہیں کہ طلبہ کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے، ایسے ہی اینگری کلچر کی نمائش کے لیے فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

ہمارے ہاں فلموں میں ہیرو سے لے کر اس کا گھوڑا تک غصے میں ہوتا ہے۔ ہر کردار کو غصہ ہی آتا ہے۔ یہاں تک کہ فلم دیکھنے کے بعد بندے کو بھی یہی آتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف "فلاہ بازیاں" سے اقتباس

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

ملک ملک کی کہاوتیں

☆ احسان مندی کا مخلصانہ اظہار دل جیت لیتا ہے۔ (فرانسیسی کہاوت)

☆ ہر قابل شخص کے پیچھے کئی قابل اشخاص ہوتے ہیں۔ (چینی کہاوت)

☆ نیند آدھی غذا کا کام کرتی ہے۔ (سوڈانی کہاوت)

☆ بارش ٹوٹی جھونپڑی پر زیادہ برستی ہے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ جس کے پاس محبت ہے، اس کی امیدیں زندہ ہیں اور جس کی امیدیں زندہ ہیں، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ (عربی کہاوت)

☆ سفید بال عمر کی نشاندہی کرتے ہیں، عقل کی نہیں۔ (یونانی کہاوت)

☆ انسان بننے کے لیے انسانوں والے کپڑے پہننا بھی ضروری ہے۔ (لاطینی کہاوت)

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

امید کا چراغ

دل کا دروازہ اکثر کھلا رکھتی ہوں
لوٹ آئے وہ یہ ہونٹوں پر صدا رکھتی ہوں
یہ آنکھیں کوئی خطا نہ کر بیٹھے
اس لیے نظریں جھکا کے رکھتی ہوں
اس کی زندگی میری طرح برباد نہ ہو
اپنے لبوں پہ بس یہی دعا رکھتی ہوں
اسی کی یادوں میں کھوئی رہتی ہوں
اسی لیے زمانے سے خود کو جدا رکھتی ہوں
خود کو ختم کر دوں گی اگر دل سوچے کسی اور کو
اپنے لیے یہی ایک سزا رکھتی ہوں
امید ہے کہ وہ لوٹ کر آئے گا ایک دن ناز
اسی آس میں امید کا چراغ جلائے رکھتی ہوں

شاعرہ: عمارہ ناز۔ کمالیہ

صحیح طریقہ

ایک جیل میں ہر ہفتے ایک مشہور کلاسیکل استاد بلائے جاتے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے بٹھا کر گانا سنایا جاتا تھا۔ ایک دن محفل موسیقی کے اختتام پر استاد نے جیلر سے خوش ہو کر کہا۔ "قیدیوں کے لیے کلاسیکل موسیقی اچھی تفریح ہے۔"

"تفریح کا تو علم نہیں۔" جیلر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "البتہ آپ کے گانے کی وجہ سے تین خطرناک قیدیوں نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔"

مرسلہ۔ نادر شاہ۔ ملتان

غیرت مند

ایک شکاری کی گولی سے بری طرح زخمی ہونے کے بعد ایک شیر کنج میں پڑا کراہ رہا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک بچھوے نے اس کی کراہ سنی تو وہاں جا پہنچا اور صورتِ حال معلوم کی۔ شیر نے بتایا کہ اسے کسی شکاری نے گولی مار دی ہے۔ بچھوا' شیر کی بات سے ایک دم غصے میں آ گیا اور بڑے جوش سے بولا۔

"لعنت ہو ان شکاریوں پر جو ہم جیسے خوبصورت جانوروں پر گولی چلاتے ہیں۔"

شیر نے سر اٹھا کر بچھوے کی طرف دیکھا اور انتہائی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "میاں بچھوے' شکاری کی گولی سے مجھے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی تمہاری بات سن کر ہوئی ہے۔" اتنا کہہ کر شیر نے جان دے دی۔

مرسلہ۔ تنویر فاطمہ۔ کراچی

بلاوجہ

یہ آنکھیں منتظر رہتی ہے بلاوجہ
کوئی آتا کیوں نہیں ہے بلاوجہ
جس کی خاطر روتے روتے چہرہ بے رونق ہوا
آئینہ بھی اب تو دیکھ کر مسکراتا ہے مجھے بلاوجہ
اب تو افسردہ سی رہنے لگی ہوں بس
دنیا والوں سے بھی چھپنے لگی ہوں بلاوجہ
جینے کا نہ دو حوصلہ مجھ کو اے دوستو!
مر مر کے جی رہی ہوں دیکھو بلاوجہ
یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا اب
بس سوچتی رہتی ہوں میں یہ اب بلاوجہ

شاعرہ: زرینہ جونیجو۔ بورڑی شریف

دو باتیں

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے۔ ایک دن ایک شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا۔ آخر پہچان کر بولا۔

"تم وہی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

"ہاں' میں وہی شخص ہوں۔" انہوں نے کہا تو اس شخص نے کہا۔

"تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟"

حکیم لقمان نے فرمایا۔ "دو باتوں سے' ایک سچ بولنا' دوسرے بلاضرورت بات نہ کرنا۔"

مرسلہ۔ کرن شہزادی' راولپنڈی

اچھا لگتا ہے

بن کے اس کے چپ رہنا اچھا لگتا ہے
خاموش رہ کر اس درد کو سہنا اچھا لگتا ہے
جس کی یاد میں آنسو برستے ہیں
سامنے اس کے کچھ نہ کہنا اچھا لگتا ہے
مل کر اس سے بچھڑ نہ جاؤ کہیں
اس لیے بس دور ہی رہنا اچھا لگتا ہے
اس کا ملنا نہ ملنا مقدر کی بات ہے
پل پل اس کی یاد میں جینا اچھا لگتا ہے

شاعر: خضر حیات۔ روڑہ تھل

لہسن

تحقیق کے مطابق لہسن میں سیلینیم اور گندھک کے مرکبات کم مقدار میں ہونے کے باوجود ڈی این اے پر سرطان کا سبب بننے والے اجزا کا حملہ روک دیتے ہیں۔ اس کی خوبی دراصل اس کے جز ایلی سین کا نتیجہ ہوتی ہے جو بودار ہونے کے باوجود رسولیوں کی تیاری کا عمل سست کر دیتی ہے۔ امریکی نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے مطابق چین میں لہسن چوں کہ زیادہ کھایا جاتا ہے' وہاں پیٹ کے سرطان کی شرح کم رہتی ہے۔ چین کا لہسن بہترین سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اس کا روزانہ فی کس استعمال 20 گرام ہے۔ ہوائی کے جزائر اور جاپان میں بھی تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ لہسن کے استعمال سے بڑی آنت اور (قولون) اور مقعد کا سرطان کم ہوتا ہے۔

مرسلہ: شائلہ اختر۔ لاہور

متبادل

ایک شخص نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا۔ "ڈاکٹر صاحب' جلدی آیئے' میرے بیٹے نے شیو کرنے والا ریزر نگل لیا ہے۔"

"آپ گھبرایئے نہیں' میں ابھی آتا ہوں۔ آپ نے ابھی تک کیا کیا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "میں نے پڑوسی سے اس کا الیکٹرک ریزر مانگ لیا ہے۔"

مرسلہ۔ معاویہ عنبر' ٹوبہ ٹیک سنگھ

غزل

ایک نئے روپ میں وہ کل شام آیا
آنکھوں میں لیے محبت کے جام آیا
گوارہ نہ تھی جس کو صورت بھی میری
خود لے کے محبت کا وہ پیغام آیا
میرا نام لینے کی جس کو فرصت نہ تھی
کل بارہا اس کے لبوں پہ میرا نام آیا
نفرت تھی جس کو زمانے بھر کی مجھ سے
بن کے خود میری محبت کا غلام آیا
صرف محبت ہی تھی اس کی آنکھوں میں عاصم
کل بھلا کے رنجشیں وہ تمام آیا

شاعر: محمد امتیاز عاصم۔ ساہیوال

نقصان دہ

اپنے دورۂ امریکا میں شاہ فیصل مرحوم سرکاری ضیافت میں ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے تو کسی صحافی نے چوٹ کی۔

"ایکسی لینسی! کیا یہ بات صحت کے لیے نقصان دہ نہیں ہے؟"

شاہ فیصل نے برجستہ جواب دیا۔ "یہ میری اپنی انگلیاں ہیں' نقصان دہ وہ کانٹا اور چمچہ ہے جو سب کے منہ میں جاتا ہے۔"

مرسلہ۔ عارف شہزاد' صادق آباد

شرط

ایک ہوٹل میں ایک صاحب نے اچانک اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تیس چکن تکے ایک ساتھ کھائے گا تو وہ اسے پانچ ہزار روپے انعام میں دیں گے۔ ہوٹل میں ایک سردار جی بھی بیٹھے ہوئے تھے' وہ یہ شرط سنتے ہی باہر چلے گئے۔ کافی دیر بعد وہ واپس آئے اور ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔

"کیا وہ تیس تکے کھانے والی شرط ابھی تک برقرار ہے؟ میں اس میں حصہ لینا چاہتا ہوں؟"

"ہاں' وہ شرط تو برقرار ہے لیکن آپ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں دراصل ساتھ والے ہوٹل میں تیس تکے کھانے گیا تھا تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں شرط پوری کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

مرسلہ: نبیل جاوید۔ سرگودھا

غلطی

ایک نوجوان نے اپنے دوست کو بتایا۔ "لو بھئی' وہ حادثہ ہو ہی گیا' میری غریبی کی وجہ سے نسرین نے میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔"

دوست نے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے اپنے دولت مند چچا کے بارے میں نہیں بتلایا جن کے مرنے کے بعد ان کی ساری جائیداد تمہیں ہی ملے گی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "ہاں' بتلایا تھا اور اب نسرین میری چچی ہے۔"

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ لاہور

مناسب وقت پہ

ایک خاتون نے فقیر کو پرانے کپڑے خیرات میں دیئے اور کہا۔ "یہ میرے مرحوم شوہر کے کپڑے ہیں۔"

کپڑوں پر جا بجا دھبے پڑے ہوئے تھے اور کئی سوراخ بھی تھے' یہ دیکھ کر فقیر بولا۔ "آپ کے شوہر بہت خوش نصیب تھے' بالکل مناسب وقت پر رحلت کر گئے۔"

مرسلہ: ہمایوں خان۔ کراچی

دوستی

☆ دوستی ایک ایسا پودا ہے جس میں سچ کی مٹی' احساس کا پانی' انسانیت کی ہوا اور اعتبار کی دھوپ اس پودے کو ایک مضبوط درخت بنا دیتی ہے۔

مرسلہ: زید علی۔ کراچی

☆☆☆



تیرِ نیم کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

واؤ داشفاق............اوکاڑہ

جب بھی سوچا کہ شب ہجر نہ ہوگی روشن
مجھ کو سمجھانے تری یاد کے جگنو آئے

نزہت ناز..........کراچی

زباں خاموش ہو جائے تو چہرہ بات کرتا ہے
محبت کے مراحل میں عجب موسم گزرتا ہے

نزابت افشال............میہورہ فتح جنگ

اب یہ موسم میری پہچان طلب کرتے ہیں
میں جب آیا تھا یہاں تازہ ہوا لایا تھا

سلمان شبیر............اکوال' تلہ گنگ

کیوں تو اچھا لگتا ہے وقت ملا تو سوچیں گے
تجھ میں کیا کیا دیکھا ہے وقت ملا تو سوچیں گے
موسم' خوشبو' باد صبا' چاند' شفق اور تاروں میں
کون تمہارے جیسا ہے وقت ملا تو سوچیں گے

روبینہ ناز روبی............فیصل آباد

سمجھا ہے کون وقت کی رفتار کا مزاج
لمحوں میں کٹ گئیں کئی صدیاں شباب کی
اللہ۔ تو نے موت کو بھی ساتھ کر دیا
میں نے تو زندگی ہی فقط انتخاب کی

عظمیٰ شکور............اسلام آباد

رات تھپکیاں دے کر سلاتی ہے
کہ جب تیری یاد ستاتی ہے رلاتی ہے

ماہین فاطمہ............اوکاڑہ

ہونٹوں کی ہنسی کو نہ سمجھ حقیقتِ زندگی
دل میں اتر کے دیکھ ہم کتنے اداس ہیں

اشفاق شاہین......کراچی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

ملائکہ حریم......اوکاڑہ

آؤ ہم ریت پہ بکھرے ہوئے موتی چن لیں
پھر یہ دریا کی سخاوت بھی رہے یا نہ رہے

بشیر احمد بھٹی............بہاولپور

جس کے لیے تن من دھن ہم نے داؤ پہ لگا دیا
اس نے ذرا سی بات پہ ہمیں بزم سے بھگا دیا

فرح انیس............کراچی

تعمیرِ محبت کا سلسلہ جاری ہے
خیال رکھنا کہیں کوئی نفرت کا ملبہ نہ ڈال دے

مسز نگہت غفار............کراچی

اب کے تمام شہر میں اعلان ہو گیا
اک شخص میری زیست کی پہچان ہو گیا
پہلے تو میرے نام سے منسوب وہ ہوا
پھر وہ کتابِ زیست کا عنوان ہو گیا

نوشین امجد............لاہور

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے
کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

بشریٰ عرفان............گلبرگ' لاہور

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

تسنیم ندیم......گجرات

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے' اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو
حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے' وہ سماج بھی ہو

ندیم عباس ڈھکو......ساہیوال

میلے ہوجاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو' یوں ہی سہی
جیسی ہونی چاہیے تھی' ویسی تو دنیا نہیں
دنیاداری بھی ضرورت ہے' چلو یوں ہی سہی

ممتاز اقبال اعوان......داروغہ والا لاہور

وقت بنجارہ صفت لمحہ ہے اپنا
کس کو معلوم' یہاں کون ہے کتنا اپنا
جو بھی چاہے' وہ بنا لے اسے اپنے جیسا
کسی آئینے کا ہوتا نہیں چہرہ اپنا

صائمہ شبیر......سرگودھا

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا غنیمت ہے
نئی لغت کے مطابق یہی محبت ہے

ایم افضل آزاد......ساہیوال

جانے کیا ان کی نگاہوں نے کہا ہے ہم سے
آج کل شہر میں ہر کوئی خفا ہے ہم سے
کاش وہ ایک نہیں ہوتے' بہت سے ہوتے
جن کو وہ مل نہ سکے' ان کو گلہ ہے ہم سے

رضوانہ کوثر......لاہور

بات بہت معمولی سی تھی' الجھ گئی تکراروں میں
ایک ذرا سی ضد نے آخر دونوں کو برباد کیا

نائلہ غضنفر......کراچی

ممکن ہے' لکھنے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو
قصے میں جو نہیں ہے' وہی بات خاص ہے

یاسر وکی......دیپال پور

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں
رہتا تھا سامنے ترا چہرہ کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

نگہت منیر......اوکاڑہ

اتر جائیں گے سینے میں زمیں کے
سکندر جیسی چاہے شان رکھ لیں

جمیلہ کنول......کراچی

سبز رتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل' چاند' ہوا اور میں

عاشر اشعر عتیق......کراچی

جو بھی جیون پاس تھا میرے' تجھ کو تکتے بیت گیا
میں تھی اور تھی گھر کی چوکھٹ' نیند مجھے کب آئی تھی؟
غیروں کا شکوہ کیا کرتی' کہتی دل کی بات کسے؟
ساری عمر تھی خود سے کھٹ پٹ' نیند مجھے کب آئی تھی؟

واصف نبی خان......دمام

بے سبب مسکرا رہا ہے چاند
کوئی سازش چھپا رہا ہے چاند
جانے کس کی گلی سے نکلا ہے؟
جھینپا جھینپا سا آرہا ہے چاند

کوپن برائے
تیرنیم کش
فروری 2016ء

میرا پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:
پتا: